UNIVERSAL
LIBRARY
OU_188866
UNIVERSAL
LIBRARY

OUP—390—29-4-72—10,000.

66 **OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY**

Call No. ۹۱۵ ک   Accession No. U2179 ۲۱۷۹

Author محمد حسن بلگرامی

Title کارنامہ پہلوی

This book should be returned on or before the date last marked below.

ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشانست
خُم وخمُخانہ با مُہر ونشانست

کارنامۂ پہلوی

از

سیّدِ محمدؔ حسن، بلگرامی

باہتمام مرزا محمد جواد

نظامی پریس لکھنؤ میں چھپا

تہدیہ

پہلے میرا خیال تھا کہ یہ اپنی ناچیز تالیف ملّتِ ایران کے نام معنون کروں۔ جن کی بہادری وجواںمردی، شجاعت و دلیری، جانبازی وحب الوطنی اپنے ملک کو بار بار تباہی سے بچاچکی ہے سکندر کے حملے کا سیلاب اور اسکے بعد ایران پر بڑے بڑے دھاوے ہوئے یونانیوں، عربوں، کوہستانیوں منگولیوں، تاتاریوں ترکوں اورافغانوں کے پے درپے حملوں نے سارے ملک کو تاخت وتاراج کرڈالا کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ملک پھر کبھی زندہ ہوگا۔ مگر ملّتِ ایران کی دانشمندی اورجذبۂ جاں نثاری نے اس پیکرِ مردہ میں پھر ایک تازہ روح پھونکدی۔

اِسکے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ کسی ایسی ممتاز ہستی کے ساتھ اِس کتاب کو منسوب کیا جائے، جسکو ایران سے کوئی نہ کوئی نسبت بھی ہو۔ چنانچہ اسکے لئے اپنے دوست بمبئی کے مایۂ ناز ڈاکٹر باناجی کو منتخب کیا، جو اپنی غیر معمولی مہارت فن، اپنے لطف وکرم اورخلق ومروت میں آپ ہی اپنی نظیر ہیں۔ لوگ اُنکے مطب کو منبعِ نور اور مطلع ضیا کہتے ہیں جہاں سیکڑوں افسردہ وبے بصر برناو پیر ٹٹولتے ہوئے دوسروں کے سہارے آتے ہیں۔

اور دولت بینائی سے مالا مال ہو کر بے سہارا سے لئے خوش و خرّم واپس جاتے ہیں
انکے نشتر کی چمک امراض چشم کے اندھیرے گھپ کا چراغ ، اور
انھیں تاریکیوں کی ایسی پر نور شمع ہے۔ جسکی روشنی سے سات پردوں کے اندر کی
چھپی ہوئی متاع بصارت چشم زدن میں ہاتھ آجاتی ہے۔ گویا اُن کا
تلخ کار نشتر ضیا بار بینائی کا پورا ذمّہ دار ہے۔ اور رات دن بندگانِ خدا کو
ظلمات سے نکال کر عالم نور میں لانا اِنکا یہی نورانی مشغلہ ہے۔
میں بھی آنکھیں کھو چکا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب ہی کے نشتر التفات
نے متاعِ بُردہ اِس سرعت سے ڈھونڈ نکالی کہ سطح چشم سے اتصال نشتر کی
مدّت بالکل معلوم نہ ہو سکی۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کی مہارت فن چشم بیدار کی
ذمّہ دار واقع ہوئی ہے اور یہ کتاب بیداری ایران کے دلچسپ فسانے
کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر خود موصوف کو ایران سے انتساب بھی حاصل ہے۔
اِس لئے میں اپنی اِس تالیف کو اپنے کرم فرما ڈاکٹر صاحب کے نام نامی سے
معنون کرنے کی مسرت حاصل کرتا ہوں۔

سید محمد حسن بلگرامی
ریٹائرڈ اکونٹنٹ جنرل
خیریت آباد حیدرآباد دکن

یکم اکتوبر ۱۹۴۰ء

اے قباے بادشاہی راست بربالاۓ تو
زینتِ تاج و نگیں از گوہرِ والاے تو

آفتابِ فتح راھر دم طلوعے مید ہد
از کلاہِ خسروی رخسارِ مَہ سیماے تو

جلوہ گاہِ طائرِ اقبال گردد ہر کجا
سایہ اندازد ہماے چتر گردوں ساے تو

از رسومِ شرع و حکمت با ہزاراں اختلاف
نکتۂ ہرگز نہ شد فوت از دلِ داناے تو

انچہ اسکندر طلب کرد و ندادش روزگار
جُرعۂ بود از زلالِ جامِ جاں افزاے تو

(حافظ)

دیباچہ

اِس ویرانہ آبادِ دنیا کی رونق اور چہل پہل اُٹھ اُٹھ کر گرنے اور گر گر کر سنبھلنے ہی سے وابستہ ہے۔ یوں تو خاکدانِ عالم کا ذرّہ ذرّہ چشمِ بینا کے لئے مکمل درسِ عبرت سے کسی طرح کم نہیں، لیکن تمدّنِ انسانی کا ایک ایسا خود ساختہ فن جو حوادثِ روزگار کی چھوٹی بڑی پرچھائیاں اور اقتدار و افتقار کی دھوپ چھاؤں کے پورے مناظر محفوظ کرلیتا ہے۔ سبق آموزی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

دانش و فرہنگ کی ترقّی، نفس کی تہذیب و شائستگی، ضمیر کی پاکیزگی، حفظِ ملّت و

اصلاح قومی کا جوش اور ولولۂ عمل اسی سے نشوونما پاتا ہے، اور یہی مضرابِ بازِ دل کو چھیڑ کر کچھ سے کچھ کر دیتی ہے۔ یہ فن "تاریخ" کے نام سے مشہور ہے، جسکی ابتدا قصّے، کہانی سے ہوئی۔ خاندان کے لوگ اپنے اپنے کام دھندوں سے فرصت پاکے ایک جگہ بیٹھ کر اپنے بڑے بوڑھوں کے قصے مزہ لے لیکر اپنے چھوٹوں کو سنایا کرتے تھے، جب تہذیب وتمدّن کا دور آیا تو یہی کہانیاں اور افسانے زبانوں سے تحریر میں منتقل ہو کر تاریخ بن گئے۔

متقدّمین ومتاخرین میں سے کوئی ایسا نہیں جو عظمت واہمیّت تاریخ کا معترف نہ ہو۔ اس کی ضرورت کی واضح دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وسیع سے وسیع تمدن تاریخ سے بے نیاز ہو کر اپنی ترقی پذیر وسعت کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ پارینہ علوم وفنون ہوں یا دیرینہ مذاہب۔ یہ سب کے سب روایات (جو تاریخ ہی کا اثاثہ بیت ہیں) کے نشیب وفراز طے کرتے ہوئے عہدِ حاضر تک پہنچے اور انھی سے دورِ جدید کو عقلی وروحانی تمول نصیب ہوا۔ اگر یہ سرمایۂ دانش وروحانیت دست تمدن سے چھین لیا جائے تو پھر تمدّن وبہیمیت بن کر رہجا ئے گا۔

مغرب کی موشگافی اور دقیقہ رسی نے تو اس نہال میں اور نئے نئے برگ وبار پیدا کر دئیے۔ وہاں افراد، اقوام کی تاریخ سے آگے بڑھ کر علوم وفنون کی اسطرح تاریخ لکھی جاتی ہے کہ فلاں علم کب اور کن اسباب سے پیدا ہوا۔ اس کی ترقی کا قدم کیسے آگے بڑھا۔ ترقیاں اور تبدیلیاں کتنی ہوئیں اور کن وجوہ سے ہوئیں۔ اہلِ یورپ کے ذوقِ تفتیش کے تذکرے میں شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کا یہ دلچسپ بیان بھی لائقِ دید ہے۔ مرحوم ایک جگہ

لکھتے ہیں :۔

"یورپ قصیدہ نہیں لکھ سکتا، لیکن مرثیہ کہنے میں اسکو کمال حاصل ہے۔ وہ کبھی کسی زندہ قوم کی تعریف نہ کریگا۔ لیکن جو قوم فنا ہو چکی ہو اسکے علوم و فنون، فلسفہ، مذہب، تمدن، تہذیب پر بہترین کتابیں لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کریگا۔"

بہرطور فن تاریخ ایک ایسی شاہراہ ہے جس کے اطراف و جوانب میں فردوس نظر اور سقر نظیر مناظر دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کہیں بربریت کی گھٹا ٹوپ تاریکی ایسی چھائی ہوئی ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ اور کہیں مدنیت کی وہ خرد افروز تابناکی ہے۔ جسکے سامنے چاند کی چاندنی بھی پھیکی نظر آتی ہے۔ کہیں سطوت و ہیبت کی دھاک ہے، کہیں نصفت و معدلت کا ہاتھ شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پانی پلا رہا ہے۔ اور کہیں بہیمیت کی ہولناک گھاٹیوں میں جور و بیداد کے فیل پیکر خونخوار اژدہے صدق و انصاف کا خون چوس رہے ہیں۔ کہیں فضل و کمال کی گرم بازاری اور کہیں جہل ہرزہ کار کی تباہ کاری وغیرہ وغیرہ ہی باتیں ایوان تاریخ کی نقش و نگار ہیں۔

اس باب میں کارلائل کا یہ قول یاد رکھنے کا ہے :۔

"عہد حاضر کے واقعات کی یہ ریشہ دار جڑیں عہد قدیم کی خاک سے تعلق رکھتی ہیں۔ گزشتہ صدیاں فنا کی گھاٹی میں گر کر خاموش ہو چکیں۔ موجودہ صدی بھی ادھر ہی چلی جا رہی ہے۔ جتنا مؤرخ عاقل ہوگا۔ اتنی ہی تاریخ کامل ہوگی۔ تاریخ ایک بے زبان انجیل ہے۔ کسی قوم کی تاریخ تو بڑی چیز ہے فقط ایک فرد کے سوانح حیات میں بھی کوئی نہ کوئی پیغام ایزدی ضرور پوشیدہ ہوگا۔ انسانی تہذیب اور قومی تحفظ

کے لئے اِس پیغام کو بے کم و کاست واضح طور پر بیان کر دینا اور اس حجاب کو سامنے سے ہٹا دینا جس کے پیچھے دنیا کی عظیم المرتبت شخصیتوں کے حیرت خیز کارنامے چھپے ہوئے ہیں۔ مورخ کا یہی اہم فرض ہے "۔

تاریخ کی اہمیت و برتری کے مدنظر مورّخ کے لئے تکمیل علوم و فنون کے علاوہ بالغ نظری ماحول کی نبض شناسی، واقعات گزشتہ کے جانچنے اور پرکھنے کی پوری صلاحیت، مستعدی و موشگافی کے ساتھ ساتھ مورخانہ وقار و خودداری وغیرہ ایسی اور پابندیاں معین کی گئی ہیں۔ مقدمۂ ابن خلدون میں بڑے بڑے مورخوں کی جابجا لغزشوں اور ٹھوکروں کی تصریح خیال کی رہبری کا فرض ادا کرتی ہے۔ محاسن کی روشنی ہو یا ذمائم کی تاریکی ان مناظر کی عکس کشی میں عصبیت اور شکر گدایانہ کا رنگ نہ آنا مورخانہ متانت و وقار سمجھا جاتا ہے۔ کسی دور کی بدنظمی اور بے عنوانی کی تصویر اُتارنے کے بعد اس پر تصریح بالائے تصریح اور توضیح بالائے توضیح کا گہرا رنگ چڑھانا عصبیت، اور کسی عہد اصلاح و تنظیم کی عکاسی کے بعد پھر تعریف و توصیف کی رنگ آمیزی میں منہمک ہو جانا شکر گدایانہ ہے۔ مناسبت مقامی کے لحاظ سے اِس جگہ عرفی شیرازی کا یہ شعر لکھنا غالباً بیمحل نہ ہوگا :۔

کفرانِ نعمت گلہ مندانِ بے ادب　　　در کیش من ز شکر گدایانہ بہتر است

مستند مورخین، اقوام عالم کی تقسیم نسل، رنگ، زبان، تمدن، مذہب وغیرہ کے لحاظ سے کر کے اعزاز و تذلیل انسانی کا معیار انھی باتوں کو ٹھہراتے چلے آئے ہیں۔ گویا ساری دنیا اسی نسل، رنگ، ملک وغیرہ کے پست ترحدود میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ لیکن بغور دیکھا جائے تو عالم انسانیت کی سیکڑوں ملکوں، ہزاروں نسلوں، مختلف رنگوں میں تقسیم سے استخواں فروشی کی بو آتی ہے حقیقی طور پر اس کا اصلی معیار

صرف ایک اور فقط ایک ہی ہو سکتا ہے۔ جسے " مجد و شرف " کہتے ہیں۔

جیسے ایک درخت کی ہزاروں چھوٹی بڑی پتلی موٹی ڈالیاں ادھر اُدھر پھیلی ہوئی الگ الگ نظر آتی ہیں۔ لیکن اُن ان گنت شاخوں کی بلند سیڑھیوں کے سہارے نگاہ جتنی نیچے اُترتی چلی آتی ہے۔ اتنی ہی یہ بیشمار شاخیں تعداد میں کم ہوتے ہوتے آخر میں ایک تنے کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ ایسے ہی خاندان، قومیں، قبیلے یہ سب کے سب نسل انسانی کے نخل کی بڑی چھوٹی اور موٹی پتلی ٹہنیاں ہیں۔ بہت سے افراد مل کے گھرانے اور قبیلے اور بہت سے قبیلے مل ملا کے ایک قوم اور کئی چھوٹی چھوٹی قومیں ملکر ایک بڑی قوم بنجاتی ہے۔ یہ کڑیاں یونہی ملتی اور مسلسل ہوتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں۔ اور بڑی بڑی قومیں ایک ہو کر تمام انسانوں کو ایک آدم یا ایک جگہ رہنے سہنے والے چند بزرگوں تک پہونچا کر رک جاتی ہیں۔ اور اس سلسلے کا اُتار چڑھاؤ یہیں آ کے ختم ہو جاتا ہے۔

تو مجد و شرف کو معیار حیات انسانی تسلیم کر لینے سے تمام اقوام عالم کی مختلف اور متعدد تقسیموں کی وسعت اور پھیلاؤ سمٹ سمٹا کے " نکوکاری " و " بداطواری " صرف انھی دو حصوں میں سما جاتا ہے صحتِ رُوحانی نیکی۔ اور مرضِ رُوحانی بدی یہی انسانی تندرستی اور بیماری دونوں کی دونوں ہر ایک زمانے میں تغیرات و انقلابات کا طوفان اٹھاتی رہی ہیں۔

کوئی جگہ، کوئی قوم اور کوئی دَور ایسا نہیں جو اِس نور و ظلمت کے تصادم اور محاسن و ذمائم کی آویزش سے خالی ہو۔

آدم اور ابلیس کا امتیاز، ہابیل و قابیل کا فرق۔ صبح آفرینش سے لیکر اب تک بدستور

ظاہر اور نمایاں ہے۔ نوحؑ اور ان کے معاندین کا بغض، ابراہیمؑ اور نمرود کا ہنگامہ، موسیٰؑ اور فرعون کا معرکہ، یزداں اور اہرمن کا اختلاف، زردشت اور ارجاسپ کا عناد، کنس کرشن، کورو، پانڈو، رامچندر اور راون کی سی نبرد آزمائیوں سے دنیا کی کونسی قوم اور کونسا زمانہ محفوظ رہا۔ مقامات کے غیر معمولی بُعد اور بعید تفاوت زمانی کے باوجود عالم کی بدسرشت و ملامت زدہ ہستیاں اپنی اپنی جگہ یکساں بدشعاری سے ایک ہی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں فرعون، نمرود، ارجاسپ، کنس نوعیت زشت کاری میں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے اور ایک ہی گھرانے کے افراد دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ مصر، عراق، ترکستان اور ہند کے مابین ہزاروں میل کا فاصلہ اور ان سیہ کاروں میں باہمی سیکڑوں، ہزاروں برس کے فصلِ زمانی کی سدِ سکندری حائل تھی۔

اسی طرح گمراہوں کو شاہراہ ہدایت پر لانے والے مقدس و محترم پیغمبروں اور مُبلّغوں کا لائق احترام و تعظیم سلسلہ باہمی بُعدِ مکانی اور فصل زمانی کے باوجود نوعیت کار میں ایسی یکسانی رکھتا ہے کہ یہ سب کے سب ایک ہی بزم کمال کے مقدس ہمنشین نظر آتے ہیں۔ ہر قوم ہر ملک اور ہر زمانے میں شقاوت و سعادت، کذب و صدق، خیر و شر کی برابر جنگ چھڑی رہی اور جو فرد یا گروہ اپنی خباثتِ نفس کی وجہ سے کسی قوم یا ملک میں قابل لعنت قرار پایا مسلک اور مذہب کی علحدگی پر بھی کسی نے بھی ان بد باطنوں کو لائق صفت و ثنا نہ سمجھا۔ فرعون اور ابوجہل مسلمانوں ہی کے نزدیک مردود و مقدوح نہیں۔ ہندو، عیسائی بھی انھیں اچھا نہیں جانتے ایسے ہی کنس اور راون ہندوؤں ہی کی نظر میں برے نہیں۔ مسلمان و عیسائی بھی انکو اچھا نہیں سمجھتے۔

جب ایسا واضح اور نمایاں فرق انسانوں میں ہر جگہ پایا جا رہا ہے تو بنی آدم کو قوموں، قبیلوں، ملکوں اور رنگوں کے غیر معمولی اختلاف کی لعنت سے نکال کر "ابرار" و "اشرار" ان قسموں میں تقسیم کر دینا ہی کوتاہ نظری اور ناتواں بینی کے مفاسد سے بچنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ قوم قبیلے اور رنگ وغیرہ پر بیجا فخر و ناز کے بجائے عالم انسانیت میں اخلاقی و روحانی برتری کا سرمایہ ہی لائق نازش و افتخار قرار پانا چاہیئے۔ اور تمام ملکوں، قوموں، نسلوں کے نیک نہاد و پاکیزہ خو افراد کو ایک ہی سلسلے کی مسلسل کڑیاں اور ایک ہی ایوان ہدایت کے برگزیدہ ارکین ماننا لازم ہے، اس سے دُنیا نت نئی تقسیم در تقسیم کے ناروا جھمیلوں سے نجات پا کے فطری اصول پر دن رات کی طرح دُو حصوں میں بٹ جائیگی اور یہ سادہ تقسیم بڑے مفاسد سے عالم انسانیت کو بچا سکے گی۔

وہ پیکرِ خاکی جسے ایک صحیفۂ سماوی ظَلُوم وجَھُول سے تعبیر کرتا ہے ایک طرف تو اسکی یہ قدرت کہ تحت و فوق، پست و بلند، نشیب و فراز، بحر و بر پر آمرانہ حیثیت رکھتا ہے سائنس کی کنجی سے رموزِ قدرت کے بند دروازے کھولتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اسکی لگاتار دوڑ دھوپ کل کی ناممکن باتوں کو آج ممکن بنا چکی۔ اور یہی حالت برقرار رہی تو آج کے محالات کل ممکنات کا صحن بنجائینگے۔ قرب و بُعد الفاظ بمعنی ہو کر رہ گئے۔ پستی و بلندی کی معینہ حدود اب لائق اعتنا نہیں۔ خلوتکدے میں جیسے آج ہزاروں کوس کی نغمہ سرائی، ترنم ریزی، پرمغز تقریریں، پرلطف اسپیچیں بے روک ٹوک سامعہ نواز ہو رہی ہیں۔ اب اسی کے ساتھ سیکڑوں، ہزاروں کوس کے مختلف مناظر بھی جوں کے توں نظر افروز ہونے والے ہیں دوسری طرف اسی ظلوم و جھول کی یہ بے بضاعتی کہ ادوار ماضیہ کے سناٹے میں اسی کے

بنی نوع کا نچا کھچا ہوا سرمایۂ حیات جو ادھر اُدھر منتشر پڑا ہوا ہے۔ اسے یکجا کرنا اس کے بس کی بات نہیں، اور اب تک اس کا دست تدبر ایسے مسلسل نہ کر سکا۔ اسی مجبوری سے عاجز آکر "قبل تاریخ" اور "بعد تاریخ" کی قید و حد معین کرکے فن تاریخ کی تقسیم کرنا پڑی۔

اسیریا، کالدیہ، بابل اور مصر کے بعد قدامت تمدن میں پھر ایران ہی کا نمبر ہے۔ اس سرزمین کو آب رواں، سبزہ زار، لالہ و گل کی بہتات، زمزمہ سنج عنادل کے چہچہوں نے جنت نگاہ اور فردوس گوش بنا دیا ہے۔ جس طرح پیرس اپنی سرسبزی و شادابی، زیبائی و طرب خیزی کی وجہ سے بہشت یورپ ہے۔ اسی طرح یہ ملک اپنی جلوہ سامانیوں کے لحاظ سے فردوس ایشیا تسلیم کیا گیا ہے۔ اردو کے مشہور انشا پرداز شمس العلما مولانا محمد حسین صاحب آزاد دہلوی نے سیاحت ایران سے حظ اندوز ہونے کے بعد اپنی مقبول عام کتاب سخندان فارس کی قدیم تاریخ اپنے خاص انداز میں اس طرح لکھی ہے:۔

"بہت افسوس ہے کہ اس ملک کی راہ تواریخ میں سراغ بالکل مٹے ہوئے ہیں۔ اور جو کچھ ہیں وہ نظم میں ہیں۔ اور افسانوں کے لباس میں چھپے ہوے ہیں، ہاں یورپ میں علم زبان کے محققوں نے اپنے علم کے ذریعے سے اب اتنا پتا لگایا ہے کہ یونان کی تاریخ سے بھی تقریبًا ہزار برس پہلے وہی شرافت پناہ فرقہ جو ایریا کہلاتا ہے۔ بخارا خواہ تاتار غرض وسط ایشیا سے اٹھا اور چاروں طرف عالم میں پھیل گیا۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اشخاص مذکور قدوں کے لمبے، رنگ و کپے گورے چٹے

باپ دادا سے اولوالعزم اور ہمت والے چلے آتے تھے۔ خود شائستہ تھے، اور جانتے تھے کہ شائستگی کے کام اور راحت و آرام کے سامان کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کی ایک شاخ نے اپنے خیالات کو مذہبی نقش و نگار دے کر نگارخانۂ چین سجایا۔ دوسرے نے یونان میں جا کر فلسفہ و حکمت کا طوفان باندھا۔ تیسرے نے روما کی بنیاد ڈال کر روئے زمین پر حکومت شاہی اور حکمت عملی کا نقارہ بجایا۔ ایک شاخ نے اندلس میں جا کر کیسۂ خاک سے چاندی نکالی۔ اور انگلستان سے خبر آئی کہ پانی سے مچھلیاں، بلکہ پہاڑ کے سینے کو چیر کر لوہا تک نکال لائے۔

ہندوستان میں ہمالا اتر آئے۔ اور برہمن دیوتا کہلائے۔ ایران میں شمشیر و گرز سنبھالا اور درفش کاویانی کو مرصع کر کے ہوا میں لہرایا۔ ممالک مذکورۂ بالا میں الفاظ کا اتفاق ان کے اتحاد اصلیت پر گواہی دیتا ہے۔ ان میں بھی جو اتفاق الفاظ کا سنسکرت اور فارسی میں ہے۔ غالباً کسی زبان میں نہ ہوگا۔ چنانچہ گروہ در گروہ لفظوں کے انبوہ بآواز بلند پکار رہے ہیں کہ ان دو خاندانوں کا نسب نامہ ایک ہے اور کہتے ہیں کہ قوم ہی کے نام سے ملک مذکور نے ایران نام پایا ہے اسی کو یونان کی کتب قدیمہ آریان پکارتی ہیں۔

سیامک جسے اہل ایران نت وخشور وخشوران، برگزیدۂ یزداں، خدیو جہاں شاہنشاہ پیشداد کہتے ہیں (بعض کہتے ہیں کہ شیث پیغمبر وہی تھا) نیک نیتی اور داد و دہش کی برکت نے اسے پارسا خطاب دیا تھا۔ اور اسی تقدس سے

اس نے ملکِ بلدِ کور کا نام پارس رکھا تھا کہ پاک اور مقدس کو پارس کہتے ہیں۔
(اور اسی سے ہے پارسا)

بعض کہتے ہیں کہ پیشداد ہوشنگ جس کے با اقبال اور روشن زمانے میں پتھر سے آگ نکلی۔ اس کا لقب بھی پارس تھا اور اسے ایران شاہ بھی کہتے تھے۔ اس نے ایک شہر آباد کر کے اس کا نام ایران رکھا تھا۔ وہی اول بدل کر آج نشاپور کہلاتا ہے اور ایران کے معنی پاک اور پاکیزہ بھی آئے ہیں۔

یہ بھی لکھا ہے کہ فریدوں ابن آبتن کے تین بیٹے تھے۔ جب سلطنت کی ترقی دل کے ارمان نکال چکی تو ملک کے تین حصے کئے

(۱) ملک مشرقی تورج کو دیا۔ ایرانی اسے ان ایران کہتے تھے عرب نے ماوراالنہر اس کا نام رکھا۔

(۲) ملک مغربی سلم کو اہل ایران اس کو ایران پتر کہتے تھے۔

(۳) ملکِ وسطی ایرج کو دیا کہ اسی بیٹے کو بہت چاہتا تھا۔ یہ خط استوا سے جانب شمال اور ممالک ربع مسکون کے وسط میں واقع تھا۔ اسی واسطے مملکت کے کل شہروں میں معتدل اور خوش آب و ہوا تھا۔

ہر قوم کا دستور ہے کہ اپنے ملک میں ایک مقام کو مذہبی برکت سے عظمت دیتے ہیں۔ چنانچہ موسائیوں، عیسائیوں نے بیت المقدس اور عرب میں اکثر انبیا نے اور سب سے اخیر اسلام نے مکے کو معظم تسلیم کیا۔ ہندوستان میں کاشی متھرا وغیرہ وغیرہ۔ ایران نے اس قطعۂ زمین کو متبرک سمجھا۔

بعض مورخ لکھتے ہیں کہ فریدوں نے بھی اسے مقدس مقام اور اپنے باا قبال بزرگوں کا قدمگاہ سمجھ کر یہ ملک پیارے بیٹے کو دیا تھا اور اس میں سے قطعۂ خاص کو اعلیٰ اور روح افزا دیکھ کر پارس نام رکھا تھا (یعنی ارض مقدس) افسوس کہ ان خوبیوں نے اور باپ کی محبت نے بھائیوں کے دلوں میں عداوت کا خنجر ڈھالا اور دونوں نے ملکر ایک بے گناہ کو مار ڈالا۔ ایرج کی ماں کا نام ایران دخت تھا۔

کرمان شاہان کے پہاڑوں میں کوسوں تک پرانے ویرانے پڑے ہیں وہ شاہان قدیم کے جاہ وجلال کی مٹی ہوئی تصویریں ہیں۔ انھی میں ایک مقام طاق بستان مشہور ہے اور دستکاریوں کے نقش و نگار میں ایک جگہ شاپور ذوالاکتاف کی تصویر ہے۔ جو عبارت اس پر منقوش ہے۔ ترجمہ اس کا یہ ہے:-

" بندۂ خدا شاپور عزیز شہنشاہ ایران وا ایران کہ بسلسلۂ آسمانی پسر بندۂ خدا ہرمزد عزیز شہنشاہ ایران وا ایران است و آں بسلسلۂ آسمانی پسر نرگ شہنشاہ نرسی است "

اس سے مراد ہے شاہ پور عزیز شہنشاہ ایرانیاں وغیر ایرانیاں۔ کیونکہ " ایر" "مومن" "اا ایر" غیر مومن کو کہتے تھے اور یہ معنی ملا فیروز پارسی نے مالکم صاحب کو بتائے تھے۔

نقش رستم کے ایک کتابے کا ترجمہ ہے دارا بادشاہ ایران کی زبانی۔ میں شاہ

وشہنشاہ دارا کل آباد ملکوں کا بادشاہ، فراخ دنیا کا سنبھالنے والا کھاشش
پارسا کا بیٹا، بشتاسپ بادشاہ اور آرج کا بیٹا آرج ہوں۔ دیکھنا یہ وہ دارا
نہیں جسے سکندر نے مارا۔ یہ سنہ عیسوی سے ۴۸۵ برس پہلے پیدا ہوا تھا۔
ہندوستان کے آریا بھی اپنے تئیں آرج کہکر یہاں کے شودروں سے
ارجمند کرتے تھے اور انھی کی آبادی سے یہاں کا ملک ہماچل سے بندھیاچل تک
آریاورت کہلاتا تھا اور تم ابھی سُن چکے کہ فارسی قدیم کی کتابوں میں ایران
کے معنی شریف و دانا و ہنرمند بھی لکھے ہیں۔ (یہی ارجمند کا ترجمہ ہے)
اکثر اہل یورپ ابھی تحقیقاتوں کے لئے بمبئی اور خاندیس تک آئے۔
ایران بھی پہونچے۔ پارسیوں کے دستوروں اور موبدوں سے انکی کتب قدیمہ
بہم پہنچائیں۔ ساتھ ہی سنسکرت کی معلومات حاصل کی اور دونوں کو مطابق
کرکے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر دنیا کی پرانی کتابوں میں وید سب سے پرانی کتاب تسلیم
کی جائے تو پارس کے گاتھا ان سے دوسرے ہی درجے میں ہونگے۔"

وہ سرزمین جس کا نام ایران مشہور ہوا۔ اسی سے صاف ظاہر ہے کہ آرین افراد ہی نے یہ نام رکھکر اس جگہ کو بسایا اور آباد کیا۔ ہندوستان اور ایران کے آرین آپس میں بھائی بھائی اور ایک ہی گھرانے کے ان دونوں بھائیوں کی زبانیں بھی یعنی قدیم فارسی اور سنسکرت سگی بہنیں تھیں۔ سنسکرت بولنے والے آریوں اور فارسی بولنے والے ایرانیوں کو ایک ہی قوم یا ایک قوم کی دو شاخیں ماننے بغیر چارہ ہی نہیں۔ کیونکہ مختلف شواہد و امثال سے

یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور اسی کے تسلیم کرنے پر مجبور رہنا پڑتا ہے۔ اِس لحاظ سے ایران اور ہندوستان کو ایک مکان کے دو صحن کہنا کسی طرح نامناسب نہیں۔

جیسے پارسیوں میں وخشوروں (انبیا) کا ایک سلسلہ مانا جاتا ہے۔ ایسے ہی ہندوؤں کے یہاں اوتاروں کا پورا سلسلہ مسلم ہے۔ قدیم ایرانیوں میں معمولی اختلاف کے ساتھ زمانے کی تقسیم وہی ہندوؤں کی سی ہے۔ نوع انسانی کی چار حصوں میں تقسیم ہندوؤں کی طرح ایرانیوں میں بھی تسلیم کی جاتی ہے۔ قدیم ایرانیوں اور ہندوؤں کے خیالات، عقائد عبادات و معاملات تقریباً سب کے سب یکساں اور یہاں، وہاں دونوں جگہ کی زبانوں میں ایسی مشابہت اور یکسانی پائی جاتی ہے۔ جس کی نظیر دنیا کی اور کسی دو زبانوں میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ آریوں اور ایرانیوں کی مذہبی مماثلت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ قربانیوں کے طریقے عبادت کے وقت کی دعائیں ویدوں اور پارسیوں کی کتابوں میں ایسی مشابہ ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

آتش پرستوں کے صبح و شام "گاتھا منتر" وہی ہندوؤں کا "گائتری منتر" ہے۔ ژند میں "ہوم" کے معنی ہیں جلتی ہوئی آگ میں کچھ چیزیں ڈال کر جلانا۔ اِسی کو ہندوؤں کے یہاں "ہون" کہتے ہیں۔ رسوم اور تہواروں میں بھی دونوں جگہ کافی مماثلت ہے۔ جس طرح یہاں دریاؤں پر اشنان کے میلے لگتے ہیں ایسے ہی وہاں "آب ریزاں" کے تہوار ہوا کرتے تھے۔ جاڑے آتے ہند میں جیسے "دیوالی" کی روشنی ہوتی ہے اسی طرح ایران میں جشن چراغاں منایا جاتا تھا۔ یہاں کی "ہولی" اور "بسنت" کا جواب آتش پرستوں میں

"کوسہ برنشین" کا تہوار اور "جشن گُل کوبی" تھا۔ "گئو ماتا" کا پریم پہلے تو پہلے ابتک یہاں جتنا ہے وہ ظاھر ہے۔ آتش پرستوں کے سینوں میں بھی یہی آگ دبی ہوئی چلی آتی تھی۔ ابوریحان البیرونی، آثار الباقیہ میں رقمطراز ہے کہ ایران کے سات بادشاہوں نے گائے کی عظمت و محبت میں اتنا حصّہ لیا کہ اسے اپنے نام کا جز قرار دیدیا۔ گائے کی منزلت و احترام کا ایک تاریخی افسانہ بھی سننے کا ہے:۔

جب ضحاک تازی جمشید کی سلطنت چھین کر خود شہنشاہ بنا تو اس نے وہ ظلم کئے اور ستم ڈھائے کہ تمام ایران چیخ اٹھا۔ کہتے ہیں ضحاک کے دونوں شانوں پر دو پھوڑے، اور بعض کے بیان کے موافق اِس کے جور بیداد کی پاداش میں دو سانپ نکل آئے تھے۔ پھوڑوں کی دوا یا سانپوں کی غذا، آدمی کا بھیجا تجویز کیا گیا تھا۔ آئے دن گھر گھر سے باری باری نوخیز و نوجوان پکڑے ہوئے آتے اور بیگناہ مردا ڈالے جاتے تھے۔ خانوادۂ کیانی کی طرف سے ضحاک خائف رہتا اور ڈھونڈ ڈھونڈ کے کیانیوں کو تلوار کے گھاٹ اتارتا رہتا تھا۔ اسی پکڑ دھکڑ میں کیانی خاندان کی ایک شہزادی اپنی جان بچا کر بھاگی اور پہاڑوں میں چھپتی چھپاتی ٹھوکریں کھاتی ہوئی کسی گاؤں میں جا نکلی۔ نیرنگیٔ قدرت دیکھئے کہ اسی عالمِ غربت میں فریدوں پیدا ہوا۔ مصیبتوں کی سختی نے ماں کا دودھ خشک کردیا تھا۔ اس ننھی سی جان کی پرورش کیلئے کہیں سے ادھر ایک گائے چلی آئی۔ جسے برمایہ اور برمایوں کہنے لگے۔ فردوسی نے کہا ہے:۔

یکے گاو برمایہ خواہد بُدن جہاندار را دایہ خواہد بُدن

یادگار کیانی کوہستانی آغوش میں ابھی زیرِ پرورش ہی تھا کہ ٹوہ لگانے والوں نے غاصبِ سلطنت کو یہ خبر پہونچائی۔ سنتے ہی وہ خود ادھر روانہ ہوا۔ آمد آمد کی خبر اُڑی بیچاری مصیبت کی ماری مادرِ فریدوں اپنے پارۂ جگر کو چھاتی سے لگائے لرزتی کانپتی وہاں سے نکلی اور کسی اور جگہ جا کر روپوش ہوگئی۔ بیزبان برمایہ وہیں چھوٹ گئی تھی بیدادگر نے جب ہاں اپنے کسی شکار کا نشان تک نہ پایا تو جھلا کے اسی برمایہ کو نشانۂ ستم بنایا۔

ادھر تو یہ ہوا اور اُدھر کاوہؔ آہنگر کے بیٹوں کو بھی سانپوں نے ڈس لیا۔ رنج و غم کی آنچ سے بڈھے لُہار کا دل و جگر ایسا جلا کہ اس نے بیتاب ہو کر اپنی دھونکنی کا چمڑا ایک بانس پر باندھ کر بلند کیا اور یہی حُبِّ قومی کا نشان قرار پایا۔ ضحاک کے جور و ستم سہتے سہتے۔ پیمانے بھر چکے تھے چھلکنے کی دیر تھی۔ اِس نشان کے بلند ہوتے ہی ضحاک کے ماروں اور حبِّ قومی کے منچلوں کا ادھر اُدھر سے دریا امنڈ پڑا۔ فریدوں کو جسے کوہستانی فضا پال پوس کے جوان کر چکی تھی۔ مادرِ وطن کے جانبازوں نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے پہلے اپنا بادشاہ بنایا اور پھر دیہیم و سریرِ کیانی کو غاصب سے چھیننے کے لئے سب کے سب ضحاک پر ٹوٹ پڑے۔ کاوہ ایسا لوہا لاٹھ نکلا کہ اس کا لوہا سب نے مانا اور مجسمۂ جور و بیداد ضحاک اسیرِ دامِ بلا ہوا۔

ظفریاب فریدوں نے جھنڈے کے چمڑے کو لعل و جواہر سے مرصع کر کے اس کا نام "درفشِ کاویانی" رکھا۔ ساتھ ہی اپنا فولادی گرز "گاؤ سرگرز" کی صورت میں ڈھال کر

اپنی پیاری "برمایہ" کی ایسی یادگار قائم کی کہ آج تک گرز گاؤسر، گاؤسار، گاؤپیکر، گاؤچہر وغیرہ یہ الفاظ ادب ایران کا جزو لاینفک ہیں۔ اور تو اور یہ اتفاق بھی دیکھئے میزان حوادث میں ہندو ایران اگرچہ بالکل برابر نہیں مگر کچھ تو مماثل ضرور ہیں۔ مثلاً یہاں بودھ کے ہاتھوں جو سنسکرت پر آفت آئی وہی ژند واوستا پر سکندر کی لوٹ مار نے مصیبت ڈھائی۔ پھر جس طرح آریوں نے آکر اپنے پھیلنے کے لئے یہاں کے زرے دیسیوں کو جنگلوں اور پہاڑوں میں ڈھکیل دیا اسی طرح اس فرقے کی دوسری شاخ جب ایران پہونچی ہوگی تو وہاں کے اصلی گھر والے اپنے اپنے گھر چھوڑ کر بیابانوں بنوں میں چھپتے پھرے ہوں گے۔

یہاں کے اصلی باشندوں کی مختلف پراکرتیں تامل اوڑیا تلنگی وغیرہ چلی آتی ہیں ایسے ہی کرد، لک، لُر، لزگی، ژند وغیرہ ایران کے ان فرقوں کی زبانیں ہونگی۔ فارس کے سرسبز و شاداب پہاڑوں، جنگلوں میں یہ خانہ بدوش قبیلے ہزاروں، لاکھوں جال کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی بولیاں چرند و پرند کی سی ہیں جنھیں ان کے سوا کوئی اور نہیں سمجھ سکتا ان کے عادات و خصائل رسم و رواج سب ایرانیوں سے بالکل الگ۔

اگرچہ ایران اپنے قدیم زمانے کے مسلسل تاریخی سلسلے سے تہیدست ہے لیکن اسکی قدرتی فردوس سامانی، دانش و فرہنگ کی فراوانی، نفاست اور تہذیب کی ارزانی، پُرشکوہ آئین جہانبانی دنیا کے مسلمات میں سے ہے۔ تقریباً تین ہزار برس تک ایک ہی قوم کے تاجدار ایسے دبدبۂ اقتدار سے یہاں سریرآرا رہے کہ ہر طرف ایران کی دھاک بندھ گئی تھی۔ قدیم شاہی خانوادوں میں مہ آبادیوں کا خاندان منزلت و تقدس میں سب سے

ممتاز اور تاریخ ایران کا گلِ سرسبد مانا جاتا ہے آخر میں زینت تخت دو ہیم پیشدادی کیانی اشکانی، ساسانی یہ چاروں سلسلے تاریخ فارس کی بنیاد واساس تسلیم کئے جاتے ہیں۔

ہزاروں برس کی مدت فرمانروائی کی سطح کا یکساں رہنا ناممکن اور محال ہے، یہی بات یہاں پیش آئی کہ یکے بعد دیگرے حوادثِ روزگار کے ایسے مہیب زلزلے اور مہلک بھونچال آتے رہے جنھوں نے بار بار ملک کو زیروزبر کر ڈالا۔

جیسے کیانیوں کے دور آخر میں شاہ وقت گشتاسپ، ولیعہد اسفندیار روئیں تن، تمام خاندان شاہی اور امرائے دولت ہدایت زردشت کے موافق دہکتے ہوئے انگاروں اور بھڑکتے ہوئے شعلوں کی روشنی کو ایزدی جلوہ گاہ سمجھنے لگے زردشتی مسلک جدید کی حرارت نے سیکڑوں برس کے رسم ورواج اور مدتوں کے سرمایۂ علوم وفنون کو جلا کے خاکِ سیاہ کر دیا۔ سلطنت کے گھمنڈ پر یہ نیا دین تخمیناً دوسو برس تک اِس طرح پھیلا اور اِس تیزی سے آگے بڑھا جس طرح جنگل کی بھڑکتی ہوئی آگ، یہاں تک کہ سکندر یہ کہتا ہوا ابر وباد کی طرح بڑھا:۔

نہ آتش گزارم نہ آتشکدہ　　　شود ہر دو از دستم آتش زدہ

زردشت؛ جاماسپ کے روشن کئے ہوئے آتشکدے آب شمشیر سے بجھ بجھا کے راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ شہر اصطخر کو جو مدتوں سے سلاطین ایران کا پایۂ تخت چلا آتا تھا نشے کی ترنگ میں سکندر نے جلوا کے خاکستر کر دیا اور اس کا نادر روزگار کتب خانہ بھی آگ میں جھونک دیا گیا۔ اِس بربادی وتباہی کے کچھ دنوں بعد پارتھیا والے اُٹھے اور ژند کے مقدس

ذخیرے کو نیست و نابود کر کے پانسو برس تک اس فتحیاب ملک کو روندتے رہے۔

۲۲۶ء کے بعد گم شدہ گوہر اقبال بانیِ خاندان ساسانی اردشیر بابکان کے ہاتھ آیا اور اسی کے دمِ شمشیر سے پانسو برس کے جسدِ بیجان میں پھر جان آئی۔ دین زردشت کی بجھی ہوئی نورانی آگ پھر روشن ہوئی اور از سرِ نو آتش خانے بن بنا کے تیار ہوگئے یہ خاندان پانسو برس تک اورنگ نشین رہا۔ جس پر اہل فارس کو فخر ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جس سلسلے میں اردشیر، شاپور، نوشیرواں جیسے نصفت شعار فرمانروا منسلک ہوں ان کی قوم جو فخر و ناز کرے وہ زیبا ہے، ساڑھے چار سو برس کے بعد ریگزار عرب سے وہ تیز و تند آندھی اٹھی جس سے ساسانیوں کا افق اقبال گردِ زوال سے اٹ گیا اور درفش کاویانی پرچم اسلام کے سامنے قادسیہ کی خاک پر ایسا سرنگوں ہوا کہ پھر سربلند نہ ہو سکا۔

دولت شاہ نے اپنے تذکرے میں تصریح کی ہے کہ اسلام نے جب ایران کو اپنے کنف حمایت میں لیا تو فرامین، دفاتر، عرائض اور عام مراسلت کی زبان عربی قرار پائی کیونکہ دربار کی زبان یہی تھی اور تین سو برس تک عربی فارسی کو دبا تی رہی۔ مدت کے بعد سامانیوں کے دن پھرے اور ۳۴۲ھ میں تمام دفاتر فارسی ہو گئے ۳۵۰ھ کے قریب منصور سامانی کے وزیر نے فارسی میں تاریخ طبری کا ترجمہ کیا اور رودکی، جسے شعرائے فارس کا ابو الآبا کہا جاتا ہے جلسوں کے لئے غزلیں اور درباروں کے لئے قصیدے کہنے لگا۔

اس اقتدار کے جنم بھوم میں صنادید عجم کے حیرت آفریں آثار اور مٹے مٹائے نقش و نگار کوہ بیستون، طاق بستان، قصر شیریں، خرابۂ شاپور، خرابۂ اصطخر وغیرہ وغیرہ سے اب بھی نمایاں اور آشکار ہیں۔ اکثر پہاڑوں میں شاہان سلف کے دربار، شکار گاہیں، شاہانہ سواری اور اس کا جلوس فوجوں۔ پلٹنوں۔ رسالوں کی ایک سی وردیاں، ان کی باقاعدگی عہد قدیم کی فوجی تنظیم کے یہ تاریخی مرقعے اُس دور کے منظم اصول جنگ کا منظر پیش کر کے سیاح کو حیرت زدہ بنا دیتے ہیں۔

کنارۂ خراسان سے غزنی اور کابل تک اِدھر اور بلخ سے آگے کنارِ جیحوں تک اُدھر کیانی تاجداروں کی طرب انگیز بزمگاہوں اور ہیبت خیز رزمگاہوں کے مرقعے جگہ جگہ خاک پر بکھرے پڑے ہیں۔ بامیان اور بلخ کی دونوں جانب اونچے اونچے پہاڑوں کی دیوار سی چلی گئی ہے بیچ میں سیدھی اور چوڑی ایک شاہراہ ہے، کہیں دونوں طرف کہیں دائیں اور کہیں بائیں دومنزلہ، سہ منزلہ مکانوں کا وسیع سلسلہ ہے، پہاڑوں کو اس طرح تراشا ہے کہ دیکھنے سے عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ طرزِ تعمیر کی استواری اور نقش و نگار کی خوشنمائی کی یہ حالت ہے کہ:۔

"ہر نگہ سلسلہ جنبانِ نگاہِ دگراست"

دیدہ زیب نقش و نگار اور تماثیل عہد سلف گویا ایران کی روایات قدیمہ میں شامل ہیں۔ ہرات میں بدیع الزماں میرزا سے اپنی ملاقات کی کیفیت تزک میں لکھتے ہوئے بابر اس کے دلکشا ایوانوں میں جابجا قدیم معرکوں کے مرقعے اور ایوانات کی زیب و زینت، آرائش و زیبائش کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔

عام راستے سے کچھ دور بائیں طرف قلعہ ضحاک (جسے شہر غلغلہ کہتے ہیں) پر ویرانی کا پہرہ ہے۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی فصیلیں اور شکستہ برج و کنگرے زبان بے زبانی سے سیاحوں کو داستان عبرت سناتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ سیکڑوں خرابے، ہزاروں ویرانے اور شہر کے شہر زمین کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ قندھار و غزنی کا علاقہ زابلستان کے نام سے مشہور تھا۔ جہاں پہلوان رستم کا جنم بھوم سیستان یہیں کہیں تھا، بلخ جاتے ہوئے بائیں طرف کئی کوس پر ایک جگہ سنگ سیاہ کی چٹان پڑی ہے، جو تخت رستم کہلاتی ہے، مشہور ہے کہ رستم یہیں شکار کھیلا کرتا تھا۔ زمانہ کی ٹھیسوں پر ٹھیسیں اٹھانے پر بھی آج اس سرزمین کا جب یہ حال ہے تو نجانے اُس وقت کیا عالم ہوگا۔

جس طرح شاہان سلف موبدوں کے چشم و ابرو پر نظر دوختہ اور انکی جنبش لب پر کان لگائے رہتے تھے، اسی طرح عہد اسلام میں شیوخ اور مجتہدین وارث مسند نبوی اور انکی زبان فتوائے شریعت سمجھی جاتی تھی، کسی تاجدار کی بھی یہ مجال نہ تھی کہ شیخ الاسلام یا مجتہد وقت کے حکم سے انحراف کر سکتا۔ بغیر مرضی کسی عورت سے شاہ عباس نکاح کرنا چاہتا تھا، اس کے بھائی کے استغاثے پر مجتہد مولانا احمد اردبیلی نے ایک پُرزے پر ڈھائی بول لکھ کے دیدیئے۔ "برادرم عباس! خواہر حامل رقعہ را باوے بازدہ۔ فقط"۔ اس کی تعمیل فوراً ہوئی اور نازش و افتخار کے طور پر یہ نامہ مختصر شاہ نے یہ کہکر اہل دربار کو دکھایا کہ سرکار شریعتمدار نے مجھے "برادر" تحریر فرمایا ہے۔

گیارھویں صدی کے بعد دولت صفویہ کا خاتمہ ہوا اور اس کے ساتھ علما و مجتہدین کی شمع منزلت و اقتدار بھی جھلملانے لگی۔ امور شرعیہ کی تلقین و تعلیم کے لئے ناصرالدین شاہ کے عہد تک ملّائے عسکر کی خدمت چلی آتی تھی، اس دور میں علاقہ ناثر ندران سے کے

ایک باغی سردار کی تادیب و سرزنش کے لئے پائے تخت سے فوج روانہ ہوئی ملائے عسکر کو نجانے غنیم نے کچھ سبز باغ دکھایا، یا خود ہی رگ زہد واتقا جنبش میں آگئی کہ اہل لشکر کو ملائے عسکر نے یہ ہدایت فرمائی کہ ادھر اُدھر دونوں طرف مسلمان ہی مسلمانان ہیں اور مسلمان کا مسلمان پر ہاتھ اٹھانا ناروا ہے اس لئے یہ ناجائز لڑائی کسی طرح جائز نہیں ہوسکتی۔ یہ تلقین اوگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہوگئی اور کھلم کھلا پورے لشکر نے لڑنے سے انکار کردیا۔

یہ رنگ دیکھکر سپہ سالار بہت سٹپٹایا اور اس واقعے کی فوری اطلاع پائے تخت بھیجی۔ فوراً حکم شاہی پہونچا کہ ملا کو نظر بند کرکے جلد باغی کی سرکوبی کی جائے۔ نجانے کیسے ملا صاحب کے کان میں بھی یہ بھنک پڑی۔ پھر کیا تھا، چھپتے چھپاتے سر پہ پاؤں رکھ کر یہ وہاں سے ایسے بے تحاشا بھاگے کہ ہندوستان پہنچکر دم لیا۔ اس واقعے کے ساتھ ہی ملایان عسکر کی موقوفی کے احکام جاری ہوئے۔

ایران میں کسی کے یہاں سے جام و سبو، ساغر و مینا یہ سامان میکشی برآمد ہوا مجتہد وقت فاضل نجفی کے حکم سے آلات مینوشی چکنا چور اور جس گھر سے یہ تبرک نکلا وہ گھر لوٹنے والوں کے لئے مال غنیمت بن گیا۔ شاعر بھی بڑے سرپھرے ہوتے ہیں اور وہ بھی ایران کے جہاں ظرافت، خوش طبعی، زندہ دلی، شوخی گویا سرشت میں داخل ہے۔ اس دار و گیر پر مرزا یغما چپ نہ رہ سکے اور یہ رباعی لکھ ڈالی:۔

شیخ نجفی شکست پیمانۂ مے ‏ ‏ ‏ گردیدہ بساط بادہ خواراں ہمہ طے

گر بہر خدا شکست پس وائے بما ‏ ‏ ‏ ور بہر ریا شکست پس وائے بوے

اس کی اتنی شہرت ہوئی کہ شیخ نے بھی سنی۔ دربارِ اجتہاد میں مرزا طلب کئے گئے، جب پہونچے تو یہ ڈانٹ پڑی کہ "یقیناً اہانت شروع کردی۔ بدکردی" انھوں نے یہاں تو بہت کچھ توبہ و استغفار کی لیکن گھر آتے ہی ایک نئی غزل لکھ، دوستوں کے حوالے کر، خود چپکے سے کہیں اور کھسک گئے۔ اسی غزل کا ایک شعر یہ ہے۔

زِ شیخِ شہر جاں بردم بہ تزویرِ مسلمانی　　مدارا گر باین کافر نمی کردم چہ میکردم

فاضل نجفی نے یہ سنکر کیا کچھ نہ کہا ہوگا۔ مگر چونکہ دستِ اجتہاد مس ہو چکا تھا اس لئے مرزا گوشمالی سے محفوظ رہے ورنہ جہاں جاتے وہاں سے پکڑے آتے۔

اگرچہ ایران قدرتی چمن زار ہے لیکن اُس کے چپّے چپّے اور قطعے قطعے سے آب و ہوا کا اختلاف اور موسموں کا فرق آشکارا ہے۔ کچھ مقامات بہت گرم ہیں کچھ بہت سرد اور کچھ معتدل۔ جنوبی اضلاع میں کرمان، یزد، لارستان وغیرہ گرم ہیں اور بعض تو گرمی میں عرب کی طرح لہار کی بھٹی بن جاتے ہیں، مگر موسمِ سرما اور بہار کی شگفتگی اس کی تلافی کر دیتی ہے، شیراز اور اسکے متعلقات معتدل، پرلطف آب و ہوا، شگفتہ فضا، نہریں اور آبشار جاری، دامنِ کوہ ہرے بھرے پھولوں سے لدے، غلّے کی افراط اور میووں کی بہتات۔ جتنا شمال کی طرف بڑھئیے آب و ہوا کی لطافت بڑھتی ہوئی معلوم ہوگی۔ اصفہان نیمہ جہاں کی گرمی شیراز سے کم اور جاڑا زیادہ، سال میں صرف چند ہفتے برفباری، باقی صاف و شفّاف سپہرِ زنگاری، بارش بھی دھواں دھار نہیں ہوتی، ہوا صاف مگر اثر میں خشک۔

آذربائیجان اور اس کے متعلقات میں وہ قیامت کا جاڑا پڑتا ہے کہ پارہ ۲۰ اور ۲۵

نیچے اتر آتا ہے۔ یہاں فروری میں کھیتی کٹتی ہے اور وہاں ۱۵ر جولائی سے ادھر نہیں۔ ہمدان میں بھی بہت برفباری ہوتی ہے، کردستان جنوبی ملک سہی لیکن زمین کی بلندی کی وجہ سے ٹھنڈا ہے، مازندران، گیلان وغیرہ شمال ایران میں یہ مقامات گرم اور سیراب دونوں ہیں خراسان بہت سرد ہے لیکن جو علاقہ سیستان سے متصل ہے وہ اتنا ہی گرم ہے جتنا خراسان سرد۔ وہاں گرمی کی فصل میں لُو کی اذیت کئی کئی دن باہر نہیں نکلنے دیتی۔

ایران کی بہار وہیں کیلئے ہے۔ ہندوستان نے اس منظر کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھا۔ یہاں اس کے جوڑ کی فصل "برسات" ہے جس میں معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جادو جگا رہا ہے، موسم رنگ و بو سے کھیل رہا ہے، فضا سے مسرت ٹپکی پڑتی ہے، کیف آور انگڑائیاں چلی آتی ہیں، دل سے جوش اور اُمنگ اُبل رہی ہے، آسمان جھکا ہوا زمین سے سرگوشی کر رہا ہے، سرمگیں فضا میں سفید سفید بگلوں کی قطار جیسے سرمئی اطلس پر سفید ریشمی گوٹ کی بہار۔ اُودی اُودی گھٹاؤں میں بجلی کی چمکتی ہوئی لکیریں جیسے لاجوردی سطح پر سنہری تحریریں۔ اندھیرے گھپ میں بادل کی گرج، بجلی کی چمک، کوئل کی کوک پپیہے کی پکار، مینہ کبھی موسلا دھار اور کبھی ہلکی ہلکی پھوار، چھلکتے ہوئے ندی نالوں کا زور، اُمنڈتے ہوئے دریاؤں کا شور، جھڑی لگنے سے زمین کا دفینوں پر دفینے اگلنا، چمپا اور موتیا کی بھینی بھینی خوشبو سے چپے چپے کا مہکنا یہ سماں ایران میں کہاں۔ آزاد مرحوم نے بہار نوروز کے عنوان سے ایران کے موسم بہار کی فتنہ سامانیاں، لالہ و گل کی رعنائیاں، شمیم بہار کی عطر پاشیاں، سبزۂ نودمیدہ کی انگڑائیاں دکھاتے دکھاتے شاہد گل کے سامنے بلبل نغمہ سنج کی وارفتگی اس طرح دکھائی ہے:۔

"ادھر گلاب کھلا اُدھر بلبلِ ہزار داستاں اس کی شاخ پر بیٹھی نظر آئی، بلبل نہ فقط

پھول کی ٹہنی پر بلکہ گھر گھر درختوں پر بولتی ہے اور چہچہے کرتی ہے اور گلاب کی
ٹہنی پر تو یہ عالم ہوتا ہے کہ بولتی ہے، بولتی ہے، بولتی ہے حد سے زیادہ مست
ہوتی ہے تو پھول پر منہ رکھ دیتی ہے اور آنکھیں بند کر کے زمزمہ کرتی رہجاتی ہے۔
تب معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں نے جو اس کے اور بہار کے اور گل و لالہ کے مضمون
باندھے ہیں وہ کیا ہیں اور کچھ اصلیت رکھتے ہیں یا نہیں۔ وہاں گھروں میں
نیم کیکر کے درخت تو ہیں نہیں۔ سیب، ناشپاتی، بہی۔ انگور کے درخت ہیں
چاندنی رات میں کسی ٹہنی پر آن بیٹھتی ہے اور اس جوش و خروش سے بولنا
شروع کرتی ہے کہ رات کا کالا گنبد پڑا گونجتا ہے۔ وہ بولتی ہے اور اپنے زمزمے
میں تانیں لیتی ہے اور اس زور شور سے بولتی ہے کہ بعض موقعوں پر چہچہ چہچہ
کر کے جوش و خروش کرتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکا سینہ پھٹ جائیگا۔
اہل درد کے دلوں میں سنکر درد پیدا ہوتا ہے اور جی بے چین ہو جاتے ہیں۔
میں ایک فصل بہار میں اسی ملک میں تھا، چاندنی رات میں صحن کے درخت
پر آن بیٹھتی تھی اور چہکارتی تھی تو دل پر ایک عالم گذر جاتا تھا کیفیت بیان
میں نہیں آسکتی، کئی دفعہ یہ نوبت ہوئی کہ میں نے دستک دے کر اڑایا"

سکندر کے حملے اور پارتھیوں کے قبضے کے بعد تجسس کی بلندی سے واقعات گذشتہ
پر نظر ڈالئے تو بنو امیہ، بنو عباس، دیالمہ، طاہریہ صفاریہ، سامانیہ، غزنویہ، سلجوقیہ، تاتاریہ
صفویہ، زندیہ، قاچاریہ، یکے بعد دیگرے یہ بارہ سلسلے کم و بیش جال کی طرح سرزمین ایران

پھیلے ہوئے دکھائی دیں گے. گویا ایوان فرمانروائی ایران کے گنتی کے صرف چار خاندانوں اور ایک تن تنہا نادر کے سوا اور سب کے سب بیرونی افراد ہی سے معمور رہا اور زیادہ تر عروج و اقتدار کی بازی انھی کے ہاتھ آتی رہی۔

ایران و ہند کا بھی ابتدا سے چولی دامن کا سا ساتھ رہا اور باہمی تعلقات کی خوشگواری آگے بڑھتی رہی۔ یہانتک کہ کبھی کبھی یہ نوبت بھی آئی کہ میزبان ایران نے اپنی تمام عطوفتوں اور پوری لطف ریزیوں کے ساتھ مہمان ہند کی دلجوئی اور تواضع میں نگاہیں فرشِ راہ کردیں۔ ہمایوں کی تیرہ بختی کے زمانے میں اس دل شکستہ تاجدار کے ساتھ شاہ طہماسپ صفوی نے جو رفیقانہ و غمگسارانہ طرزِ عمل اختیار کیا وہ ایوان تاریخ کے کرسی نشینوں سے پوشیدہ نہیں، اسی طرح شاہ عباس صفوی اور شہنشاہ اکبر کے عہد کے ایران و ہند کی گلکاری تخئیل کے دلچسپ مرقعے آجتک نگارخانہ تاریخ کی زیب و زینت ہیں۔ وہاں اور یہاں کی دقیقہ رس، پُرلطف تخئیل کی آڑ میں دو ہمعصر شہریاروں کی فخریہ چشمکیں دیکھنا ہوں تو پہلے سریرآرائے ایران کا یہ انداز تفاخر ملاحظہ کیجیے:-

ازبک بہ سنان و تیر و خنجر نازد　　زنگی بہ سپاہ و خیل و لشکر نازد

ہندی بجواہرات پُرزر نازد　　عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

ایران کا یہ رجز سنکر ہندوستان کیسے خاموش رہ سکتا تھا، اس نے بھی ترکی بترکی جواب دیا ملک الشعرا فیضی نے اپنے کشورستاں کی برتری نئے انداز سے ثابت کی اور شاہ عباس کے فخر و مباہات کا یہ برجستہ جواب لکھکر پیش کیا:-

ازبک بہ سنان و تیر و خنجر نازد　　زنگی بہ سپاہ و خیل و لشکر نازد

عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد　　کونین بہ ذاتِ پاکِ اکبر نازد

اس چھیڑ چھاڑ میں تفنن طبع کے سوا کسی شکر رنجی وغیرہ کا شائبہ تک نہ تھا۔ ایران و ہند میں جب یہ معاصرانہ خوش طبعی اور مزاح ہو چکی تو پھر وہاں سے یہاں اور یہاں سے وہاں شاہانہ گراں بہا تحائف برابر آتے جاتے رہے۔

قاچاریوں کے دورِ آخر کو تو ایران کا دمِ واپسیں سمجھنا چاہیئے، سازش، خود غرضی، زرپرستی، غدّاری و وطن فروشی کا ایک سیلاب تھا جو امنڈا چلا آ رہا تھا۔ بیرونی سلطنتیں گھات میں لگی ہوئی اپنی ریشہ دوانی سے اُس پر قابو پا کر مال موروثی کی طرح آپس میں تقسیم کر لینا چاہتی تھیں۔ ملک کی زبوں حالی اور غدّاری و تیرہ خیالی انتہا تک پہنچ چکی تھی، مادرِ وطن کے غمگسار سوگوار اور رہزنِ کار اپنی حرّیت و اقتدار کو اغیار کے ہاتھ بیچ ڈالنے پر تیار تھے۔ اسی خلفشار میں یہیں سے ایک نبرد آزما، شیر دل، فولاد بازو، مادرِ وطن کا سچّا فدائی یہ بگڑا ہوا رنگ دیکھ کر جھپٹا اور بے خوف و خطر جان پر کھیل کر ملک کے طوفانِ حوادث میں جھم سے کود پڑا۔ یہ دریائے تہور کا شناور امواجِ مصائب اور گردابِ نوائب سے ٹکراتا، آفات و بلا کے پُرخروش دھارے کو آڑا کاٹتا، ڈوبتے ہوئے سفینۂ ملک کو اپنے انتھک بازوؤں کے سہارے سے سنبھالتا ہوا ساحلِ مراد تک لے آیا اور یہ وہی تھا جسے ظاہر بیں نگاہیں مدت تک معمولی لشکری سمجھتی رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ زمانہ اسے ایک غیر معروف سپاہی کی حیثیت سے تو جانتا تھا مگر اس راز سے واقف نہ تھا کہ قدرت اسی بھیس میں شاہانہ عظمت و منزلت کو نشو و نما دے رہی ہے اور اسی آڑ میں ایک کشورستاں دماغ تربیت پا رہا ہے۔ یہ رازِ سربستہ اُس وقت کھلا جب دنیا نے اس معمولی فوجی کو سریر آرائے معدلت دیکھا۔ آئینِ جہانبانی میں بوسۂ شمشیر

عروس سلطنت کا مہر قرار دیا گیا ہے۔ اس دَین کو پہلوی تاجدار نے ادا کر کے کوشک حکمرانی میں جلوہ فرما ہوتے ہی عالم کو یہ جتا دیا کہ :۔

عروس ملک کسے در کنار گیرد تنگ　　　　که بوسه برلب شمشیر آبدار زند

وہ ایران جیسے ہزاروں برس سے فتح و نصرت کے نشان سلامی دیتے چلے آتے تھے، جس کا دربار کامرانی و ظفر یابی کی نذروں سے معمور رہا کرتا تھا۔ اس کی لُٹتی ہوئی دولت، چھنتی ہوئی عظمت، دبتی ہوئی شوکت گھٹتی ہوئی سطوت، مٹتی ہوئی وقعت کو اسی ذیوقار نے سینہ سپر ہو کر نہ صرف لٹنے اور مٹنے سے بچایا بلکہ اس دادگر کا طرز فرمانروائی سحابِ کرم بن کر ملک کے چپے چپے پر برسا اور برس رہا ہے جس نے فارس کی امیدوں اور تمناؤں کے جل تھل بھر دیے، موجودہ تنظیم، رفاہ و فلاح، امن و آسودگی، فارغ البالی و خوش حالی، ترقی کی دوڑ میں سلطنت کی سبقت و پیش روی یہ سب اسی ابرِ کرم کا فیضان ہے۔

سلطنت کے فرسودہ نظم و نسق کی تدریجی تبدیلی امور مملکت کی تنظیم و باقاعدگی کی تفصیل اصل کتاب کے معائنے سے پیش نظر ہو گی، یہاں صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ملک فارس کے قدرتی مناظر کی بوقلمونی، صنائع کی دیدہ زیبی، لٹریچر کی گرانمایگی، ایرانیوں کی سبق آموز مخصوصیات طبعی وغیرہ وغیرہ سے کہیں بڑھ کر حوادث کی ناہموار و دشوار گذار خطرناک راہ کو بسرعت طے کر کے کوشکِ جہانبانی میں پہلوی تاجدار کی اورنگ نشینی نہایت استعجاب آور منظر ہے، اس عہد سے پہلے پورا ملک خاکِ ذلت پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور تاراجی سلطنت کی وجہ سے خزانے میں خاک اڑ رہی تھی اور اب اگلے برس کے سالنامے (موازنے) کے لحاظ سے

ایک عرب باون کرور، ترانوے لاکھ بانوے ہزار چھ سو اڑتالیس ریال خالص محاصل ملک سے خزانہ معمور رہتا ہے۔

پھر انگلو ایرانین آئل کمپنی کی رائلٹی جو سالانہ کئی کرور ہوتی ہے نہ تو یہ معتد بہ رقم اس محاصل میں شامل ہے اور نہ ریلوے کی تعمیر کے لئے مخصوص کیا ہوا چائے اور شکر کا ٹیکس محاصل سلطنت میں شریک ہے۔ انکم ٹیکس کی ترویج پر بھی حکومت غور کر رہی ہے، مملکت ایران کے بڑے رقبے پر ایسی جاگیریں اور زمینداریاں پھیلی ہوئی ہیں جن سے کسی قسم کے ٹیکس یا نذرانے کے نام سے ابتک کوئی رقم گورنمنٹ کو نہیں ملتی۔ انکم ٹیکس جاری ہوجانے کے بعد محاصل ملک کے مصرحۂ بالا اعداد و شمار میں غیر معمولی افزونی ذبیشی لازمی ہے۔ اَللّٰھُمَّ زِد فزد۔

دولتِ ایران کی تنظیمِ عسکری کا اندازہ وہیں کی اس تازہ اطلاع سے ہوگا کہ کہ سرزمینِ فارس پر اسوقت دس لاکھ سامانِ جنگ سے آراستہ جانبازوں کے لشکر جرار کا امڈتا ہوا سمندر موجزن ہے، یہ نبرد آزما سپاہ کیل کانٹے سے درست جدید ترین جرمن اور روسی ساخت کے تمام آلاتِ حرب سے لیس ہر وقت میدانِ دغا میں اترنے کیلئے مستعد اور بغیر کسی تاخیر کے محاذ جنگ پر آنیکے واسطے تیار رہتی ہے۔ دولتِ ایران چند ایسے بمبار طیارے بھی برطانیہ سے خرید رہی ہے جو یورپ میں بہترین جنگی طیارے مانے جاتے ہیں۔

شاہ فاروق والی مصر کی ہمشیر کا عقد ولیعہد ایران کے ساتھ ہز مجسٹی شاہ ایران کی روشن خیالی اور مآل اندیشی کا ایسا واضح ثبوت ہے جس نے تاریخ فارس میں ایک نہایت

اہم اور دلچسپ باب کا اضافہ کر دیا۔ یہ نیا رشتہ نہ صرف دو مملکتوں کے اتحاد و اتفاق کا ضامن ہے بلکہ فرقہ وارانہ وہ نفرت و کدورت جو شیعوں اور سنّیوں میں چلی آتی تھی اس تقریب سے وہ اب برقرار نہیں رہ سکتی۔

ہندوستان کے شیعوں اور سنّیوں کی موجودہ شرمناک آویزش پر اس مسالمت پسند اور رنگ آرا کے صحیح خیالات کا اندازہ درجِ ذیل اطلاع سے بخوبی ممکن ہے:۔

"سنڈے کرانیکل" میں ایک امریکن اخبار نویس ایف۔جے۔پی کا یہ مضمون شایع ہوا ہے کہ وہ ٹرکی کی سیاحت سے فارغ ہو کر جب ایران پہونچا تو اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے شیعہ، سنّی مسلمانوں کی خانہ جنگی کا ذکر بھی آگیا، یہ گفتگو چھڑتے ہی فرطِ غضب سے اعلیٰ حضرت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ نامہ نگار کی طرف کڑی نگاہوں سے دیکھا اور شیر کی طرح گرج کر فرمایا، میں نے بھی اخباروں میں اس احمقانہ جنگ کا حال پڑھا ہے میرے سامنے ان لوگوں کا ذکر نہ کرو۔ میں ہندوستان کے احمق شیعوں اور سُنّیوں کا نام سننا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ حمایت اسلام کے پردے میں اسلام کی بنیادیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ دفعتہً اعلیٰ حضرت کا غصہ فرو ہوا اور چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے امریکن اخبار نویس سے دریافت کیا کہ کیا تم ہندوستان بھی جاؤ گے؟ جواب اثبات میں ملنے پر نہایت بے تکلفی سے قہقہہ لگایا اور فرمایا کہ اچھا تو تم سنّیوں کے

مولویوں کو میرے بھائی عصمت انونو کی جانب سے ٹرکی جانے اور شیعوں کے مجتہدوں کو میری طرف سے ایران آنے کے لئے مدعو کر دینا، ہم دونوں ایک دن میں انھیں انسانیت کا سبق پڑھادیں گے۔"

۱۹۱۳ء ایران کے لئے ایسا پُرآشوب دور تھا جس کے اضطراب وانتشار سے فارس کی مرگ وزیست کے سوال نے سخت نزاکت اختیار کرلی تھی اور قرائن اس قدیم راجدھانی کی بقا کے مقابلے میں فنا پر زیادہ زور دیرہے تھے۔ اسی زمانے میں اُمّ الاعظم ملگرامی میری اہلیہ نے مسٹر مارگن شستر کی کتاب اسٹرینگلنگ آف پرشیا، مس سائیکس کی تصنیف تھرو پرشیا آن اے سائڈ سیڈل اور پروفیسر ایڈورڈ براؤن کی "تاریخ انقلاب ایران وغیرہ سے اخذ مضامین کے بعد اردو میں فغانِ ایران کے نام سے ایک کتاب تالیف کی جس میں قلچاریو کے عہد آخر کی بدنظمی وعیاری، سقاکی وغداری سے ملک کی پامالی وزبوں حالی کی دردناک داستان سپرد قرطاس کی گئی تھی۔ یا یوں تصور فرمایئے کہ اسوقت کی بربادی ایران پر آنکھوں کے آنسو حرفوں کی شکل میں بہ نکلے تھے۔

حُسنِ قبول نے اسکا ساتھ دیا اور ملک نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ قاعدہ ہے کہ زحمت ومصیبت میں راحت وفراغت کی یاد بہت ستاتی ہے۔ جب اس تالیف پر نظر پڑتی تو دل و جگر میں یہ حسرت چٹکیاں لینے لگتی تھی کہ نالہ کش ایران کو کیا کبھی خندۂ مسرت بھی نصیب ہوسکتا ہے؟ اسوقت کے حوادث تو برابر انکار ہی کرتے رہے لیکن گردوپیش کی نامساعدت پر بھی اس حسرت کی خلش بدستور باقی رہی۔ آخر شب وروز کی آمدورفت سے :- درپسِ ہر گریہ آخر خندہ ایست،

کے آثار ظاہر ہوئے اور جاں بلب مریض فارس کے رو بصحت اور پھر صحتیاب ہو کر پُر قوت ہونے کی اطلاعیں، سامعہ نواز ہونے لگیں۔ ایران کے دور نامرادی سے عہد کامرانی کے قبل تک جو استعجاب دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا، زمانے کی زبان سے حسب دلخواہ اسکا جواب سنکر میری مسرت کی انتہا نہ رہی اور خیال آیا کہ جس گھر سے نالۂ ایران کتاب کی صورت میں نکلا اسی گھر سے کارنامۂ ایران کو بھی کسی نہ کسی شکل میں رونما ہونا لازم ہے۔

اسی اثنا میں اسمٰعیل کالج واقع اندھیری بمبئی کے پرشین پروفیسر اے۔ایم۔مولوی۔ایم اے ڈی، آئی، پی کی تصنیف ماڈرن ایران میری نظر سے گذری، یہ کتاب کاوش و عرقریزی سے لکھی گئی ہے اور بقول سر مرزا اسمٰعیل خاں معین الملک دیوان ریاست میسور، عہد پہلوی کی دلچسپ کارناموں کا تفصیلی مرقع ہے، اگرچہ اس میں اکثر کہی ہوئی باتوں کے بار بار دہرانے سے بے لطفی سی پیدا ہو گئی ہے اور کہیں کہیں واقعات تاریخی میں بھی کتر بیونت دکھائی دیتی ہے مگر اسپر بھی مجموعی حیثیت سے کتاب کی دلچسپی اور طرز بیان کی شگفتگی لائقِ داد ہے، کتاب زیر بحث کا مطالعہ سمندِ عزم پر تازیانہ ہوا اور فوراً اردوے معلیٰ کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے مصنفِ کتاب سے اجازت حاصل کی گئی بعد اجازت آغاز ترجمہ سے قبل اسی موضوع پر چند اور کتابیں ہاتھ آگئیں انھیں دیکھ چکنے پر پہلے ارادے میں ترمیم کرنا پڑی اور ان سب میں سے دلپسند مضامین کے نکہت انگیز گل خوشرنگ انتخاب جستجو کے ہاتھوں سے چُن کر رشتۂ تالیف سے ان مہکتے ہوئے نظر فروز پھولوں کا سدابہار گلدستہ بنا کے ہدیۂ ارباب نظر کیا جاتا ہے۔

"تیری رحمت سے الٰہی پائیں یہ رنگِ قبول پھول کچھ میں نے چنے ہیں قدردانوں کیلئے"

تو اس طرح ترجمے کے ارادے نے تالیف کی صورت اختیار کرلی، اسپر بھی یہ توضیح ضروری

ہے کہ میری تالیف کا زیادہ حصہ ماڈرن ایران کے آزاد ترجمے کی نوعیت رکھتا ہے، کیونکہ زیر تذکرہ تصنیف کے کل مقامات مکرر ہونے کی وجہ سے اور بعض غیر ضروری خیال کر کے نظر انداز کر دیے گئے۔ پھر جو باتیں خلافِ واقعہ معلوم ہوئیں محض اظہار واقعہ کے طور پر دو تین جگہ فٹ نوٹ میں ان کی تصریح کر دی گئی ہے، چونکہ سیاحتِ ایران سے میں بھی لطف اندوز ہو چکا ہوں اس لئے میری تحریر کی بنیاد سنی سنائی باتوں پر نہیں بلکہ مشاہدۂ عینی پر مبنی ہے۔

پروفیسر موصوف نے عمر خیام کے مزار کی نسبت جو اظہار خیال کیا ہے، افسوس ہے کہ میرا مشاہدہ اس سے ہم آہنگ نہیں۔ میں نے تو ایک امام زادے کے مقبرے کے متصل ایک مسقف دالان کے بیچوں بیچ اس باکمال حکیم اسلام کو محو استراحت دیکھا۔ بالیں و پائین خوابگاہ کوئی گل افشاں نہال ہے اور نہ کوئی سایہ فگن درخت۔ بہر طور ایرانیوں کی اولوالعزمی اور ملک کی رفتار ترقی یونہی برقرار رہی تو آگے بڑھ کے وسط ایشیا میں ایک نیا جاپان دنیا دیکھ لے گی، ہندوستان کی اس ہمجوار سلطنت نے تھوڑی مدّت میں ایسی حیرت خیز ترقی کی جس پر ترقی یافتہ ممالک کو بھی استعجاب ہے، انھی اصلاحوں اور ترقیوں کی سبق آموز داستان یہاں والوں کے گوش زد کرنا اور ترقی پذیر تمدن سے روشناس کرانا یہی اس تالیف کی حقیقی غرض و غایت ہے۔

یہ سچ ہے کہ بیش قدمی کے جو ذرایع اور مواقع اہل ایران کو حاصل ہیں وہ بات بھلا یہاں کہاں۔ پھر بھی آئے دن کے باہمی مناقشوں میں اگر بربادیٔ قوت و طاقت کی پوری روک تھام کے بعد اتحاد و اتفاق سے یکدل و ہمزباں ہو کر جوشِ عمل اور ولولۂ اقدام کے صحیح جذبات مسلمانوں میں پیدا ہو جائیں تو یہی مفلوج اور ناکارہ قوم عہد اکبری اور دورِ شاہجہانی کا باصرہ نواز

منظر زمانے کو پھر دکھا سکتی ہے، اگر ہندوستان جس نازک دور سے گزر رہا ہے، اُسے دیکھتے ہوئے یہ امید نہیں کہ خاک ہند سے کوئی ایسا قائدِ اعظم اٹھ سکے جس کی کف حمایت دس کروڑ مسلمانوں کے منتشر و پراگندہ سلسلے کی نہ صرف شیرازہ بند ہو بلکہ یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس سلسلۂ اتحاد و یکجہتی میں منسلک کر سکے جو شیر شاہ سوری اور شہنشاہ اکبر کے ادوار معدلت کا طغرائے امتیاز رہ چکا ہے۔

امروز و فردا سے گھری ہوئی دنیا میں ایک چیز کی انتہا سے دوسری کی ابتدا ہوا کرتی ہے۔ صحت سے مرض اور مرض سے صحت، کمال اقبال سے زوال اور زوال کی انتہا سے تدریجاً اقبال کا رونما ہونا یہاں کا خاص دستور ہے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو ابھی تنزل ہند بھی مکمل نہیں، کیونکہ یہاں کی پستی ابھی اور خواہان تنزل معلوم ہوتی ہے۔ نہ جانے ابھی اور کتنے ہولناک منازل زوال اس بدنصیب ملک کو طے کرنا باقی ہیں۔ یعنی ہند جبتک اپنے آخری درجے تک نہ پہنچ جائے اسوقت تک یہ دور نہیں ہو سکتی اور یہ خدا ہی جانتا ہے کہ ہندوستان کا تنزل کبتک منتہائے کمال پر پہونچکر زوال اختیار کرے اور یہاں کی انتہائی پستی کا دور ختم ہو کر اوج و بلندی کی ابتدا سے کب اس ویرانے کے دن پھریں؟

کج خلقی ہوگی اگر اختتام دیباچہ سے قبل اپنے پرسنل اسسٹنٹ سید حبیب حسن صاحب کے اس خلوص کا شکریہ ادا نہ کروں جس نے اس تالیف کے پھیلے ہوئے کام کے سمیٹنے میں میرا ہاتھ بٹایا اور ناسپاسی ہو گی اگر مصنف ماڈرن ایران کے اس لطف ریز التفات کی منت پذیری کا اعتراف نہ کیا جائے جو موصوف نے زیر تذکرہ تالیف میں شامل کرنے کے لئے بغیر طلب

اپنی تصویر عنایت فرمائی۔ اجازت ترجمہ کی پہلی نوازش کے بعد یہ مزید مہربانی قند مکرر کا لطف رکھتی تھی مگر افسوس ہے کہ بعض مجبوریون نے کتاب کو زینت تصویر سے محروم رکھا۔

ابھی حال کے سفر بمبئی میں پروفیسر صاحب سے پہلے پہل نیاز حاصل ہوا۔ موصوف نہایت خلیق، متواضع، شاعرانہ مسلک کے شیفتہ و دلدادہ، سخن سنج و سخن گستر اور بے پناہ طلاقتِ لسانی و وسعت بیانی کے اوصاف سے متصف ہیں۔ مدتِ دراز سے اپنے زمرۂ احباب میں صرف مولوی محمد الیاس برنی ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن کو غیر معمولی وسیع البیانی کی قابلِ رشک دولت کا تنہا مالک سمجھتا تھا لیکن کسی نباضِ فطرت کے اس شعر کے بموجب :-

ہیچ یار مدہ خاطر و ہیچ دیار   کہ بر و بحر فراخ است و آدمی بسیار

پروفیسر صاحب کی ہمنشینی نے مجھکو اپنی پہلی رائے کی ترمیم پر ایسا مجبور کر دیا کہ برنی صاحب کا مایہ نازش سرمایہ مساوی طور پر اپنے خیال میں انھیں تقسیم کر دینا پڑا۔

اللہ کرے زور بیاں اور زیادہ

بہر طور اس مرتبہ کے سفر بمبئی میں پروفیسر صاحب کی دلچسپ ملاقات سے میں بہت مسرور اور نہایت محظوظ ہوا۔

سید محمد حسن بلگرامی

ریٹائرڈ اکاونٹینٹ جنرل دولت آصفیہ

طاہر ولا، خیریت آباد

حیدرآباد دکن

۱۱ر جولائی ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

کارنامۂ پہلوی

ابواب	مضامین	صفحات
۱	۲	۳
باب پہلا	جہاز کا سفر	۱ تا ۴
دوسرا باب	سیر بوشہر	۵ تا ۸
تیسرا باب	سیر شیراز	۹ تا ۳۳
چوتھا باب	سیر اصفہان	۳۴ تا ۴۲
پانچواں باب	سیر طہران	۴۳ تا ۴۸
چھٹا باب	تاریخِ ایران پر ایک سرسری نظر	۴۹ تا ۵۵
ساتواں باب	شاہانِ قاچار اور تحریکِ انقلاب کی ابتدا	۵۶ تا ۶۸
آٹھواں باب	ناصر الدین شاہ اور بابیوں کا خروج	۶۹ تا ۷۵
نواں باب	ایران میں سید جمال الدین کی آمد اور تحریکِ انقلاب کا فروغ	۷۶ تا ۸۵
دسواں اور گیارھواں باب	با قاعدہ تحریک انقلاب کی ابتدا .. .. سنہ ۱۹۰۱ء	۸۶ تا ۹۰
بارھواں باب	دستوری حکومت کا قیام (سنہ ۱۹۰۶ء)	۹۱ تا ۹۴
تیرھواں باب	اس زمانے کے اہل قلم کی تحریروں کے نمونے	۹۵ تا ۱۰۸
چودھواں باب	جدید معاشرت کے متعلق مزید واقعات کا ظہور	۱۰۹ تا ۱۲۱
پندرھواں باب	دور رضا شاہ پہلوی	۱۲۲ تا ۱۲۹
سولھواں باب	رضا شاہ کی آمریت	۱۳۰ تا ۱۴۰

ابواب	مضامین	صفحات
۱	۲	۳
سترھواں باب	اعلیٰ حضرت رضا شاہ پہلوی کے اصلاحات .. ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۵ء تک	۱۴۱ تا ۱۵۷
اٹھارھواں باب	ایران کے ملاؤں پر بیرونی اثرات	۱۵۸ تا ۱۷۳
انیسواں باب	ملاؤں کے اقتدار کا خاتمہ	۱۷۴ تا ۱۸۷
بیسواں باب	ایرانِ جدید میں طبقۂ اناث کا درجہ	۱۸۸ تا ۲۳۱
اکیسواں باب	نقاب متروک	۲۳۲ تا ۲۴۰
بائیسواں باب	ایران میں تعلیم جدید کا دور	۲۴۱ تا ۲۶۲
تیئیسواں باب	طریقۂ تعلیم	۲۶۳ تا ۲۸۱
چوبیسواں باب	زراعت	۲۸۲ تا ۲۸۷
پچیسواں باب	محکمۂ حفظانِ صحت عامہ	۲۸۸ تا ۲۸۹
چھبیسواں باب	محکمۂ تعمیرات عامہ	۲۹۰ تا ۲۹۲
ستائیسواں باب	محکمۂ رجسٹری	۲۹۳ تا ۲۹۵
اٹھائیسواں باب	محکمۂ امور مذہبی	۲۹۶ تا ۳۰۱
انتیسواں باب	محکمۂ حربیہ	۳۰۲ تا ۳۰۳
تیسواں باب	محکمہ جات صنعت وحرفت وتجارت	۳۰۴ تا ۳۰۷
اکتیسواں باب	صنعتِ قالین بافی	۳۰۸ تا ۳۱۱
بتیسواں باب	ریلوے اور معدنیات	۳۱۲ تا ۳۱۷
تینتیسواں باب	محکمۂ مالیات	۳۱۸ تا ۳۲۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا باب

جہاز کا سفر

دوسری مئی کو میں جہاز وارسوا میں بمبئی سے روا

ایرانی مسلمان ہم سفر ملے، جو حصولِ سعادت کے لئے کربلا۔

ان میں اکثر کو میں جانتا تھا اور جن سے ملاقات نہ تھی احباب نے اُن سے تعارف کرایا
ان سے مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی اور جب ایران کی موجودہ حیرت انگیز ترقیوں کا ذکر چھڑا
تو سب کو غیر معمولی طور پر رطب اللسان پایا۔

اِن میں سے ایک صاحب نے کہا کہ چند سال قبل جب ایران کا ذکر آتا تھا تو ہم شرم سے
سر نہ اُٹھا سکتے تھے اِس لئے کہ بلحاظ معاشرت تمدن ترقی یافتہ اقوام کے سامنے ہم پست تر

حالت میں تھے، لیکن آج ہمیں سربلندی برتری کا پورا حق حاصل ہے اسلئے کہ ہم نے دُنیا کو دکھا دیا کہ شوکت کیخسروی صولت کیقبادی کی یادگار صرف ہمیں ہیں، ہم پھر ترقی کے میدان میں بڑھ رہے ہیں ہم نے اپنے ملک میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اعلیحضرت رضا شاہ پہلوی کے عہد معدلت مہد میں جسے بارہ برس ہوے جو ترقی ایران میں ہوئی وہ ہماری حالت کا اندازہ کرتے ہوے دوسری اقوام کو غالبًا سو دو سو برس میں نصیب ہوتی۔

جہاز کے ڈاکٹر صاحب جو اُردو اچھی طرح سمجھتے تھے ہماری باتیں دلچسپی کے ساتھ سنتے رہے جب ایرانیوں کا یہ پُرجوش رجز ختم ہوا تو وہ مجھ کو اپنے کمرے میں لیگئے اور کہنے لگے کہ ان لوگوں کے موجودہ جوش تفاخر کو ملاحظہ فرمائیے۔ آج ایرانی وہ نہیں ہیں جو کل تک تھے ان میں ایک غیرمعمولی بیداری پیدا ہوگئی ہے اپنے آپکو اب یہ بہت کچھ سمجھنے لگے ہیں۔

ابھی حال میں ہم کو بوشہر میں ان ہی ایرانیوں کے ہاتھوں بڑی زحمت اٹھانا پڑی ایک ایرانی قلی نے ہمارے جہاز کے ایک افسر کے ساتھ بہت گستاخی کی جس پر غصے میں اسنے قلی کے تھپڑ مارا، اس واقعہ میں کوئی اہمیت نہ تھی اسلئے کہ وہ اسی کا مستحق تھا، لیکن یہ دیکھ کر ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ یکایک ذراسی بات کا بتنگڑ بن گیا۔ قلی نے ایران کی پولیس میں اس کی شکایت کی اور ایک پولیس افسر کو اپنے ساتھ لے آیا، جس نے اسپر اصرار کیا کہ ملزم اسکے حوالے کردیا جاے، ہم نے اسکے دینے سے انکار کیا لیکن وہ برابر اپنی بات پر اڑا رہا، یہاں تک کہ وہ اپنے افسر بالادست کو بھی بلا لایا جس نے ملزم کو بجبر لیجانے کی دھمکی دی اور کہا کہ جب تک تم ملزم کو ہمارے حوالے نہ کردو گے ہم تمھیں روانہ ہونے نہ دینگے

اسی جرم کے چھ گھنٹے سے زیادہ مدت تک وہاں سے جہاز نہ نکلا۔

آخر کار ہم نے کہہ سن کے اس قضیئے کو اس طرح رفع دفع کیا کہ ملزم کو قلی کا معاوضہ ادا کرنے اور اس سے معافی مانگنے پر مجبور کیا، اس نے کہا کہ دیکھو! ایرانیوں کے ساتھ خوش معاملگی سے پیش آنا۔ کبھی ان کو شکایت کا موقع نہ دینا وہ اپنے موجودہ خود دارانہ مدارج کے معاملہ میں بڑے ذکی الحس ہو گئے ہیں۔ ایرانیوں کے لغات سے لفظ " قلی" ناپید ہو گیا ہے، اب قلیوں کو " حمّال" کہا جاتا ہے جو مقدم الذکر کے مقابلے میں ایک باوقعت اصطلاح ہے۔

دوسرے دن جہاز پر ایک اور صاحب سے ملاقات ہوئی جو مشہد کے رہنے والے اور پابندِ صوم وصلوٰۃ معلوم ہوتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا ملک ایران کے موجودہ میلان مغربیت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہندوستان کی واپسی کے وقت از راہِ کرم آپ مشہد ضرور تشریف لائیں اور مجھے اپنی مہمانی کا شرف عنایت کریں اس وقت آپ خود ملاحظہ فرمائیں گے کہ کس طرح ایک قدیم مشرقی نمونے کا شہر جس میں تنگ اور غلیظ گلیاں تھیں اور آئینِ حفظانِ صحت کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا پھر نہ جان ومال کی حفاظت تھی اور نہ کوئی مستقل حکومت پورا شہر ہوس پیشہ ملّاؤں کی جولانگاہِ حرص وآز بنا ہوا تھا جن کی تلقین اس سے آگے نہ تھی کہ جنت یا دوزخ کا داخلہ داڑھی بڑھانے یا منڈانے پر منحصر ہے جہاں کے نصف سے زیادہ باشندے اس کے سوا اور کوئی ذریعہ معاش نہ رکھتے تھے کہ زائرین روضۂ جناب امام رضا علیہ السلام سے بھیک مانگ مانگ کر

میٹ پالیس ۔ آج وہی شہر مشہد اعلیٰحضرت رضا شاہ پہلوی کے عہد حکومت میں ایک ایسا بارونق شہر بن گیا ہے جہاں بنی نوع انسان کے آرام و آسائش کیلئے ہر قسم کا سامان اور ہر طرح کے جدید ذرائع مہیا ہیں۔ اب ہم ایک منظم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ خوف و خطر سے آزاد ہونے کی وجہ سے ہم اپنی دولت زمین میں دفن کرنے کی بجائے اب بنکوں میں جمع کرتے ہیں جہاں وہ صرف محفوظ نہیں بلکہ اس میں برابر ترقی ہوتی رہتی ہے، آپ جہاں چاہیں بے کھٹکے سونا اچھالتے ہوئے جا سکتے ہیں کوئی نظر بھر کر بھی نہ دیکھے گا اور کسی جگہ بھی " نے غمِ دزد و نے غم کالا " کا پُر امن منظر آپ کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو سکتا ۔

دوسرا باب

سیرِ بوشہر

مئی کی ساتویں تھی جو ۴ بجے میں جہاز سے بوشہر اُترا۔ گمرک خانہ (چنگی) کے لوگ غیر متوقع خلق کے ساتھ پیش آئے۔ میرے سوٹ کیس میں چند نئے کپڑے تھے لیکن کسی نے ان چیزوں کا کچھ خیال نہیں کیا۔

ایک صاحب حاجی محمد مہدی دلال اصفہانی جو بمبئی سے میرے ہم سفر تھے بوشہر میں اُترے اور انھوں نے معذرت کی کہ میں یہاں آپ کو اپنا مہمان نہیں بنا سکتا اسلئے کہ میں خود ایک دوسرے صاحب کے یہاں مہمان ہوں لیکن انھوں نے مجھے آرمینین ہوٹل میں ٹھہرنے کا مشورہ دیا جس کا مالک اتفاق سے وہیں گمرک خانہ میں موجود تھا۔

حاجی صاحب نے شیراز میں اپنی قیام گاہ کا پتہ دیا اور یہ فرما کر رخصت ہوئے کہ جب میں شیراز پہونچوں تو ضرور ان سے ملوں۔ مالک آرمینین ہوٹل مجھے ساتھ لیکر ہوٹل روانہ ہوا۔ جب میں ہوٹل پہونچا تو زوجۂ مالک میرے لئے خوشگوار شربت کا ایک گلاس لائیں اور میرے قیام کے واسطے ایک آرام دہ کمرہ مختص کر دیا جہاں ایرانی خوشنما قالین بچھے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ کمرے میں

ایک کرسی رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ ایک ٹی ٹیبل اور ایک صاف آرام دہ پلنگ بچھا تھا۔ اس کمرے کا روزانہ کرایہ خورد نوش ملا کر صرف ۲۵ قران تھا جو یہاں کے سکہ میں تقریباً تین روپیہ کے برابر ہوتا ہے۔ ہندوستان میں بہت کم ایسے ہوٹل ہیں جہاں اس قدر کم کرایہ پر ایسا آرام و آسائش کا مقام ملسکتا ہو۔ مالک ہوٹل ہر دوسرے گھنٹے مجھ سے دریافت کرنے آتے تھے کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔

دوسرے دن علی الصباح میں ٹہلنے چلا گیا۔ مجھے ایک پرانے بوشہری دوست یاد آئے جو کبھی بمبئی میں مقیم تھے میں نے انکا پتہ لگانا شروع کیا کہ شاید وہ ملجائیں۔ راہگیر اور پولیس کا برتاؤ بہت قابل تعریف معلوم ہوا اسلئے کہ جس تحمل کے ساتھ انھوں نے میرے استفسار کو سنا وہ قابل ستائش تھا، انھوں نے تلاش مکان میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش کی اور آخر کار مجھے میرے دوست کے گھر پہونچا دیا۔ مسٹر عبدالکریم نے میری بہت آؤ بھگت کی۔ اپنے والد اور دوسرے انگریزی داں احباب سے تعارف کرایا۔ جس سے میرے چند روزہ قیام بوشہر میں بہت دلچسپی پیدا ہوگئی۔ جن اصحاب کی ہمدردانہ رہبری سے میں عبدالکریم صاحب کے مکان پر پہونچا ان کا نہج گفتگو، ان کی خوش خلقی، طرز ملاقات اور تہذیب شایستگی نے مجھے اپنا گردیدہ بنا لیا، شرفائے ایران میں یہ الفاظ جیسے کہ "مرحمت زیاد" "لطف شما پایندہ" "سایۂ شما کم نشود" اظہار تشکر کیلئے روزمرہ کی بول چال میں طبعاً داخل ہیں جس سے ان کے اخلاق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک ایرانی کو مشرقی فرانسیسی کہا جائے تو بالکل بجا ہے۔

ایک دوسری چیز جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں ایران جدید میں تحفظ جان و مال کے آئین کا نفاذ،

بوشہر میں گرمی کی شدت سے میں ہوٹل کے کمرے میں دروازے اور کھڑکیاں کھولکر سویا اور میرا سامان ادھر اُدھر یونہی پڑا رہا۔ شہر میں تفریح کیلئے نکلا تو میرا ٹرنک اور کمرے کا دروازہ دونوں ویسے ہی غیر مقفل رہے مجھ سے یہاں تک بیان کیا گیا کہ اگر کسی کی کوئی چیز سڑک پر بھی رہ جائے تو اُسکو بحفاظت مالک تک پہنچانا پولیس کا فرض ہے۔ گو یہ مبالغہ معلوم ہوا لیکن اس میں شک نہیں کہ تحفظ جان و مال کے معاملہ میں بڑی ترقی ہوئی ہے۔

صفائی و پاکیزگی اور روشنی کے بہترین انتظام سے ایران کے اور شہروں پر بوشہر فوقیت رکھتا ہے۔ مکانات عموماً اینٹ یا سنگ خام کے بنے ہوئے ہیں جن پر مٹی کا پلاسٹر کیا ہوا ہے البتہ چند جدید طرز کی خوشنما سرکاری عمارتیں شہر کی رونق کو دوبالا کر رہی ہیں ایرانی مکانوں میں بظاہر صحن نہیں معلوم ہوتا لیکن مکان میں داخل ہونے پر اس ظاہری کمی کی پوری تلافی اس طرح دکھائی دیتی ہے کہ وسط مکان میں جسے "حیات" کہتے ہیں ایسا کشادہ صحن ہوتا ہے جس میں نظر فروز چمن بندی کی جاتی ہے۔

شہر میں آب نوشی کیلئے آب رسانی کا انتظام ناقص ہے ہر شخص کے گھر میں بارش کا پانی جمع کرنے کیلئے ایک صاف حوض ہوتا ہے جس کو "آب انبار" کہتے ہیں اگرچہ صفائی کے محکمۂ حفظان صحت کی طرف سے ڈاکٹر مقرر ہیں جو ہفتہ میں ایک دفعہ ان آب انباروں کا معائنہ کرتے ہیں کہ وہ صاف ہیں اور کثیف تو نہیں ہو گئے ہیں لیکن اسپر بھی ایک بہتر انتظام آبرسانی درکار ہے۔ مجھے اس خبر سے خوشی ہوئی کہ انتظام آب رسانی کا ایک جدید اسکیم زیر غور ہے۔ بلحاظ اس حیرت انگیز ترقی کے جو ملک ایران میں ہو رہا ہے یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں

کہ یہ اسکیم جلد عملی صورت اختیار کرلیگا۔ یہ اسکیم اس وسیع اسکیم کا ایک جزو ہے جسکے تحت ملک ایران کے تمام بڑے بڑے شہروں میں پانی کے نل پہونچ جائینگے۔ گورنمنٹ ایران اس مسئلہ پر خاص طور سے توجہ کررہی ہے۔

گو بوشہر ایک غیر معمولی جدید شہر نہیں معلوم ہوتا تاہم اس میں کچھ جدید خصوصیات ضرور نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک قدیم مدرسہ موسوم بہ "دبستان سادات" کے علاوہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کیلئے جدید مدرسے کھولدئے گئے ہیں جن میں بحدّ گنجایش طلباء موجود ہیں۔ اسکے علاوہ ایک بہترین شفاخانہ ہے جو اپنے ماہر فن ڈاکٹروں مکمّل آلات جرّاحی اور عمدہ ادویہ سے بیرونی اور اندرونی مریضوں کے مفت علاج کیلئے چشم مشتاق کی طرح کھلا رہتا ہے۔ اس شفاخانہ میں ۲۷ پلنگ ہیں اور بیرونی مریضوں کا روزانہ مرجوعہ تقریباً ۲۳۰ ہے۔ ڈاکٹر سب کے سب ایرانی حب الوطنی کے جوش کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔

تیسرا باب

شیراز

۱۰ مئی کو بوشہر سے شیراز روانہ ہوا۔ بوشہر سے شیراز کو جو سڑک گئی ہے وہ عہد پہلوی کے پہلے ایک ناہموار و دشوار گزار صحرائی راستہ تھا جہاں کہیں کہیں کے سوا اکثر مقامات تک گاڑی بھی نہیں جا سکتی تھی مگر اب وہی بیہڑ راستہ ایک عمدہ سڑک بن گیا ہے جس پر موٹریں چلتی ہیں۔ سڑکوں کی تعمیر کا کام جس کو پہلے کوئی جانتا بھی نہ تھا اب عہد پہلوی کی نمایاں خصوصیات میں داخل ہے۔ محکمۂ تعمیرات عامہ جس کا پہلے کہیں پتا بھی نہ تھا وزیر طرق کے زیر نگرانی قائم کیا گیا ہے جس نے نہ صرف قدیم راستوں کی درستی کی ہے بلکہ سات ہزار میل طولانی نئی سڑکیں ایسی بنائی ہیں جن پر موٹریں چل سکتی ہیں۔

دارالسلطنت طہران اب قریب قریب ایران کے تمام مشہور شہروں سے ان سڑکوں کے ذریعہ ملا دیا گیا ہے اور ان سڑکوں کو اچھی حالت میں رکھنے کا خاص اہتمام ہے۔ ان میں دو بڑی مشہور سڑکیں ہیں جن میں سے ایک تو وہ ہے جو طہران سے کوہ البرز کو

عبور کرتی ہوئی بحر اخضر تک گئی ہے اور دوسری سلسلۂ لورستان کو طے کرتی ہوئی خلیج فارس تک۔ چونکہ جدب ایران پہاڑوں میں واقع ہوا ہے اکثر سڑکیں سیدھی نہیں ہیں بلکہ کج در کج نشیب و فراز کا وہشت انگیز منظر بنی ہوئی ہیں کہیں تو اتنی بلند کہ نیچے دیکھنے سے خوف معلوم ہو اور کہیں ایسی پست کہ تحت الثریٰ نظر آئے۔

یہ سڑکیں بعض ایسے دروں میں سے ہو کر گزری ہیں کہ جو دنیا کے بہت بڑے دروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ جو سڑک بوشہر سے شیراز کو جاتی ہے وہ بھی ایسے چار دروں میں ہو کر گزرتی ہے جو شوفروں کے لئے نہایت دشوار گزار خیال کئے جاسکتے ہیں جب کہ ہم کوتل پیر زن و کوتل دخت سے گزر رہے تھے جو نہایت بلند ہیں شوفر نے مجھ سے کہا کہ ذرا منھ نکالکر قدرتی منظر ملاحظہ فرمائیے۔ جب میں نے جھانکا تو میرے ہوش اُڑ گئے۔ ہزاروں فورڈ، ڈاج، اور شیورلٹ موٹر کاریں اِن کے علاوہ بسیں اور رن گاڑے ان پر دن رات چلتے رہتے ہیں۔ ایرانی شوفروں کے سوا جن کو بجا طور پر بے جگر کہا جاسکتا ہے کوئی دوسرا شوفر ان دروں پر گاڑی نہیں چلا سکتا۔

ایک بس میں چھتیس گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد جس کی تھکن نے چور چور کر دیا تھا ۱۲ مئی کو علی الصباح شیراز پہونچا میرے شوفر نے ہوٹل "کنی" تک میری رہبری کی جس کو میں نے حسب دلخواہ پایا۔

یہ پُر فضا مقام حافظ اور سعدی کا جنم بھوم اپنی قدیم مشرقی شان کا آئینہ ہے ان دونوں بزرگواروں کے کلام دنیا کی تمام متمدن زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں یہاں کے

چمن زار نہایت سبزہ و شاداب خوش رنگ و خوشبو دار پھولوں سے لدے ہوئے اور خوشنوا پرندوں کی نوا ریزیوں سے گونج رہے ہیں، بلبل ہزار داستان جو اپنی خوشنوائی سے حافظ و سعدی کو بیخود کرتے تھے اب بھی گلاب کی شاخوں پر چہچہاتے نظر آتے ہیں۔

نہر رکنا باد اب بھی ایک مشرقی شاعر کے سکوت و خاموشی کی طرح یہ شعر گنگناتی ہوئی اپنی دھن میں بہہ رہی ہے۔

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلّیٰ را

گلگشت مصلّیٰ اور کنار رکنا باد یہی وہ چیزیں ہیں جن پر رابندر ناتھ ٹیگور جیسے مشرقی شاعر کو حال آ سکتا ہے، جو چیز عموماً مجھ سے نو وارد کو یہاں عجیب و غریب نظر آئی وہ مشرقی شان و شوکت نہیں بلکہ پہلوی دور زرّیں کے وسیع اور زبردست اثرات کی ہر طرف رعنائی و ضیا گستری ہے۔

ایران کے اور مشہور شہروں کی طرح شیراز بھی بتدریج نئی رونق حاصل کر رہا ہے۔ پرانے شہر کے اطراف میں نیا شیراز زیر تعمیر ہے جس میں بمبئی کی کوئنس روڈ سے بھی زیادہ وسیع خیابان نکالے گئے ہیں، جنکے دونوں جانب سایہ دار درختوں کی قطاریں اور چھوٹی چھوٹی نہریں بہتی ہیں۔ اِسکے علاوہ دونوں طرف پیدل چلنے والوں کیلئے فٹ پاتھ بنے ہیں۔ خیابان کے دونوں جانب ایک منزل کی خوشنما نئی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں وہ یا تو سرکاری عمارتیں ہیں یا خانگی جو دکانداروں کو کرایہ پر دی گئی ہیں جنہیں خوش سلیقگی کے ساتھ یورپین طرز پر سامان تجارت سجا ہوا ہے۔ جدھر دیکھئے نئی شاپیں۔ نئے دفاتر۔ نئے ہوٹل۔ اصلاح خانے قہوہ خانے اور رسٹوران کھل رہے ہیں۔ سارا کاروبار پرانے کثیف شہر سے نئے شہر میں

منتقل ہو چکا ہے۔

سڑکوں پر صبح و شام جھاڑو دی جاتی ہے اور موسم گرما میں چھڑکاؤ ہوتا ہے تاکہ ٹھنڈی رہیں۔ قدیم شہر میں ہی پتلی پتلی گلیاں ہیں جن کا عرض ۸ فٹ سے زیادہ نہیں، یہی حالت دربند یا کوچوں کی ہے جن کی چوڑان چار پانچ فٹ اور اب بھی ان میں مٹی کے پلاسٹر کی موٹی بدنما دیواریں دکھائی دیتی ہیں، لیکن کہیں کہیں قدیم شاندار عمارتیں بھی ہیں جنکے عالیشان گنبدوں اور خوشنما محرابوں سے گزشتہ شان و شوکت کا پتہ چلتا ہے۔

اِس قسم کی ایک بہت ہی شاندار عمارت شاہ چراغ کی زیارت گاہ ہے جس میں ایک امام زادے کا مزار ہے برسوں کی جمع شدہ حکایتیں ایک تھکے ہوئے نووارد کے سامنے ایک پاک و مقدس آرامگاہ پیش کرتی ہیں۔ اِس عمارت کے بلند گنبد و مینار اور وسیع صحن اگلی مشرقی شان و شکوہ کی یادگار ہیں۔ حقیقۃً یہ عمارت بلحاظ حُسن تعمیر ایران کے فن تعمیر کا بہترین اور بینظیر نمونہ ہے۔ گنبد کے بیرونی جانب تمام سونے کے پتّر جڑے ہوئے ہیں اور اندر بہترین آئینہ بندی کے نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔

سعدی اور حافظ کے دو مشہور مقبرے جو سعدیہ اور حافظیہ کے نام سے موسوم ہیں ان پر وہی سادگی برتی ہے جو اِن دونوں مدفون صوفیوں میں تھی، لیکن اِنکے اطراف میں بہت اچھے باغات ہیں جو وہاں جانے والوں کے لئے جنت نگاہ کا کام دیتے ہیں۔ اِسکے علاوہ وہیں متعدد حجرے بھی ہیں جن میں لوگ پکنک کیلئے جاتے ہیں تاکہ ہم خرما و ہم ثواب ہونے کا لطف حاصل کریں۔

جو چیز مجھے نئی معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ سعدی کے مقبرے میں ایسے زائرین کیلئے چند کرسیاں بھی تھیں جو اپنے کوٹ، پتلون اور بوٹ کی وجہ سے آرام سے فرش پر نہیں بیٹھ سکتے غالباً ہندوستان میں اس طرح کی جدت کفر سے تعبیر کیجائیگی۔ اگر کوئی نئی روشنی کے مسلمان صاحب بوٹ پہنے ہوئے برہنہ سر کسی مقبرے میں قدم رکھیں تو ان کی خیر نہیں۔ متعصب مسلمان اس کو مار ڈالے بغیر نہیں چھوڑینگے اور جب پاداش جرم میں پھانسی پر لٹکائے جائینگے تو عوام کے خیال میں شہدا کا سا مرتبہ بلند پائینگے۔

دنیا بھر کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اعلیحضرت رضا شاہ پہلوی کا منت پذیر ہونا چاہیئے جن کے عزم راسخ اور صابت رائے کی بدولت دیرینہ اختلافات مذہبی و قومی کے خاتمے سے تعصب نے شکست فاش پائی۔ رائے عامہ جدید تمدن کی مؤید ہے۔ لڑاکو ملا بھیڑوں کی طرح ایسے رام ہو گئے کہ ان میں سے کچھ تو " زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" کا وظیفہ پڑھنے لگے اور بعض جو بہت ضدی تھے یہ دیکھکر کہ اب ان کا کوئی اثر باقی نہیں رہا مذہبی سرگرمیوں سے دست کش ہو گئے ہیں۔ ان کی ذاتی رائے جو کچھ بھی ہو لیکن زمانے کے رجحان کے خلاف نہ بان نہیں ہلا سکتے۔

نئے شیراز میں آتے ہی دنیا بالکل ہی نئی نظر آتی ہے۔ کلاہ یا سموری ٹوپیوں کی جگہ ہیٹ نے لے لی ہے۔ فراک کوٹوں نے لمبے لمبے ڈھیلے ڈھالے جبوں اور کمر چینوں کو متروک کر دیا ہے۔ لمبی لمبی ڈاڑھیاں جو فتح علی شاہ قاچار کے وقت سے فیشن میں داخل ہو گئی تھیں خس و خاشاک کی طرح اب صاف ہو گئیں۔ آزادی خیال و آزادی عمل کا سیلاب

امنڈتا چلا آتا ہے یہاں تک کہ مونچھوں میں بھی طرح طرح کی ترمیم کی جارہی ہے بعض کی کم بعض کی بہت کم اور کہیں بالکل ہی ندارد۔ کہیں کہیں ڈاڑھی نظر آتی بھی ہے تو وہ صرف قدیم وضع کے ملاؤں کی ٹھوڑی پر۔ مستورات میں گھیردار پوشاک کی جگہ یورپین اسکرٹ نے لے لی ہے اور سر پر چادر پیچے کے بجائے ہیٹ کا رواج ہوگیا ہے۔ مرد اور عورتیں بلا تکلف موٹروں یا کھلی ہوئی گاڑیوں میں سوار یا پیدل چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔

پشاور کے خان بہادر عبدالاحد افغان نے جو شیراز میں دولت برطانیہ کی طرف سے پرو کانسل ہیں مجھ سے بیان کیا کہ دس برس پہلے اگر آپ نے شیراز کو دیکھا ہوتا تو اسکا اندازہ کرسکتے کہ ایران کی حالت اس وقت کیا تھی اور اب کیا ہے، ایک ایرانی صاحب نے فرمایا خراب و خستہ ایران دم توڑ رہا تھا اسے ایک نجات دہندہ کی ضرورت تھی جسے قدرت نے رضا شاہ پہلوی کے بھیس میں بھیجدیا۔

ملک کو ایک پُرقوت دادگر، ایک پُرجگر نبرد آزما، ایک قابل مقنّن، ایک اعلیٰ مُدبّر، ایک بزرگ مجتہد، ایک عظیم المرتبت مصلح، اور ایک بہی خواہ خلق کی ضرورت تھی۔ تائیدِ باری نے خدمتِ ملک کے لئے ایک ایسا ہی پیکرِ محاسن عنایت کیا جس میں یہ تمام اوصاف و صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں اور جس کا نصب العین اپنے ملک کی رفاہ و فلاح کے سوا اور کچھ نہیں۔

ایک دن میں اپنے ہوٹل میں ایک ایرانی صاحب سے یہاں کے دلچسپ مقامات دیکھنے کیلئے کہہ ہی رہا تھا کہ اتنے میں حاجی محمد مہدی دلال اصفہانی کے یہاں سے لنچ کی دعوت کا

ٹیلیفون آیا غنیمت ہے کہ یہ خوش مذاق مہربان مجھے بھولے نہیں۔ میں ان کے یہاں گیا وہ مجھے اپنی گاڑی میں اپنے اس باغ میں لے گئے جہاں لنچ کا انتظام تھا اور میری آمد کی تقریب میں انھوں نے اپنے اور احباب کو بھی مدعو کیا تھا وہ ایک نہایت دلچسپ صحبت تھی۔ باغ میں ہم نے لنچ کھایا۔ لنچ کے اختتام پر ہر ایک مہمان بڑے فخر سے اپنے ملک کے متعلق گفتگو کرنے لگا۔

وہاں سب کے سب سن رسیدہ لوگ تھے ہر ایک اپنے ذاتی تجربہ کے لحاظ سے ایران قدیم کے متعلق افسوسناک تذکرہ کر رہا تھا حاجی محمدؐ نے کہا "آغا! بارہ برس پہلے ہم اپنے اس باغ میں شام کو آ بھی نہیں سکتے تھے اور یہاں قالینوں کا رکھنا تو ممکن ہی نہ تھا کوئی چیز بھی محفوظ نہ تھی انتہا یہ کہ ہم اپنے باغ کا میوہ تک نہیں کھا سکتے تھے۔ بھلے دن آنے کی ہم دعائیں مانگتے تھے خدا خدا کر کے ہمارے دن پھرے اور آج وہ منھ مانگی مراد ہمیں مل گئی۔

ایک دوسرے صاحب بولے "آغا یہاں روشنی اور سڑکوں کا تو کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ یہاں تک کہ تنگ گلیوں میں کبھی جاروب کشی بھی نہ ہوتی تھی۔ ایک محکمۂ صفائی ضرور تھا لیکن محض برائے نام اس پر کسی قسم کی نگرانی نہ تھی۔ محکمۂ صفائی کا صدر شہر کا گورنر ہوتا تھا اور چونکہ وقتاً فوقتاً اس کا ایک شہر سے دوسرے شہر میں تبادلہ ہوتا رہتا تھا اس وجہ سے وہ اپنے فرائض میں کوئی دلچسپی نہ لیتا تھا۔ محکمۂ صفائی کے اراکین سب کے سب موروثی متمول افراد تاج و تخت کے بڑے حامی و مؤید ہوا کرتے تھے۔ یہ سب کے سب لائف ممبر ہوتے تھے اور ان کی خدمت وراثتاً ان کی اولاد پر منتقل ہوتی تھی۔ وہ اپنے گھروں میں عدالت قائم کر کے

فصل خصومات کا کام انجام دیتے اور مجرمین کو جرمانہ اور قید بامشقت کی سزائیں دیا کرتے تھے۔ بادشاہ کو تو ہم لوگ جانتے تک نہ تھے۔ لیکن اب تو صورت حال بالکل مختلف ہے ملک کے گوشہ گوشہ میں قانون اور تنظیم کارفرما ہے۔ ہر شہری امیر ہو یا غریب، جوان ہو یا بوڑھا، عورت ہو یا مرد اپنے محبوب بادشاہ سے بخوبی واقف ہے۔ ان کی تصویر جگہ جگہ آویزاں دیکھی جاتی ہے اور ان کی اولوالعزمیوں کا حال آئے دن اخباروں سے معلوم ہوتا رہتا ہے۔

ایسے قابل قدر جوش اور اعلےٰ خیالات کے اظہار سے مجھ کو توقع تھی کہ پارٹی میں مستورات بھی شریک ہونگی لیکن ان کی عدم موجودگی سے مجھ کو یوں ہی سی مایوسی ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ہم خوشی سے اپنی بیویوں کو بھی یہاں لاتے لیکن ابھی تک ان کے پرانے خیالات بالکل دور نہیں ہوئے ہیں خصوصاً سن رسیدہ عورتوں کے نزدیک تو باہر نکلنا گناہ ہے لیکن اکثر جوان عورتیں طرز جدید کی پوری پیرو ہیں۔ چھ بجے ہم نے چاے پی اور رخصت ہوے۔ میرے میزبان نے گاڑی میں بیٹھتے ہوے مجھے اپنے پہلو میں بٹھایا اور ہوٹل میں پہونچا دیا۔

دوسرے دن میں نے آغا علی ریاضی صاحب ناظم تعلیمات کو ٹیلیفون کیا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ میں کون ہوں انھوں نے سوا چار بجے مجھے اپنے مکان پر بلایا۔ موصوف نے اپنی بیوی اور لڑکی سے تعارف کرایا اور کہا کہ یہ لڑکی سکنڈری اسکول میں پڑھتی ہے اور میری دوسری لڑکی فرانس میں آثار قدیمہ کی تعلیم پا رہی ہے

پھر ایک ورلائق نوجوان خاتون سے تعارف کرایا، جن کا نام خانم حکمت تھا جو وزیر تعلیمات کی ہمشیر تھیں اور یہ کہا کہ یہ سکنڈری اسکول کی معلمہ اور مدارس نسواں کی انسپکٹر ہیں مسز علی ریاضی نے ہم کو چائے پلائی۔ اسکے ساتھ اور بہت سے مشرقی لوازمات تھے جیسے کہ کیک بسکٹ، خانہ ساز مٹھائیاں تازہ اور خشک میوے، مربے، شربت اور آئس کریم وغیرہ جنکے کھانے پینے میں دو گھنٹے لگے خانم حکمت جو غالباً اپنے اسکول کے معاملات کے متعلق آغا علی ریاضی صاحب سے ملنے آئی تھیں ان سے بات چیت میں مشغول ہوگئیں اور مسز آغا علی میری تواضع اور مہمان نوازی میں۔

مسز آغا علی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ اس کے علاوہ وہ فرنچ۔ ترکی اور ایرانی خوب جانتی ہیں اور دوسری جدید ایرانی خواتین کے مثل ممالک یورپ کی سیاحت کر چکی ہیں اور وہاں کے حالات سے واقفیت رکھتی ہیں وہ قوتِ لسانی میں بے مثل و بے نظیر ہیں۔ جب اس مسئلہ پر گفتگو چھڑی کہ اب ایران کی سوسائٹی میں عورت کا کیا درجہ ہے، تو کہنے لگیں کہ ایران میں اب عورتوں کو اپنے مدارج زندگی معلوم ہوگئے ہیں۔ وہ سب ان تغیّرات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اس پر بھی پچاس فی صدی ایسی ہیں جو باہر نکلنا پسند نہیں کرتیں اس وجہ سے نہیں کہ انھیں یہ تغیّرات پسند نہیں، بلکہ محض اس وجہ سے کہ سالہاسال سے پردے میں رہنے کی عادت انکی طبیعت ثانیہ ہوگئی ہے۔

اُنھوں نے کہا خود میری خوشدامن صاحبہ ایک مقدس قدامت پسند خاتون ہیں گو وہ خود سینما سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں مگر اپنی پوتیوں کو مشورہ دیتی رہتی ہیں کہ

وہ باہر نکلیں اور دنیا کو دیکھیں نہ کہ گھر میں پڑی سڑا کریں" مسز علی ریاضی نے پہلے پہل اونچی ایڑی کا جوتہ پہننا پسند نہیں کیا لیکن اب ان کو اس قسم کے جوتہ میں آرام ملتا ہے۔

مسز ریاضی نے یہ بات معلوم کرنے کی خواہش ظاہر کی کہ ہم ہندوستانی کیوں اب تک رفتار زمانہ کے پیچھے ہیں۔ اس معاملہ میں مسٹر گاندھی کیوں خموش ہیں؟ ان کے مشاغل آجکل کیا ہیں؟ وہ پوری طاقت کے ساتھ اصلاح معاشرت کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتے کیونکہ یہی تو سیاسی و تمدنی ترقی پر پہونچنے کا پہلا زینہ ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اپنی عورتوں کو کب تک جہالت کی تاریکی میں رکھینگے؟ وہ اس معاملہ میں اپنے ہندو بھائیوں کے قدم بقدم کیوں نہیں چلتے؟ ہندو اور مسلمان اپنے باہمی اختلافات کا تصفیہ کیوں نہیں کر لیتے۔ اگر صرف گاؤ کشی کا مسئلہ ہندوؤں کے ناگوار خاطر ہے تو مسلمان اس کو ترک کیوں نہیں کرتے۔ آپ کے ہندوستان میں بکریوں، بھیڑوں اور پرندوں کی بڑی بہتات آپ کی بسر اوقات کے لئے کافی ہوسکتی ہے۔ ہم اعلےٰ طبقے کے ایرانی کبھی گائے کا گوشت نہیں کھاتے۔ اگرچہ کوئی امر ہمارے لئے مانع نہیں ہے۔ اب رہا مسجدوں کے سامنے باجا بجانا جو مسلمانوں کی ناراضی کا باعث ہے یہ کوئی ایسی اہم چیز نہیں ہے کہ جس میں حکومت کو دخل دینے کی ضرورت ہو۔ اس مسئلہ کا حل اس طرح ہو سکتا ہے کہ آپس میں احساس ہمسائگی پیدا کر کے ایک دوسرے کا دل ہاتھ میں لینے کی کوشش کیجائے۔ اپنے حقوق کے لئے آپس میں ضد اور ہٹ کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔

کیا ہندوستان کے ان دونوں حصوں میں کوئی ایسا ہوشیار آدمی نہیں ہے جو ہمیشہ کیلئے اس جھگڑے کو چکا دے" ؟ میں نے جواب دیا کہ چونکہ سیاسی معاملات میرے دائرۂ عمل سے باہر ہیں اسلئے میں ان سوالوں کے جواب دینے سے قاصر ہوں، ہاں ہندوستان کے ماہرین سیاست یا ہمارے مہاتماؤں اور مولویوں سے (جو ایسے مسائل کے حل کرنے میں حَکَم مانے جاتے ہیں) ان سوالوں کا جواب طلب کیجئے۔

سات بجے قبل اسکے کہ میں اپنے میزبان سے رخصت ہوں میں نے ان سے استدعا کی کہ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ مجھے شیراز کے بعض مدارس کا معائنہ کرا سکیں۔ موصوف الصدر نے دوسرے دن ۹ بجے اپنے دفتر میں میری تکمیل آرزو کیلئے مجھے بلایا۔ میں نے اپنے میزبان اور ان کی اہلیہ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور خدا حافظ کہکر رخصت ہوا۔ موصوف نے نہایت شیریں ایرانی زبان میں اپنی مسرت کا اظہار کیا جس سے ہر طرح کی خوشی ٹپکتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری آمد سے بہت مسرور ہوئے ہیں۔

جب دوسرا دن ہوا تو میں نے یہ سمجھ کر کہ پابندی وقت کا لحاظ مشرقی ممالک میں اب بھی ایک قسم کا گناہ ہے بجائے وقت مقررہ ۹ بجے کے ۹½ بجے میں وہاں پہونچا لیکن میں یہ معلوم کر کے بہت شرمندہ ہوا کہ وقت مقررہ سے ہر لحظہ وہ میرے منتظر تھے میں نے معذرت کے ساتھ مسٹر ریاضی سے ملاقات کی۔ گو انھوں نے اسکا کچھ خیال نہیں کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ پابندی اوقات پر ہمارے یہاں زور دیا جاتا ہے

خود ان کی لڑکی ایک مرتبہ اس قصور پر کہ وہ دس منٹ دیر سے اسکول پہونچی تھی کلاس سے باہر کر دی گئی۔ انھوں نے اپنے ایک انسپکٹر سے فرمایا کہ مجھے لڑکوں اور لڑکیوں کے بعض اسکولوں کا معائنہ کرائیں۔

پہلا اسکول جو مجھ کو دکھلایا گیا وہ مدرسۂ شاپور ایک سکنڈری اسکول تھا یہ ایک بڑی عالیشان عمارت تھی جس کے وسط میں ایک ہال تنا وسیع تھا کہ اس میں دو ہزار آدمی بآسانی بیٹھ سکیں۔ اس ہال میں عموماً علمی پبلک جلسے منعقد ہوتے ہیں میں نے کلاسوں کا گشت لگایا اور یہ دیکھ کر مسرت آمیز تعجب ہوا کہ پہلے درجہ سے چھٹے درجہ تک سب طلبا ایک ہی طرح کا نہایت صاف ستھرا لباس پہنے ہیں۔ جب میں نے دریافت کیا کہ یہ سب لڑکے امرازادے ہیں تو جواب ملا کہ نہیں، ان میں تین چوتھائی تعداد غریب اور نادار بچوں کی ہے۔ تحت قواعد داخلہ کوئی لڑکا اسکول میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسکے والدین یونیفارم کے چار جوڑے مہیا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر نہ لیں۔ اگر والدین میں اتنی استطاعت نہ ہو تو یونیفارم اسکول کی طرف سے اس شرط پر دیے جاتے ہیں کہ والدین ان کو دھلوانے اور صاف رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔

سکنڈری اسکول میں پہلی تین جماعتوں کی فیس بارہ قران یعنی دو روپیہ مقرر ہے اور چوتھی جماعت سے چھٹی جماعت کیلئے پندرہ قران یعنی ڈھائی روپیہ ہے۔ نادار طلبا کی فیس اوقاف سے دی جاتی ہے جواب ناظم تعلیمات نے مُلّاؤں کے ہاتھ سے لیکر

اپنے اختیار میں لے لئے ہیں۔ موقوفہ جائدادوں کا انتظام ایران میں اب ایک اہم مسئلہ ہو گیا ہے جس کو عہدہ داران متعلقہ بڑی ہوشیاری سے انجام دے رہے ہیں۔ عہد پہلوی سے پہلے یہی ملّا عوام کے قلوب پر اپنا سکہ جمائے ہوئے تھے اور صرف یہی وہ لوگ تھے جن کے طرزِ عمل پر کوئی نکتہ چینی یا اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ جب کوئی دولتمند آدمی مرتا تو اس کے ورثا جائداد کا ایک حصہ مصرف خیر کے واسطے وقف کر دیتے تھے اور یہ وقف ان کے خاندان کے ملّا کے حوالے کر دیا جاتا تھا جو اس کا ٹرسٹی ہوتا تھا۔

اگر کوئی صاحب جائداد لاوارث فوت ہوتا تھا تو اس کی جائداد خود بخود خاندانی ملّا کے قبضہ میں چلی جاتی تھی۔ اس کا یہ فرض تھا کہ اس کی آمدنی اپنے قرب وجوار کے یتیموں پر صرف کرے۔ بعض دولت مند لوگ اپنی حیات ہی میں باغات اور مزروعہ آراضی ان ملاؤں کو اسلئے دے دیتے تھے کہ وہ مکتب قایم کریں کیونکہ عہد پہلوی سے پہلے صرف یہی مکتب درسگاہ ہوتے تھے۔ محکمۂ رجسٹری قایم ہوتے ہی معلوم ہو گیا کہ لاکھوں تومان کی غیر منقولہ موقوفہ جائدادیں ان ملاؤں کے تصرف میں ہیں۔ چنانچہ اس محکمہ کے قایم ہونے سے ملاؤں کا زور ٹوٹا جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ آگے آئے گا۔

اب ہر صوبہ کا ناظم تعلیمات ہر مقامی وقف کمیٹی کا غیر سرکاری صدر ہے جس کے اراکین حقیقی ٹرسٹی ہوتے ہیں اور ان میں چند مقامی معتبر لوگ بھی شامل

کر لئے جاتے ہیں جن کو کمیٹی کا صدر نامزد کرتا ہے۔ باقاعدہ حسابات رکھے جاتے ہیں اور آمدنی کا بڑا حصہ مستحق ہونہار طلباء کی تعلیم اور مفید کتابوں کی طباعت واشاعت میں صرف کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چند ہی سال میں تمام اوقاف ملاؤں کی دست برد سے نکلکر وزارت معارف کے تفویض ہو جائینگے۔

جب مجھے اعلےٰ جماعتوں میں لیگئے تو میں نے وہاں کے طلباء سے یہ سوال کیا کہ تکمیل تعلیم کے بعد آپ لوگ کیا کرینگے۔ بعض نے میرے سوال کا جواب دیا کہ ہم ڈاکٹر بنیں گے تاکہ مریضوں کا علاج کریں اور اپنے ہموطنوں کو یہ تعلیم دینگے کہ اصول حفظان صحت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیئے۔ دوسروں نے کہا کہ ہم انجنیر یا سپاہی یا مدبر ہونگے تاکہ اپنے حسب حیثیت مادر وطن کی خدمت کر سکیں، طلبا کی ایک بڑی تعداد نے یہ ظاہر کیا کہ وہ معلم بنیں گے تاکہ موجودہ بڑھتی ہوئی نسل میں ایک نئی روح پھونکیں۔ غرضکہ ان کے مختلف جوابوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ملک کی خدمت کرنے کیلئے بے چین ہیں۔ قدیم طریقۂ تعلیم کی اصلاح اس طرح کی گئی کہ طلبا کو اس بات کا احساس ہو کہ وہ کس خانوادۂ منزلت کے چشم و چراغ ہیں اور ان کا یہ فرض ہے کہ اپنے اسلاف کی عظمت رفتہ کا مرقع پھر دنیا کو دکھا دیں۔

ہر دوران تعلیم کے اختتام پر ہر ایک مدرسہ میں جشن منایا جاتا ہے اور اس موقع پر شاہنامے کے بعض مشہور حصے بطور ڈرامے کے دکھائے جاتے ہیں مجھ کو اس طرح کے ایک جشن میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ بڑے سورماؤں اور پر جگروں کے بینظیر کارنامے

جن کو فردوسی نے شاہنامے میں نظم کیا ہے۔ ایرانی باجوں کے ساتھ اس طرح گائے گئے کہ حاضرین کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسی عظیم المنزلت قوم کی یادگار ہیں جسے اب انقلاب زمانہ نے پست تر کر دیا ہے۔ اس طرح کا نہج تعلیم اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دوسرے دن میں نے زنانہ اسکول کا معائنہ کیا۔ اس دفعہ میں ٹھیک وقت پر پہونچا۔ انسپکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ بجائے اسکے کہ آپ ہمکو پابندی اوقات کا سبق دیتے ہم نے اُلٹا آپ کو سکھایا کہ کس طرح اوقات کی پابندی کرنا چاہیئے میں نے ان کے اس ارشاد کی قدر کی پھر ہم دبیرستان شاہ دخت کے معائنہ کیلئے گئے جو مس ایلا جررڈ کے زیر انتظام ہے۔ یہ باپ کی طرف سے یورپین اور ماں کی جانب سے ٹھیٹ ایرانی ہیں ان کی بول چال ایسی شستہ اور شیریں ہے کہ تمام اساتذہ انکو بلبل شیراز کہتے ہیں اور محکمۂ تعلیمات کو ان پر ناز ہے۔ ان کے ایک سال کی رخصت لینے کے قصد سے محکمۂ تعلیم اس سوچ میں پڑ گیا تھا کہ ان کی جانشینی کیلئے کسے منتخب کرے۔

جب میں مس جررڈ کے ساتھ جماعتوں میں گھوم رہا تھا تو میں نے انسپکٹر صاحب سے پوچھا کہ کلاس میں کیا لڑکیوں کو کھانے پینے کی اجازت ہے مس جررڈ نے جواب دیا کہ "ہرگز نہیں"۔ میں نے کہا "ایک لڑکی کو ابھی کچھ کھاتے ہوئے میں نے دیکھا" مس جررڈ کہنے لگیں "اگر ایسا ہے تو وہ لڑکی اپنے قصور کا اعتراف کریگی اور معافی مانگے گی" وہ مجھے اس کلاس میں لیگئیں اور دریافت کیا کہ "وہ کونسی لڑکی ہے جو درجہ میں ابھی کوئی چیز کھا رہی تھی" وہ لڑکی فوراً کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی "میں ہی چاکلٹ کھا رہی تھی

اور میں اس پر بہت نادم ہوں" مس ایلا نے کہا "تمہاری صاف گوئی میرے لئے قابل فخر ہے، اب میں اپنے مہمان سے پورے بھروسہ اور تیقن کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ میری شاگرد لڑکیاں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔"

تھوڑی دیر تک گانا سننے کے بعد مجھے باورچیخانہ لے گئے جہاں لڑکیوں کو کھانا پکانے کی تعلیم دی جا رہی تھی۔ چند لڑکیاں تھوڑے سے کیک، بسکٹ اور مٹھائیاں لے آئیں جو انھوں نے اسی دن تیار کی تھیں۔ مٹھائیاں رنگ و روپ خوشبو اور ذائقہ کے لحاظ سے کسی طرح اُن مٹھائیوں سے کم نہ تھیں جو بمبئی کے مشہور و معروف منجیبنی برادرس کی دوکان میں تیار ہوتی ہیں۔

وقفہ کے گھنٹے میں جبکہ ہم چمن میں ٹہل رہے تھے میں نے دیکھا کہ چند نوجوان لڑکیاں اسکول کے احاطہ میں گھوم رہی ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مشرقی شادی کے اس طریقہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے کہ والدین بغیر لڑکے اور لڑکی سے دریافت کئے یا ان کو اس بات کا موقع دئے کہ وہ ایک دوسرے کو جان سکیں یا دیکھ سکیں شادی کر دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے جواب دیا کہ ہم ایسی شادی سے نفرت کرتے ہیں۔ ہم نئی روشنی کی پود ہیں پوچھنے پر اپنے والدین سے صاف کہدینگے کہ ایسے معاملہ میں جس پر ہماری آیندہ زندگی کا مدار ہے آپ کے حکم کی تعمیل سے ہم قاصر ہیں۔ اپنے شوہر کے انتخاب کا ہمیں پورا اختیار حاصل ہے پردے سے باہر آنے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا پھر فائدہ ہی کیا ہوا جو ہمیں اتنا بھی حق نہ ہو کہ ہم اپنا شریک زندگی منتخب کر سکیں۔

دوسرے دن مجھ کو دانش سرائے کا معائنہ کرایا گیا جہاں اساتذہ کو تعلیم دی جاتی ہے (یعنی نارمل سکول) اسکی عمارت مشرقی حسن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ جس کے گرد تقریباً بیس ایکڑ کے رقبے میں ایک فرحت بخش باغ ہے مجھے معلوم ہوا کہ یہ مکان کبھی ایک قبیلے کے سردار کی ملک ہونے کی وجہ سے چوروں کی کمین گاہ بنا ہوا تھا سردار قبیلہ کو یہاں سے طہران منتقل کر کے اسکی چھینی ہوئی جائداد شیراز کا معقول معاوضہ حکومت کی طرف سے اُسے دیدیا گیا۔ اس طرح اپنے جرائم پیشہ ساتھیوں سے الگ ہو کر اب وہ پُرامن زندگی بسر کر رہا ہے۔ اسکے جاتے ہی اسکے ساتھی بھی ایک ایسے جہاز کے مثل جسکا سکان نہ ہو گر بہ مسکین بن گئے ہیں کیونکہ ان پر ہر وقت پولیس کی سخت نگرانی رہتی ہے۔ یہاں پر اسطرح وہ تمام قبیلے جو ایک زمانہ میں قافلوں کو لوٹتے رہتے اور جنکے دھاوے قرب وجوار کے شہروں میں تہلکہ ڈالدیتے تھے۔ ایسے قبیلوں کے مفسد و بدسرشت افراد کو چن چن کر نکال باہر کردیا گیا ہے اور پرامن زندگی بسر کرنے کیلئے نوآبادیات میں بسا دئیے گئے ہیں۔ کاشت کے واسطے انھیں زمینیں دی گئی ہیں تخم و آلات کشاورزی کی فراہمی کے ساتھ آب رسانی کی سہولتیں پیدا کردی گئی ہیں اور تعمیر اکمنہ کیلئے روپیہ بھی دیا گیا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایران کا پہلا بادشاہ جس نے زراعت میں دلچسپی لی اور مزارعین کو تخم و آلات کشاورزی وغیرہ خریدنے کیلئے تقاوی دی وہ نوشیروان عادل تھا اور دوسرا بادشاہ جس نے زراعت کو ترقی دینے کی ضرورت کو محسوس کیا وہ رضا شاہ

پہلوی ہیں۔

اِن قبائل کے وہ لوگ جن کی ہیبت ناک صورتیں ابھی تک ڈراؤنی بنی ہوئی ہیں بسوں میں چپ چاپ سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی صورتوں پر جرائم کی پھٹکار برستی ہے۔ تاجدار ایران کا سب سے زیادہ حیرت خیز اور مہتم بالشان کارنامہ یہی ہے جو انھوں نے اصلاح ملک کے لئے انجام دیا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے سرک گیا تو اسے باور کیا جا سکتا ہے لیکن خصائل انسانی کی تبدیلی باور کرنے کے قابل نہیں۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے ایران کے نصفت شعار تاجدار نے لکھوکھا انسانوں کی خصلتوں کو بدل کے کچھ سے کچھ کر دیا۔ اس طرح کی سرعت تبدیلی خصائل معجزہ یا کرامت سے تعبیر نہ کی جائے تو پھر اسے کیا کہا جائے؟

اصفہان میں جس کا ذکر بعد میں آئے گا میں ایک انگلش کالج دیکھنے گیا جو مشنریز کے زیر نگرانی ہے وہاں ایک لوری لڑکا جو نہایت ذہین معلوم ہوتا تھا مجھ سے کہنے لگا کہ وہ تبریز کے ایک قبیلے کا فرد ہے جس کا پہلے اعتقاد یہ تھا کہ اگر کوئی شخص لڑائی میں زخمی ہوئے بغیر مر جائے تو اسکی لاش غیر مذبوح بکرے یا سگ مردہ کی مثل خیال کی جاتی تھی لیکن اب صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔

میرے والد نے جو اس قبیلہ کے مجتہد ہیں مجھے تبریز سے اس دور و دراز مقام پر انگریزی پڑھنے کیلئے بھیجا ہے میں اس سکول کے دارالاقامہ میں دوسرے عیسائی لڑکوں کے ساتھ رہتا ہوں حالانکہ پہلے کسی عیسائی کی صورت دیکھنا بھی شگون بد سمجھا جاتا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے خاندان والے سیکڑوں برس کے عادات و اعتقادات اتنی جلد تبدیل کرکے مغربی تہذیب و معاشرت کے کیسے شیفتہ و دلدادہ بن گئے یہ سوٹ، بوٹ، کالر اور ہیٹ جو میں پہنے ہوں اُسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوکے کہتے ہیں کہ کیسا چُست و چالاک لڑکا ہے۔

اب پھر شیراز کا تذکرہ سنئے جب میں اس نارمل کالج میں داخل ہوا جو پہلے ایک نامی قزاق کا مسکن تھا۔ سب طلبا کھڑے ہوگئے اور میری آمد کی تقریب میں ہر ایک نے ایک ایک نظم سنائی جو فی البدیہہ کہی گئی تھی۔ یکایک میں یہ محسوس کرنے لگا کہ جیسے میں کوئی بڑا آدمی ہوں۔ چند نظمیں سُنکر میں نے کہا کہ بس اب رہنے دیجئے مگر پرنسپل نے سب کی نظمیں سُننے کیلئے اصرار کیا اور کہا کہ " اس سے میرے دو مقصد ہیں :۔

ایک تو یہ کہ جوش مہماں نوازی کا مظاہرہ جو ہم ایرانیوں کا مایۂ ناز شعار ہے اسکی تکمیل ہو اور دوسرے میں آپ کو یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ میرا ہر ایک شاگرد کس آسانی اور خوبی کے ساتھ شعر کہہ سکتا ہے"۔ اس مہماں نوازی سے پوری طرح بہرہ اندوز ہوکر میں نے مختصر الفاظ میں اُنکا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوا اس وقت پرنسپل صاحب مجھے اپنے کمرے میں لیگئے اور چائے پلائی جو ایرانیوں کے یہاں ہر وقت تیار رہتی ہے۔ میں ان سے رخصت ہوکر اطمینان و مسرت کے ساتھ باہر آیا۔

مدارس کے معائنے سے مجھے دُہرا فائدہ ہوا ایک تو یہ کہ میں اس بات سے بہت خوش ہوا کہ میرے ہم مذہب مسلمان بھائی جو پہلے تنگ نظری اور کوتاہ خیالی کی

نا روا تلقین سے مفلوج ہو گئے تھے اب ان میں نئی طاقت اور نئی روح کار فرما ہے۔
دوسرے یہ کہ بہت سے اساتذہ مجھ سے ملنے کیلئے آتے رہے اور ان کی وجہ سے میرا چند روزہ قیام شیراز بہت دلچسپ ہو گیا۔

شیراز میں دو ہفتے ٹھہرنے کے بعد اصفہان جانے کا ارادہ کیا۔ روانگی کے دن مالک ہوٹل مسٹر عشقی نے اپنے آفس روم میں چار کی دعوت کی جہاں میں نے ایک نوٹس دیدہ زیب فریم میں آویزاں دیکھا۔ مالک ہوٹل نے مجھ سے کہا اسے بغور ملاحظہ فرمائیے اور کتاب الآراء میں اپنی رائے تحریر فرمائیے۔ نوٹس کے درج ذیل ترجمہ سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ ایران میں رفتار ترقی کی کیا نوعیت ہے۔

نوٹس

(۱) ہوٹلوں کے مالکوں کو چاہئے کہ اپنے اپنے ہوٹلوں کو پاک صاف رکھیں۔ منہ دھونے کا سامان ہمیشہ دھویا جائے۔ بہت سا فنائل چھڑکا جائے تاکہ مکھیاں نہ آسکیں

(۲) کھانے اور چائے کی میزوں پر ہمیشہ صاف چادریں بچھائی جائیں۔ پلنگوں کی چادریں اور تکیوں کے غلافوں کی تیسرے دن تبدیلی ضروری ہے۔ کمروں کے دروازے اور کھڑکیاں کھلی رکھی جائیں تاکہ دھوپ اندر آسکے۔

(۳) کھانا پکانے کے برتنوں کو استعمال سے پہلے اچھی طرح دھونا چاہئیے اگر وہ تانبے کے ہوں تو ان میں اچھی طرح قلعی کی جایا کرے۔

(۴) اشیاے خوردنی تازہ اور عمدہ تیار رہیں اور پینے کا پانی جوش دیا جایا کرے۔

(۵) میس کے ملازمین ہمیشہ باقاعدہ صاف وردی پہنا کریں۔

(۶) ہوٹلوں کے وسط صحن میں پھلواری ضرور ہونی چاہئے۔

(۷) رکابیاں، چھریاں، کانٹے اور چمچے دھوئے جاکر گرم کھولتے ہوئے پانی میں ڈالنے کے بعد کام میں لائے جائیں۔

(۸) ہر ایک مالک ہوٹل کو ایک رجسٹر رکھنا چاہئے جسمیں محکمہ صفائی کے افسر حفظان صحت کی ہفتہ وار رپورٹ درج ہو۔

(۹) ان قواعد میں سے کسی ایک کی بھی خلاف ورزی ہونے پر لیسنس ضبط اور ہوٹل بند کردیا جائیگا۔

(۱۰) ہوٹل میں ٹھہرنے والوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ اگر ان قواعد میں سے کسی کی بھی خلاف ورزی پائیں تو کتاب الرائے میں درج فرمادیں۔

(۱۱) کوئی مالک ہوٹل مجاز نہیں ہے کہ اشیاے خورد نوش کی قیمت اس سے زیادہ وصول کرے جو میونسپلٹی کی طرف سے مقرر کی گئی ہے۔

قواعد پڑھ کر میں خوش ہوا اور بلدیہ کے عہدہ داروں کی تعریف کے ساتھ مالک ہوٹل کو ان قواعد پر عمل پیرا ہونے کی مبارکباد دی۔

رخصتی الفاظ کے تبادلے کے بعد ۱۴ مئی کو ڈھائی بجے شیراز سے روانہ ہوا۔ دو گھنٹے کی مسافت طے کرکے میں پرسپولس (اسطخر) پہونچا دور سے پرسپولس کے کھنڈر نظر آتے ہی بے اختیار

میری زبان پر یہ اشعار جاری ہوئے :۔

تختِ جمشید و خطِ جام ہوا نقش فنا ۔۔۔ نہ سکندر ہے نہ آئینۂ حیرت افزا
نفسِ بادِ صبا سے یہ صدا آتی ہے ۔۔۔ کہ سلیمان کا برباد ہوا تختِ ہوا
کس کی اس بزم میں روشن ہوئی شمع اقبال ۔۔۔ جس کو گل کر نہ گئی جنبش دامانِ قضا
اس خیاباں کا ہر اک نخل ہے نخلِ ماتم ۔۔۔ کفِ افسوس ہے پتّہ ہے جو اس گلشن کا
لئے پھرتی ہے صبا دوش پہ آج انکا غبار ۔۔۔ جن کی رفتار سے ہر گام تھا فتنہ برپا
جن کی آواز تھی سرمایۂ اعجازِ مسیح ۔۔۔ خواب میں بھی کبھی سنتے نہیں کان انکی صدا
ہو میسّر تو یہ بات اہل فنا سے پوچھوں ۔۔۔ کیوں مقیمانِ عدم حال کہو کیا گزرا
نہ وہ چہلیں نہ ترنگیں نہ خود آرائی ہے ۔۔۔ کُنج تاریک ہے اور عالم تنہائی ہے

یہ ایران کے شاہان سلف کے عظیم الشان قصر کے آثار ہیں۔ بہت سے سیاحوں کی بدولت یہاں کے آثار قدیمہ کا اس قدر حال قید تحریر میں آچکا ہے کہ اس میں اب کسی اضافہ کی گنجائش نہیں۔

ایران میں یہ مقام چہل مینار کے نام سے مشہور ہے۔ چالیس ستون یا تختِ جمشید شہنشاہ جمشید کا تخت گاہ تھا جسکے کتبے آج ماہرین آثار قدیمہ کے لئے حیرت آفریں ہیں ۔موجودہ سائنس کے ذریعے سے ان کتبوں کے سمجھنے میں کامیابی حاصل ہوئی اور اب اس امر کے متعلق ادنیٰ شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان بڑے بڑے وسیع اور بلند چبوتروں پر تین قصروں کا کار تعمیر عہد دارائی میں شروع اور اسکے فرزند خرشاس

کے وقت میں پایۂ تکمیل پر پہونچا۔

میدان زیریں سے ان چبوتروں پر جانے کا راستہ دو بلند زینوں کے ذریعہ سے ہے جو ارتفاع و شکوہِ تعمیر میں لاجواب ہیں۔ ان زینوں کی سیڑھیاں بتدریج اونچی ہوتی گئی ہیں۔ جنکی بلندی ساڑھے تین انچ اور چوڑائی ۲۲ فٹ ہے۔ چبوترے کی نصف بلندی پر بڑی سیڑھی پر پہونچکر باقی سیڑھیاں دونوں طرف عمارت کے اندرونی حصے میں چلی گئی ہیں اور چبوترے پر پہونچکر آپس میں مل گئی ہیں۔

ایک نووارد کو چبوترے کے فرش پر پہنچتے ہی سانڈوں کے دو قدآور مجسّمے ملتے ہیں جو ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہوئے میدان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ انکے درمیان کا فاصلہ چار قدم سے کچھ زیادہ ہے۔ اس طرح وہ اِس پرشکوہ عمارت کا صدر دروازہ بنگئے ہیں۔ اِن مجسّموں کے اطراف میں دیواروں پر خطِ ثُلث میں نہایت صفائی سے ترشے ہوئے وہ کتبے ہیں جن سے اِس مرتفع عمارت کے بنوانے والے کے خطابات کی تفصیل معلوم ہوتی ہے۔

ان سانڈوں کے پیچھے دو اور پردار سانڈ ہیں جن کا سر انسان کا سا ہے اور وہ ایک دوسرے کے مخالف منھ پھیرے کھڑے ہیں۔ ہر ایک کا قد اُنیس فٹ لمبا ہے ان کی ہیبت شکلیں دیکھنے والے کے دل میں ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی ہیں جو ایسے قصرِ رفیع کے محافظوں کے شایان شان ہے۔

اِس پرشکوہ باب الداخلہ کے جنوب میں تقریبًا ۴۵ قدم کے فاصلے پر ۹ فٹ

اونچا اور ۲۱۲ فٹ لمبا ایک اور بلند چبوترہ ہے جس پر وہ ستون نصب ہیں جنکی مناسبت سے ان کا موجودہ نام چہل ستون ہے۔

چبوترے کے سامنے کی دیوار پر صنعت سنگ تراشی میں ایک جلوس دکھایا گیا ہے جس میں لوگ بادشاہ کیلئے مختلف قسم کے تحائف لے جارہے ہیں کہا جاتا ہے کہ جشن نوروز جو ایرانیوں کا سب سے بڑا تہوار ہے اس مرقع سے اسی جشن کی یادگار قائم کرنا مقصود تھی کیونکہ اسی دن بادشاہ کے دربار میں تمام اعیان دولت و امرائے سلطنت باریاب ہو کر نذریں پیش کیا کرتے تھے۔

وہاں سے ایک اور زینہ ۷۰ فٹ لمبا اور ۹۵ فٹ چوڑا ایک دوسرے چبوترہ پر پہونچاتا ہے۔ خاص کمرے میں جانے کیلئے چھ دروازے ہیں جنکے دونوں طرف بادشاہ کی تصویریں اسطرح بنائی گئی ہیں کہ ان کے پیچھے خدام ہیں جن میں سے ایک کے ہاتھ میں چنور اور دوسرے کے ہاتھ میں چتر ہے اس کمرے کی پوری دیواروں پر اسی قسم کی تصویریں نمایاں ہیں کہ کہیں آدمی اور شیر کی کشتی ہو رہی ہے کہیں انسان کو ایک عجیب الخلقت عفریت دبوچے ہوئے ہے جس کا سر اور دھڑ شیر کا پاؤں عقاب کے سے پنجے گردن وسینہ و پشت پروں سے ڈھکی ہوئی اور سر پر ایک بڑا سا سینگ نکلا ہوا ہے۔ انسان ایک لمبا چغہ پہنے برہنہ بازو ایک ہاتھ سے اس عجیب الخلقت دیو کا سینگ پکڑے ہوئے ہے اور دوسرے ہاتھ سے اسکے پیٹ میں خنجر بھونک رہا ہے۔ ان غیر معمولی مُنبت کار تصاویر کے کچھ پوشیدہ معنی بھی ہیں یا نہیں یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے مگر عام اعتقاد یہ ہے کہ شاہ دیں پناہ کی جانب سے کفر و

ضلالت کے مٹانے کا نقشہ اِس تصویر کے ذریعے پیش کیا گیا ہے

ایسے ہی تین محل اور بھی ہیں جو دیکھنے والے کو مبہوت اور حیرت زدہ بنا دیتے ہیں۔

اِس عمارت کے نیچے زمین دوز نہریں ہیں جنمیں ایک ایسے بڑے حوض سے جو پہاڑ میں کاٹ کر بنایا گیا تھا پانی آیا کرتا تھا یہ مہتم بالشان کار تعمیر سطوت سلف کی نمایاں یادگار ہے حُسن تعمیر کی ندرت اور قصر سلطانی کی آرائش و زیبائش دنیا کو بتا رہی ہے کہ ایران میں یہ فنون ترقی کی کتنی بلندی تک پہونچ گئے تھے جن کا تاریخ میں کچھ پتہ نہیں بجز اِسکے کہ کچھ دھندلے نشان رہ گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ ایران کے ادوار ماضیہ کو مغرب نہ سمجھ سکا اِسی لئے ایسے متمدّن ملک کو اس نے ایک وحشی ملک قرار دیا جو تہذیب مغرب کے شایاں نہیں کیونکہ یہ وہی ایران ہے جو زمانۂ قدیم میں دنیا کو بہت کچھ علوم و فنون سکھا چکا ہے۔

ایران میں موجودہ طرز تعلیم کے متعلق جو ابتدائی خیال پیدا ہوا وہ ان کے لئے قومی تفاخر ہے۔ حکومت ایران نے اپنے آثار قدیمہ کی سُراغ رسی کیلئے مغرب سے اِس فن کے ماہرین کی خدمات حاصل کی ہیں اور ہدایت کی ہے کہ وہ "حفریات" وغیرہ کے ذریعے نئے معلومات حاصل کریں۔ آثار قدیم کی کھدائی کے متعلق ایک رپورٹ جرمنی فرانسیسی اور ایرانی میں شایع ہو چکی ہے جسمیں کئی تصویریں بھی ہیں اور دوسری رپورٹ عنقریب شایع ہونے والی ہے۔

چوتھا باب

سیر اصفہان

مئی کی پچیسویں کو صبح کے ساڑھے آٹھ بجے سلاطین صفویہ کے پایۂ تخت اصفہان پہونچا شیخ علی حزیں ایران کے ایک نامور شاعر نے اس شہر کی تعریف و توصیف میں بہت گلفشانی کی ہے۔ یہاں انکی ایک مثنوی کے چند اشعار ہدیۂ ناظرین کرنا غالباً بے محل نہوگا۔

گردوں پدر است و مادر ارکاں　　فرزند بہ از پدر صفاہاں
چہ شرق وچہ غرب را دروجاے　　یک کوچہ گرفتہ ہر دو ماوے
یک خانہ طلوع بامداد است　　یک کوچہ شب سیاہ زاد است
صد بار بر اوج سر کشد مہر　　کش جاے دگر نہاں بود چہر
فطرت گل کس مبوے خارش　　ادراک گیاہِ کشت زارش
بر درگہِ ایں جہان حکمت　　یوناں باشد گداے فطرت
ہر کوچہ معلّے ستادہ　　ہر گام فلاطنے فتادہ

بازار گیانِ او خرد مند — ہم عقدہ کشای وہم رصد بند

او باش مجسطی آفرینند — اطفال شفا در آستینند

انہارِ بہشت اگر چہار است — خلدیست کہ نہر او ہزار است

شاہ عباس اعظم جو شہنشاہ اکبر کا ہمعصر اور دودمان صفویہ میں نہایت اولوالعزم و عالی حوصلہ تاجدار گذرا ہے۔ اسکے عہد میں شیخ صاحب کے ارشاد کے موافق اصفہان نیمۂ جہاں ہو تو ہو۔ اسوقت تو ایران کے بڑے شہروں میں سے کوئی امتیاز حاصل نہیں۔

جس موٹر میں آرہا تھا اُسنے مجھے گیراج میں اُتار دیا۔ اسی کے قریب کسی سکھ تاجر کی دوکان موٹر کے سامان کی تھی۔ اسکے پتہ بتانے سے میں مہمان خانہ فردوس پہونچا جو اصفہان کے تین بہترین ہوٹلوں میں سے ایک ہوٹل ہے۔ مغربی سیاحوں نے اسجگہ کی کثافت وغیرہ کی جو شکایت کی ہے یہاں اسکا کہیں نشان تک نہیں۔ ہر چیز صاف و شفاف نظر آتی تھی مالک ہوٹل نے بہ خندہ پیشانی جو ایرانیوں کا خاصہ ہے میرا خیر مقدم کیا اور نفیس شربت کا ایک گلاس پیش کیا۔ چونکہ چھتیس گھنٹے کے موٹر کے سفر میں بہت تھک گیا تھا اِس لئے پہلے دن کہیں نہ جا سکا۔

دوسرے دن اِس بڑے تاریخی شہر کی سیر کیلئے نکلا۔ یہاں کی وہ تنگ و کثیف گلیاں دیکھنے کی بڑی آرزو تھی جنکے دونوں طرف کچی دیواروں کے گھر اور بیچ میں خچروں پر لدے ہوئے گھانس کے بڑے بڑے گٹھوں سے راہ گیروں کے کھوے چھلتے ہیں، جیسا کہ اگلے مغربی سیاحوں نے بلاد ایران کے متعلق بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے۔ مگر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے

ہر طرف دیکھنے پر بھی اِس میں سے کوئی چیز دکھائی نہ دی۔ مجھے تو اونچے اونچے سایہ دار درختوں کے بیچ میں بیس فٹ چوڑی صاف ستھری سڑکیں اور دونوں طرف پیدل چلنے والوں کیلئے دس دس فٹ کے چوڑے راستے جانبین کے پیدل راہ رووں کے راستوں اور سڑک کے بیچوں بیچ دو دو فٹ چوڑی بہتی ہوئی نہریں نظر آئیں۔

یہ وہ دلچسپ منظر ہے جسے کوئی بے نیاز ہستی بھی بغیر پسند کئے نہیں رہ سکتی۔ میں نے ایسے سایہ دار راستے نہ کہیں ہندوستان میں دیکھے نہ یورپ میں۔ چند راستوں کے سوا جو شاہ عباس اعظم کے زمانہ کے ہیں جس کا نام ابتک بڑی بڑی عمارتوں کے تعمیر کنندہ کے طور پر لیا جاتا ہے اور تمام راستے اعلحضرت رضا شاہ پہلوی کے عہد میں بنے ہیں ایران کے شہروں کو طرز جدید پر خوشنما اور بارونق بنانے کیلئے ہر طرف مٹی کی پرانی دیواروں کی جگہ اینٹ اور پتھر کی عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں۔

جو لوگ پہلے چوروں اور سرکاری عہدہ داروں کے خوف سے مرتفع مکانات بناتے ہوئے جھجکتے تھے اب تحفظ جان و مال سے مطمئن ہو کر وسیع و خوشنما مکانات بنانے لگے ہیں۔ اسکے علاوہ تعمیر امکنہ کیلئے جگہ جگہ انجمنیں قائم ہو گئی ہیں جن سے سہل الوصول شرائط پر مکان بنانے والوں کو روپیہ قرض دیا جاتا ہے۔ باہر والے جو اب ایرانی رعایا بن گئے ہیں جدید ذرائع حمل و نقل کی سہولتوں کے باعث شہروں کی وسعت اور شہرت میں کافی ترقی کے خیال سے کار تعمیر میں دل کھول کے روپیہ لگانے لگے ہیں اور نئے خیابانوں کی دونوں جانب بہت اچھی دوکانیں اور نئی وضع کے مکانات

بنوائے ہیں حکومت کیطرف سے کسی شاہ راہ جدید کے اعلان تعمیر کے ساتھ ہی اسکے دونوں طرف مکان بنانے کی اجازت کیلئے عام لوگوں کی درخواستیں پیش ہوتی رہتی ہیں۔

کارخانوں کا قیام اور موٹروں، لاریوں، بسوں کی بدولت آسان وارزاں ذرائع حمل ونقل اصفہان کو پھر اس بلند درجہ پر پہونچا رہے ہیں۔ جو کبھی عہد شاہ عباس اعظم میں اسے حاصل تھا۔ اگرچہ میں بہ نسبت ایران قدیم کے ایران جدید کے نظارہ کا زیادہ دلدادہ تھا پھر بھی چہار باغ مدرسہ میں جانے کے میلان طبع کو روک نہ سکا۔ یہ مدرسہ جو شاہ عباس اعظم نے تعلیم دینیات کیلئے بنوایا تھا۔ اسکی عمارت مشرقی بلند حوصلگی کا آئینہ ہے۔ جس کے بیچ میں ایک نہایت سرسبز وشاداب باغ اور اس کی نہر ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ باغ کے کھجور کے درختوں میں اب بھی کچھ درخت ایسے باقی ہیں جن کی نسبت مشہور ہے کہ انھیں خود شاہ عباس اعظم نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ عمارت کے اندرونی حصہ میں طلبا کے رہنے کیلئے تقریباً دو سو دُہرے کمرے اور درس وتدریس کے واسطے ایک نہایت خوشنما وسیع ہال ہے یہیں ایک بلند گنبد کی بڑی مسجد بھی ہے۔

یہ عمارت مدرسہ جو برسوں سے بیکار پڑی تھی محکمۂ تعلیمات کے تفویض کردی گئی جو یونہی سی ترمیموں کے بعد ایک مدرسۂ جدید بن جائے گی۔

چارباغ مدرسے سے نکلکر میں جامع مسجد روانہ ہوا۔ راہ میں پولیس کے جوان سے رہنمائی کی خواہش کی میرے اجنبی ہونے سے وہ بخوشی میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوا۔ پھر کہنے لگا کہ اگر چند منٹ توقف کیجئے تو میں پولیس اسٹیشن جاکر اپنے افسر بالادست سے اجازت

لے لوں۔ دس منٹ کے بعد وہ افسر بالادست خود تشریف لائے اور مجھ سے دریافت کیا۔ "کیا آپ وہی صاحب ہیں جنکے اصفہان آنے کی خبر مقامی اخباروں میں شائع ہو چکی ہے"؟ میں نے کہا "مجھے اسکا کوئی علم نہیں۔ میں پروفیسر مولوی ہوں اور ہندوستان سے آیا ہوں" اسنے مجھ کو پہچانا اور بہت اخلاق سے میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوا۔ ایک کرائے کی سواری میں مجھے جامع مسجد لے گیا جہاں پروفیسر مور سے ملکر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ یہ امریکن ہیں جو استنبول میں ایک امریکن کالج کے پروفیسر ہیں۔ ایران کی قدیم مساجد عموماً دو منزلی ہیں۔ نیچے کا حصہ جس میں جابجا آتشدان بنے ہوئے ہیں موسم سرما کیلئے اور اوپر کا حصہ موسم گرما کے واسطے۔

ایران کا قدیم سلسلۂ تعمیر اس امر کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ یہاں کے فن تعمیر کی خوبی و خوشنمائی تمام دنیا کی پیش رو تھی، احاطۂ مسجد میں ایک علیحدہ گنبد لگی ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ کبھی زردشتیوں کا معبد تھا اور اس کی مدتِ تعمیر پندرہ سو برس پہلے کی بیان کی جاتی ہے۔

ایک یوروپین مصنف کا بیان ہے کہ " ایران میں بغیر استثنا تمام مکانات مٹی کے ہیں اور بہت بدہیئت نظر آتے ہیں " اگر مٹی کا ایک گنبد پندرہ سو برس تک رہ سکا تو مٹی کے مکانوں کو ہمیشہ رہنا چاہیئے۔ یہ واقعہ صحیح ہے تو پھر مٹی ہی کے مکانوں کو خشتی یا سنگی عمارتوں کے مقابلہ میں ترجیح دیجائیگی جو دو سو برس سے زیادہ کارآمد نہیں ہوتے۔ بات یہ ہے کہ اگلے زمانہ میں بھی خشتی اور سنگی بڑی بڑی عمارتیں بنائی جاتی تھیں

لیکن مالکانِ امکنہ چوروں اور ڈاکوؤں کے ڈر سے مکانوں کے اطراف میں خام دیواریں بنوادیا کرتے تھے یہ سچ ہے کہ باھر سے وہ میلی کچیلی اور ناگوار نظر معلوم ہوتی تھیں لیکن ان کے اندر حیرت خیز ندرت صناعی کے محل کے محل پوشیدہ ہوا کرتے تھے۔

طہران میں مرزا محمد ہاشم اصفہانی نے جو ایک بڑے تاجر ہیں مجھ کو ڈنر پر مدعو کیا۔ باھر سے انکا مکان ایک جھوپڑا سا معلوم ہوتا تھا۔ اور مجھے کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ یہی وہ مکان ہے جسمیں دعوت کیگئی ہے مگر اندرونی حصہ میں قدم رکھتے ہی میں حیرت زدہ ہوکے رہ گیا۔ کئی ایکڑ رقبے میں ایک ایسا فردوس رنگ و بو دکھائی دیا۔ جس میں جابجا طرح طرح کے خوشنما حوض اور فوارے تھے اور ایک ایسی دومنزلہ عمارت نظر پڑی جو ہر موسم کے آرام و آسائش کا لحاظ کر کے بنائی گئی تھی۔

مرزا اصفہانی جن کی عمر ستر سال کی ہوگی فرمانے لگے " یہ مکان میرے والد ماجد کا بنوایا ہوا ہے جسے ساٹھ برس ہوئے۔ ایران کے بڑے شہروں میں جہاں بےخیابانوں کا جال سا پھیلا ہوا ہے۔ پرانے مکانات نئی وضع کے مکانوں اور دوکانوں کے پیچھے ہوگئے ہیں لیکن اگر اندر جا کے دیکھیئے تو معلوم ہوگا کہ اب سے صدیوں پہلے بھی ایرانیوں میں حُسنِ تعمیر کا مذاقِ اعلیٰ کارفرما تھا ایران میں غریب سے غریب کا چھوٹے سے چھوٹا کوئی ایک مکان بھی ایسا نہیں مل سکتا جسکے صحن میں نظر فروز چمن بندی نہ ہو۔

جامع مسجد سے مسجد شاہ عبّاس کے دیکھنے کیلئے گیا یہاں دو عجیب و غریب چیزیں نظر آئیں ایک تو بہت بڑا پیالہ ہاتھی کے سر کے برابر بظاہر ایک ڈال تیھر سے

ترشا ہوا معلوم ہوتا تھا اسکی بیرونی سطح پر آیات قرآنی کندہ تھے۔ یہ پیالہ مسجد کے سامنے ایک سنگی تپائی پر رکھا ہوا تھا۔ ذرا چھو دینے سے بھی اِس میں آواز جرس پیدا ہوتی تھی یہ راز ابتک نہ کھل سکا کہ یہ کس چیز کا بنا ہوا ہے۔ دوسری چیز مسجد کے گنبد کی عجیب وغریب ساخت تھی جس میں اسکے فرش پر ایک مرتبہ پاؤں مارنے سے بازگشت کی سات آوازیں پیدا ہوتی تھیں یوروپین سیّاحوں میں سے کسی نے ان عجائبات کا ذکر تک نہیں کیا بظاہر اس کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ابھی حال تک کسی غیر مسلم کو ایرانی مساجد میں جانے کی اجازت نہ تھی۔

یہاں سے منارہائے لرزاں کو دیکھنے گئے۔ ہم نے ایک منار پر چڑھ کر درخت کی شاخ کی طرح اسکو ہلا ڈالا۔ دوسرا منار جو اس سے تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر تھا وہ بھی اِسکے ساتھ ہلنے لگا۔ اصفہان میں ایک صاحب بہادر سے ملاقات ہوئی انھوں نے اسے بالکل معمولی واقعہ بتایا۔ لیکن جو بات آج بالکل سہل البیان معلوم ہوتی ہے اب سے تین سو برس پہلے ایسی نہ ہوگی۔ پھر ہم علی وردی خاں کا پُل دیکھنے گئے جو اپنے تعمیر کنندہ کے نام سے موسوم ہے۔ اِس میں ۳۳ در ہیں۔ اسپر شاہراہ کے دونوں جانب پیدل چلنے والوں کیلئے چھوٹے چھوٹے دروں کے مسقف راستے ہیں۔

اس پل کو عبور کرکے ہم ایک وسیع وکشادہ راستہ پر ہو لئے جسکے دونوں طرف کھجور کے درختوں کی قطاریں تھیں اور جو ہشت بہشت کو جاتا تھا لیکن اب ہشت بہشت کا نام ونشان تک باقی نہیں غالباً بہشت شداد کی طرح وہ بھی دنیا کی نظروں سے پوشیدہ کردی گئی۔

یادورِ نادری و قاچاری میں ضم ہو گئیں۔

قصرِ شاہ عباس دیکھنے کے بعد پولیس افسر مجھے اپنے آفس لیگیا اور چائے پلائی اور ٹیکسی والے کو ہدایت کی کہ مجھے ہوٹل فردوس پہونچا دے۔ میں اس دلپسند سلوک سے بہت خوش ہوا اور انھوں نے سواری کا کرایہ اپنے پاس سے دیکر مجھے اور حیرت زدہ بنا دیا میں نے کرایہ دینے پر کتنا کتنا اصرار کیا لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے اور کہنے لگے "آپ ہمارے مہمان ہیں اور یہ ہمارا فرض ہے کہ ہر طرح آپ کی خاطر و مدارات اور جہاں تک ہو سکے آپ کی مدد کریں۔ اگر اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو آپ بے تکلف ٹیلیفون کیجئے میں خدمت کیلئے ہر وقت حاضر ہوں"۔

آغازِ سفر سے اختتامِ سفر تک ایران کا محکمۂ پولیس میرے ساتھ اس طرح پیش آیا کہ تہذیب و شائستگی اور ہمدردی و مہربانی کا اسے مجسّمہ کہوں تو بجا ہے اور خوش اخلاقی و ہمدردی پولیس کمشنر سے لیکر ایک کانسٹبل تک میں میں نے محسوس کی۔

جون کی آٹھویں کو شام کے ساڑھے سات بجے **اصفہان** سے روانہ ہوا اور جون کی نویں کو علے الصباح قُم پہونچا۔ یہاں حضرت **فاطمہ** معصومۂ قُم کا روضہ ہے یہاں عمامے اور عبائیں پہنے ہوئے سَو سے زیادہ مقدس لوگ دیکھے، اس نظارے سے ہندوستان کی یہ افواہیں کہ مجتہدینِ ایران کا بالکلیہ استیصال کر دیا گیا ہے افسانۂ پارینہ کی طرح دور از کار ثابت ہوئیں۔

قم ایران کا ایک چھوٹا سا بارونق شہر طہران کے قریب واقع ہے، یہاں

حضرت معصومۂ قم کا نہایت عالیشان مقبرہ ہے. جس کا گنبد طلائی اور اندرونی حصّہ زرّیں نقش و نگار اور آئینہ بندی سے جگمگا رہا ہے۔ احاطۂ مقبرہ کے اندر اکثر شاہانِ ایران اپنی دائمی خوابگاہوں میں محوِ استراحت ہیں۔ فتح علیشاہ قاچار کی قبر پر سنگ مرمر کا مجسمہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سخت گیر اور پرجوش ملاؤں نے اِس بدعت کو کیسے روا رکھا مقبرے کے چاروں طرف بڑے بڑے صحنوں میں اکثر خوش اعتقاد مسلمان مدفون ہیں۔ اِسی کے قریب ایک خوشنما بازار ہے جہاں ہر قسم کی چیزیں فروخت ہوتی رہتی ہیں۔

پانچواں باب

سیر طہران

دسویں جون کو طہران پہونچا جو ہر لحاظ سے ایک جدید شہر معلوم ہوتا تھا وہاں کی چوڑی سڑکیں جن کی دونوں طرف نئی وضع کی بہت سی دکانیں نہایت خوش سلیقگی سے مختلف سامان سے سجی ہوئی ہیں۔ سیکڑوں گھوڑے گاڑیاں جوڑیاں جن پر کوچبان خوشنما وردیاں پہنے ہوے اور بسیوں موٹریں پولیس کے ایک اشارے پر چل رہی ہیں سیکڑوں مردوں اور عورتوں کے پرے کے پرے یوروپین لباس پہنے ہر طرف مصروف گلگشت ہیں۔ یہ مناظر اور سیکڑوں ایسی باتیں ہیں جن سے یہ شہر یورپ کا سا جدید شہر معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ پندرہ برس پہلے ایران کو دیکھ چکے ہیں انھیں اسوقت کی ترقی ایسی عجیب و غریب معلوم ہوگی جو بنی نوع انسان کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ انسان کی دوڑ رفتار زمانہ کے ساتھ ہوا کرتی ہے اور اگر اسے نظرانداز کردیا جائے تو زمانہ جبرًا اپنی پیروی پر مجبور کردیتا ہے۔ ہر ایک قوم نے ابتدءً

بہت ہی پست حالت سے تدریجی طور پر ترقی کی ہے ایران کا ارتقا پذیر ہونا محلّ استعجاب نہیں حیرت انگیز چیز جو ہے وہ اِس مُلک کے ارتقا کی سُرعت و تعجیل ہے اور ممالک نے بہ تدریج ترقی و بالیدگی اختیار کی لیکن ایران اِس راہ میں سپلٹے بھرتا ہوا کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ پھر لطف یہ کہ ابھی تک دنیا کو یہ خبر نہیں کہ اسے یہ معراج کیسے نصیب ہوئی۔ بیس برس پہلے تک نہیں کہا جا سکتا تھا کہ عروجِ بخت کی بازی کبھی ایران کے ہاتھ بھی آسکے گی۔ لیکن آج ایران کے ظلِ ارتقا میں تیغ و قلم ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ معاشرتی و تمدنی سرسبزی، دستوری حکومت کی وسعت، بالیدگی نصفت شعاری و انصاف پسندی، خود مختار مملکت کا تموّل، بلندی و برتری روز افزوں ہے۔ حاصل یہ کہ یہاں کی رفتار ترقی معجزہ سا معلوم ہوتی ہے۔

ایرانیوں کا جوش اقدام اور ولولۂ عمل کا خروش دیکھکر بعض پست خیال ایرانی اور توہّم پرست بیرونی تجار اس وہم میں مبتلا ہیں کہ یہ سرعتِ رفتار کہیں ایران کو منھ کے بل نہ گرادے اور یہ ترقی دفعتًا زوال کا پیش خیمہ نہ ہو۔ چونکہ انسان قدامت پسند واقع ہوا ہے۔ اِسلئے وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ایران نے کسطرح صدیوں کے روایات جمود سے ہٹ کر جدید طریقۂ معاشرت اختیار کرلیا۔ پینتالیس برس کا واقعہ ہے کہ **ناصر الدین شاہ قاچار** تمباکو کی پوری کاشت اور خرید فروخت کے جملہ حقوق ایک انگریزی کمپنی کے ہاتھ بیع کرنا چاہتے تھے علماے اسلام نے احتجاجًا اس وقت یہ فتویٰ جاری کیا کہ کوئی شخص کسی طرح بھی تمباکو کے استعمال کا مجاز نہیں۔

فوراً اس حکم کی تعمیل میں تمباکو فروشوں کی دوکانیں بند ہوگئیں۔ ایران کے تمام زن و مرد جن میں نوّے فی صدی رات دن حقّہ پینے کے عادی تھے۔ یکلخت اسے چھوڑ بیٹھے۔ اور ملک میں تمباکو ایسا نایاب ہوا کہ خود قلیاں شاہی کیلئے بھی کہیں سے تمباکو نہ مل سکا۔ بہرطور جو معاہدہ کمپنی کے ساتھ ہوچکا تھا ناصرالدین شاہ کو مجبوراً اسے منسوخ کرنا پڑا اور اس منسوخی نے کمپنی کو بڑا تاوان دلوا دیا۔ عہد ناصرالدین شاہ کا یہ دوسرا واقعہ بھی سننے کا ہے۔ شاہ نے اپنی فوج کو قواعد سکھانے کیلئے سویڈن سے ماہرین فن سپہگری کو بلانا چاہا مگر مجتہدین نے غیر مسلموں کی زیر دستی میں مسلمانوں کا کام کرنا ناجائز قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ افسران سویڈن کو واپس کرنے پر مجبور ہوئے۔

ایک مرتبہ کوئی مسلمان اُس ریل کے ڈبّہ میں سے گر کے مرگیا جو طہران سے مقبرۂ شاہ عبدالعظیم کو جاتی ہے۔ مجتہدین عظام نے حکم صادر فرمایا کہ ریل کے ٹکڑے ٹکڑے کردئیے جائیں۔ اِس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور ایک روسی انجنیر مار ڈالا گیا صرف ایک مسلمان کے مرنے سے جس کی ہلاکت ریل کے عہدہ داروں کی غفلت سے نہیں ہوئی تھی ریل کی پوری پٹری اکھڑوا کے پھکوا دی گئی۔ مجتہدین کے اِس ناعاقبت اندیشانہ حکم سے دولت ایران کو روسیوں اور نیز بلجیم کے لوگوں کو بہت بڑا تاوان ادا کرنا پڑا۔

۲۵ر اپریل ۱۹۲۵ء میں جب اعلیحضرت رضا شاہ کی تاجپوشی ہوئی تو دس دن قبل سے دس دن بعد تک ایران میں بڑا جشن منایا گیا لیکن اِس جشن میں ناچ رنگ گانے بجانے کا کہیں پتہ نہ تھا غالباً اسکی یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ اسطرح کی تقریبوں کی

دھوم دھام طبقۂ اجتہاد کی نورانی نگاہوں میں ناروا لہو ولعب کے مماثل ہے۔

خاندان قاچار کے عہد حکومت میں یہی مجتہدین ذوی الاحترام پورے ملک پر چھائے ہوئے تھے۔ اور انہی تقدس مآب حضرات کی چین جبیں اوراق حکومت پر شکن بن جاتی تھی۔

بارہ برس ہوئے کہ رابرٹ ڈبلیو امری امریکن نائب سفیر دولت امریکہ کو اتنی سی بات پر مار ڈالا گیا کہ کسی بزرگ کے مقبرے کے گرد اجتماع کے وقت کچھ ایرانی عورتیں جو چادر پیچے میں تھیں یہ ان کے فوٹو لے رہا تھا۔

۱۹۳۲ء سے پہلے ایران میں کوئی عورت بغیر نقاب کے باہر نہیں نکل سکتی تھی، اور نہ اپنے شوہر، باپ یا بھائی یا اپنے فرزند کے ساتھ باہر جا سکتی تھی، یہاں تک کہ زن و شو بھی گاڑی میں ساتھ نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ مگر آج نقاب غائب ہے اور کہیں نظر نہیں آتی مرد اور مستورات سڑکوں پر آزادی کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں، دوکانوں اور دفاتر میں عورتیں کام کرتی ہیں۔ تمام سنیما اور چائے خانے عورتوں سے بھرے رہتے ہیں جو ہر طرح سے مغربی عورتوں کے مثل اپنے فرائض انجام دیتی ہیں۔

ایران میں موجودہ معاشرت بالکل ایک تماشہ گاہ معلوم ہوتی ہے۔ بیرونی لوگ آسانی سے سمجھ نہیں سکتے کہ موجودہ روش زندگی کسی تھیٹر کے منیجر کا کرشمہ ہے یا حقیقتاً جدید طرز معاشرت اختیار کر لی گئی ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ زبردست مجتہدین کدھر روپوش ہو گئے جنکی تعداد آبادی کا دسواں حصہ تھی کیا انھوں نے صدیوں کی قدامت پسندی کو

خیر باد کہہ کے نئی روشنی کی طرفداری اختیار کرلی یا پیام رسول کے موافق موجودہ حالات کی ترجمانی کرنے لگے یا محض تقیّہ کی آڑ پکڑی گئی ہے جو اہل تشیع میں سخت ضرورت کے وقت جائز سمجھا گیا ہے۔ کیا عوام اتنے روشن خیال ہوگئے ہیں کہ ان تغیرات کی قدر کرسکیں کیا ملک ان اصلاحوں کیلئے تیّار تھا یا جبرًا یہ بوجھ ان پر لادا گیا ہے۔ یہ بخوبی معلوم ہے کہ ایرانی مغربیت کی طرف دوڑ رہے ہیں کیا وہ بہ طیب خاطر اس طرف جارہے ہیں یا کوئی اُن کو دھکیل رہا ہے؟ کیا ان کی اس عاجلانہ دوڑ میں گرنے کا تو اندیشہ نہیں اگر ایک دفعہ وہ گر پڑے تو کیا ان میں اتنی طاقت باقی رہے گی کہ یہ دوبارہ اُٹھ کر پھر ایسی ہی دوڑ لگا سکیں۔

یہ مسئلہ ایسا ہے کہ ہر جگہ ڈنر یا ڈرائنگ روم میں اسی پر بحث ہوا کرتی ہے۔ مجھے ان مباحث کے سننے کا اکثر اتفاق ہوا۔ بلکہ بعض اوقات میں نے خود بھی گرم جوشی کے ساتھ اس میں حصہ لیا۔ یوں تو مجھ سے اجنبی کیلئے عمومًا ان مقامی معموں کا حل کرنا دشوار ہے لیکن میں چاہتا تھا کہ اپنی معلومات کو بڑھاؤں اسلئے میں ہر قسم کے لوگوں سے ملا جو بہ اخلاق مجھ سے پیش آئے۔ اور اسطرح میرے اور ہر قسم کے ایرانی اہل الرائے کے ساتھ گہرے تعلقات پیدا ہوگئے اور اس سلسلہ کی بدولت مجھے حالات معلوم کرنے کا کافی موقع ملا جس سے میری سابقہ معلومات پر پوری روشنی پڑی۔ اور ایسی گھتیاں سامنے آئیں جن کا سمجھنا بظاہر آسان نہیں۔ ایران کی موجودہ حیرت انگیز ترقی کا راز ایرانیوں کے قومی خصائل میں مضمر ہے جسمیں کوئی تغیر نہیں واقع ہوا ہے۔

روئے زمین پر ایرانیوں سے بڑھ کر اور کوئی ایسی قوم نہیں جو ماحول و اقتضائے وقت کا ساتھ دینے کی پوری اہلیت رکھتی ہو۔ غیر معمولی قوت تحمل ایرانیوں کا حصہ ہے۔ اکھڑی ہوئی طاقت کو دوبارہ حاصل کرنے کا انھیں ایسا ڈھب یاد ہے جو سمجھ میں نہیں آتا۔ مقابلے پر عدم غلبہ کی صورت میں وہ جھک جاتے ہیں۔ لیکن جونھی ان کو اپنی قوت دوبارہ دکھانے کا موقع ملتا ہے وہ تازہ دم ہو کر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ مشہور مقولہ ہے کہ شانِ برتری صرف اس میں نہیں کہ کبھی نہ گرے بلکہ ہر دفعہ گرنے کے بعد پھر اُٹھنا ہی بڑی بہادری ہے۔ ایرانیوں کی تین ہزار برس کی تاریخ، عروج و زوال کا ایک اہم مرقع ہے۔ یہاں کے موجودہ میلان مغربیت کو باہر والے سمجھ نہیں سکتے اور بہتوں کو تو اس کا یقین بھی نہیں آتا۔ البتہ اسے وہی جان سکتا ہے جو ایران کی قدیم تاریخ سے بخوبی واقف ہو۔

چھٹا باب

تاریخ ایران پر ایک سرسری نظر

ایران کی تاریخ گویا ایک کامیاب ڈرامہ کے چھ کھیلوں کا مجموعہ ہے۔ شاہ دارا کے عہد شوکت و حشمت سے پہلے تماشے کا آغاز تصوّر کرنا چاہیے۔ جبکہ پرچم ایران نے ساری دنیا پر سایہ گستر ہو کر اور بارہا عساکر مغربی کو شکستِ فاش دیکر لرزہ براندام کر دیا تھا۔ اصطخر کے آثار قدیمہ کو اِس عہد زریں کا نمایاں ثبوت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور یہی وہ جگہ ہے جہاں فخر و مباہات کا رجز پڑھتے ہوے ایرانیوں کی آمد و رفت رہا کرتی ہے۔ وہ لڑکا جو ہائی اسکول کے پہلے سال کا امتحان پاس کر چکا ہو۔ ناممکن ہے کہ شاہ سیروس۔ دارا۔ خرخشاص کے ناموں اور ان کے کارناموں سے واقف نہ ہو۔ انقلاب زمانہ نے ان کی اِس سلطنت کی عظمت و جبروت کو سطوت و صولت سکندری کے سامنے سرنگوں کر دیا۔ سکندر اعظم کا

تین سو برس کا زمانہ گزرنے کے بعد اس دور میں کوئی ایرانی فارسی کا نہ ایک لفظ تک جانتا اور نہ لکھ پڑھ سکتا تھا۔ اس طرح ایسی نمایاں ترقی کی صدہا کتابیں اپنی زبان

(بقایا حاشیہ صفحہ ۵۱) پیش کرتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ عباسیوں میں دورِ مامون گل سرسبد کی حیثیت رکھتا ہے۔ ترقی علوم و فنون میں اس کی آمرانہ سعی و کوشش، اغیار کی اس ناروا نکتہ چینی پر کہ اشاعت اسلام تلوار کے زور سے ہوئی نہ کہ دلائل و براہین سے ایک دارالمناظرہ کا قیام جس میں مختلف ادیان و ملل کے حلقہ بگوشوں کے دوش بدوش مامون کی ہمنشینی، اس کی دقیقہ رسی و نکتہ سنجی، اولوالعزمی و بلند حوصلگی، نصفت شعاری و مسالمت پسندی کے کارنامے ایسے نہیں جنھیں زمانہ فراموش کرسکے۔

ننھیال کی طرف سے مامون کی غیر مشتبہ عجمیت، اس کی مادری زبان کی مسلمہ فارسیت، ابتداءً عجم ہی میں اس کی پرورش و تربیت، دربار میں ایرانیوں کی بہتات اور کثرت وغیرہ وغیرہ یہ باتیں تاریخی مسلمات کا درجہ رکھتی ہیں۔

مامون کی مدح میں عباس مروزی کا وہ فارسی قصیدہ جس پر دربار خلافت سے شاعر کو ایک ہزار اشرفی کا بیش بہا صلہ عطا کیا گیا تھا۔ آج بھی ارباب نظر کے پیش نظر ہے۔ عوفی یزدی نے اس قصیدے کے یہ چند شعر نقل کئے ہیں:۔

اے رسانیدہ بدولت فرقِ خود بر فرقدین　　گسترانیدہ بہ فضل وجود، در عالم یدین
مر خلافت را تو شائستہ چو مردم دیدہ را　　دینِ یزداں را تو بائستہ چو رخ را ہر دو عین
کس بدیں منوال پیش از من چنیں شعرے نگفت　　مر زبانِ پارسی را ہست با ایں نوع بین
لیک زاں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں لغت　　گیرد از مدح و ثنائے حضرت تو زیب و زین

اس سلسلے کی مسلسل کڑیاں دیکھنے کے بعد ناتواں بیں سے ناتواں بھی مامون الرشید کی ذات کو اس ضمیرِ جور و بیداد کا مرجع نہیں ٹھہرا سکتا جس کی طرف متن کتاب میں اشارہ کیا گیا ہے ۱۲ بلگرامی

میں تصنیف کر ڈالیں۔ جو علم ادب اور دوسرے علوم و فنون کا خزانہ سمجھی جاتی ہیں اور یہ جو کچھ ہوا عربوں کے زوال حکومت کے بعد ظہور پذیر ہوا۔ باوجود ان عجیب وغریب مظاہروں کے بعض بیرونی افراد کی یہ رائے ہے کہ ایرانی حب الوطنی میں پیچھے ہیں۔ اگر اس کو حب الوطنی نہ کہا جائے تو پھر حب الوطنی کا لفظ کس جگہ قابل استعمال قرار پاسکے گا چوتھا دور اسوقت شروع ہوتا ہے جبکہ مغلوں نے ایران پر حملہ آور ہوکر تاخت وتاراج کر ڈالا۔ اس کے بعد خاندان صفویہ کا عہد آیا۔

تیرھویں صدی کے وسط میں ایرانیوں نے اپنی غیر معمولی ذکاوت اور قابلیت انتظام سے اپنے ملک کو پھر بارونق اور شاندار بنا دیا۔ اس وقت مغل حملہ آور ہوئے۔ جو یانی اپنی تاریخ جہاں کشا میں مغلوں کی غارتگری اسطرح لکھتا ہے

"یہ لوگ آئے۔ انھوں نے سارے باغوں اور زراعت کو برباد کر ڈالا شہروں میں آگ لگادی، وہاں کے باشندوں کو بے دریغ تہ تیغ کیا۔ بہتوں کو پکڑ کر ساتھ لے گئے۔ شہر کے شہر بے چراغ کر دیے۔ ہر چیز آگ میں جھونک دی اور تقریباً ایک تہائی باشندوں کو جنہیں مرد، عورت، بچے سب ہی تھے تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ کسی کو یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ ایسی تباہی کے بعد ایرانی پھر حیات نو حاصل کر کے اپنی اجڑی ہوئی سلطنت کو دوبارہ آباد کرسکیں گے۔

سلاطین صفویہ کے عہد میں انھوں نے تازہ دم ہوکر امور سلطنت کو منظم کیا

اور تمام ملک کو پھر متحد کر کے ایک ایسی سلطنت قائم کی جو شاہ عباس اعظم کے زمانہ میں معراج کمال پر پہونچی۔ مساجد اور مقبروں کے بلند گنبد اور مرتفع مینار اسی بادشاہ کے وقت میں تعمیر ہوئے۔ ان کے علاوہ قصر چہل ستون، چار باغ، مدرسہ، اصفہان میں دو بڑے بڑے پُل ان کے سوا اور بہت سی عمارتوں نے دنیا کے بڑے بڑے ماہرین فن تعمیر سے خراج تحسین حاصل کیا۔

کچھ تو اس وجہ سے کہ ملک ایران کی جغرافیائی حیثیت نے ہمجوار قوی سلطنتوں کو حملہ آوری کا موقع دیدیا تھا۔ اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ شاہ عباس کے خلاف اپنے مورث اعلی کے خلاف محلات شاہی میں پرورش پانے لگے تھے اور اس نہج تربیت نے ان میں پست ہمتی اور نسائیت کے جراثیم پیدا کر دیے تھے۔ حکومت صفویہ کا اپنے آخری تاجدار کی ہلاکت پر خاتمہ ہو گیا۔

پانچویں دور کی ابتدا حملۂ افاغنہ اور سطوت نادری کی مُڈبھیڑ سے ہوئی۔ روسیوں ترکوں اور افغانوں نے سارے ملک کے حصے بخرے کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ مگر ایرانی پھر اپنے ایک سردار قبیلہ **نادر شاہ** کی سرکردگی میں ابر و باد کی طرح اٹھے اور ملک کو تباہی سے بچا لیا۔ یہ بڑا منچلا نبرد آزما جسکی چین جبیں تیغ دشمن سے بڑھ کر پر خوف سمجھی جاتی تھی۔ اس کی فطرت میں فنون سپہگری آئین نبرد آزمائی قواعد فرض شناسی یہ اوصاف جمیلہ قدرت نے بدرجہ اتم ودیعت فرمائے تھے، ایک ہی حملے میں اس نے ایک طرف تو افغانوں کو پسپا کیا۔ اور دوسری جانب ترکوں اور روسیوں کو نیچا دکھایا۔

ایسے قوی بازو اور چیرہ دست حریفوں پر فتحیابی کے گھمنڈ نے اس سلسلہ کو لاہور اور دہلی تک پہونچا دیا۔ جب وہ گراں آرزو، بے بہا جواہرات جنھیں آجتک سلطنت ایران اپنا سرمایۂ نازش سمجھتی ہے۔ ہندوستان سے لیکر نادر ایران واپس ہوا تو اسے اپنے ولیعہد کی طرف سے سازش کی خلش محسوس ہوئی۔ اس شبہہ پر حکم نادری نے اس کی دونوں آنکھیں نکلوا کے اپنے نور نظر کو بے بصر کر دیا۔ پھر خود ہی اس ناروا حرکت پر انفعال و ندامت سے اہل دربار کو مورد عتاب قرار دیکے اس جرم کی پاداش میں کہ عمائد سلطنت نے بروقت اس فعل شنیع سے باز رکھنے کے لئے عرض و معروض سے کیوں خاموشی اختیار کی۔ سب کی آنکھیں نکلوانے کا عزم بالجزم کرلیا۔ عزم شاہی کی اطلاع کے ساتھ ہی قبل اس کے کہ احکام نادری کی تعمیل ہو۔ امرائے سلطنت نے آپس میں ایکا کر کے نادر شاہ درانی کا کام تمام کر دیا۔

بیک گردش چرخ نیلوفری
نہ نادر بجا ماند و نے نادری

اس عبرت انگیز سانحے کے بعد عہد قاچار کا آغاز ہوا۔ جسے چھٹا دور سمجھنا چاہیئے۔ اسی دور میں تحریک انقلاب شروع ہوئی اور بتدریج بڑھنے لگی۔ یہانتک کہ حکومت قاچاری کا خاتمہ اور موجودہ دور پہلوی کی ابتدا ہوئی۔ جو ایران میں مغربی معاشرت پھیلانے کا ذمہ دار ہے۔

ساتواں باب

شاہانِ قاچار اور تحریکِ انقلاب کی ابتدا

اس انقلابی تحریک کے حقیقی اسباب شاہان قاچار کے مظالم تھے، جن کی تفصیل دلچسپی سے خالی نہیں۔ قتل نادر شاہ کے بعد ایک زند خاندان نے راج پاٹ سنبھالا اگرچہ اس کی مدت فرمانروائی بیس برس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ لیکن اس خانوادے کے سلاطین نصفت شعار کا نہج حکمرانی سلطنت کے امن و امان اور آسودگی و مرفہ الحالی کا برابر محافظ رہا۔

ترکی قبیلے کے سردار آقا محمد نے ایک بڑے لشکر جرار سے شہر کرمان کا محاصرہ کرلیا۔ لطف علیخاں زند نے دیکھا کہ اب کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔ شہر کے پھاٹک کھلوا دیئے اور اپنے اسپ باوفا کو مہمیز کر کے لشکر دشمن پر جا پڑا۔ ادھر صرف تین منچلے وفا کیشوں کو ساتھ لئے افواج دشمن کی صفیں چیرتا الٹتا بھڑتا ہوا نرم سیر پہنچ گیا جو صوبہ

کرمان کے مشرقی گوشہ میں واقع ہے

آقا محمد اپنے حریف کے اس طرح نکل جانے پر ایسا غضبناک ہوا کہ شہر میں قتل عام کا حکم دے دیا۔ تقریباً دو ہزار عورتیں اور بچے لونڈی غلام بنا کر فروخت کر دیے گئے۔ پھر حکم دیا کہ باشندگان کرمان کی ستر ہزار آنکھیں نکال کے طشت میں رکھکر پیش کیجائیں۔ ظلم وجور کے اس دیوتا نے اپنے خنجر کی نوک سے آنکھوں کو گنا۔ اور مڑ کر اپنے وزیر سے کہنے لگا۔ کہ اگر ان میں ایک بھی کم ہوتی تو تمھاری آنکھ نکالکر تعداد کو پورا کیا جاتا

لطف علیخاں (زند) کی ایسی نگرانی کیگئی کہ وہ بمقام بام گرفتار ہوا۔ آقا محمد نے اپنی اس فتح کی یادگار میں لطف علی خاں زند کے سرفروشوں کے کاسہ ہائے سر کا ایک مینارہ بنوایا اور کوئی تذلیل وتوہین اس کے لئے اٹھا نہ رکھی گئی۔ آخر کار بڑی بیدردی وبے رحمی سے طہران میں مارا گیا اور اس کے سب خاندان والے بھی طعمۂ عقاب شمشیر ہوئے۔

رضا قلی خاں ہدایت نے تاریخ روضۃ الصفا کے ضمیمہ میں شاہان قاچار کا حال یوں لکھا ہے کہ ایک دن آقا محمد اپنے بھتیجے فتح علی شاہ سے گفتگو میں مصروف تھا۔ اسکی باتوں سے نہایت خوش اور محظوظ ہو کر کہنے لگا کہ تیری ہوشمندی کی باتیں مجھے بہت پسند آئیں۔ جو خواہش رکھتا ہو وہ بیان کر، تیری ہر ایک آرزو پوری کیجائے گی، شہزادہ نے عرض کیا کہ آپ کے الطاف واشفاق نے ہر ایک خواہش سے مجھے بے نیاز کر دیا ہے لیکن اگر میری خوشی ہی پسندیدۂ خاطر ہے تو اپنے ذمہ دار عہدہ داروں کو حکم دیجئے کہ

رعایا کے ساتھ بلطف و مدارا پیش آئیں۔ آقا محمد نے کہا ارے بیوقوف تجھے بالکل دنیا کا تجربہ نہیں۔ رعایا کے ساتھ سختی سے پیش آنا ہی میری حکومت کی کامیابی کا راز ہے میرے خیال میں تو پورے دس گھروں میں ایک ہی چولہا ہونا چاہیئے تاکہ وہ بآسانی اپنا کھانا بھی نہ پکا سکیں۔ ورنہ وہ کھا کھا کے موٹے ہو جائیں گے اور تیرے خلاف ہر طرح کا فساد پھیلائیں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہی ہدایت قاچاریوں کا نصب العین بنی رہی۔ اس بد سرشت و خون آشام نے ایرانی شرافت کا خون بہا کے اپنی حکومت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اسکی پہلی کوشش یہی تھی کہ اپنی قوت و اقتدار کے باغ کو دشمنوں کے لہو سے سینچا جائے۔ اسی بنا پر خاندان زند کے کل افراد اور وہ لوگ جو اُس گھرانے کے بہی خواہ و خیر اندیش تھے اُن سب کے سر قلم کر دیے۔ ظالم و جابر ستم کیش و خودسر آقا محمد نے اپنے بھتیجے فتح علیشاہ کے واسطے شاہراہ حکمرانی صاف کرنے کے لئے اپنے اور اعزہ کو خس و خاشاک کی طرح جاروب شمشیر سے جھاڑ کے راستہ صاف کر دیا۔

اس کی ستم رانی و چیرہ دستی نے جس مسجد میں **نادر شاہ** دفن تھا اسکی قبر کھود کر ہڈیاں نکلوائیں اور لیجا کر اپنے محل کے دروازے کے نیچے دفن کرا دیں۔ حالانکہ یہ نادر شاہ وہ تھا جس نے عین وقت پر ملک کو دشمنوں کے نرغے سے چھڑا لیا تھا۔ قبر نادر کی طرح کریم خاں زند کے مدفن کی بے حرمتی بھی اسی کے ایما سے ہوئی۔ اس کے ظالمانہ اقدام نے روس کو برافروختہ کر دیا۔ مدت تک دونوں ملکوں میں ایسی جنگ چھڑی جو ایران کے لئے تباہی کا باعث ہوئی۔ ۱۷۹۷ء میں اسکے باڈی گارڈ کے دو افسروں

میں جھگڑا ہوا آقا محمد نے ناراض ہو کر حکم دیا کہ علی الصباح دونوں کو قتل کر دیا جائے لیکن رات میں بدستور یہ اپنے فرائض انجام دیتے رہیں۔

ان دونوں نے یہ سمجھ کر کہ اس سفاک سے رحم کی توقّع رکھنا بے سود ہے نہایت خاموشی سے اسکے سو جانے کا یہ انتظار کرتے رہے جب وہ بالکل بے خبر سو گیا تو خوابگاہ میں گھسکر خنجر سے اُس کا خاتمہ کر دیا اور اسطرح یہ ظلم شعار اپنے کیفرکردار کو پہنچا اس خوگر جور و تعدی نے سیکڑوں ہزاروں کا بے دریغ خون بہا کے تخت سلطنت حاصل کیا تھا اور محکوم و حکمران میں ایک ایسی وسیع خلیج حائل کر دی تھی جس پر پُل باندھنا دشوار تھا۔ اسی شور بخت نے بیٹھے بٹھائے حکومت روس سے ایسی آویزش اختیار کی جس نے سو برس تک ایران کو بربادی اور تباہی کے بھنور سے نکلنے نہ دیا اور ایران کا بہت سا شمالی حصہ اس کے حریف کی نذر ہو گیا۔

فتح علیشاہ قاچار آقا محمد کی جگہ اس کا بھتیجا تیئس برس کے سن میں تخت نشین ہوا۔ آقا محمد اپنے اعزہ میں سے چُن چُن کے تاج و تخت کے دعویداروں کو قتل کر چکا تھا لیکن اس کے چچا صادق خاں نے بغاوت کی اور برسرِ مقابلہ ہوا فتح علیشاہ کو جو ایک پست ہمت شخص تھا مجبوراً میدان کارزار میں جانا پڑا چند بندوقوں کی آواز ہی سے وہ ایسا ڈرا کہ غش کھا کے گھوڑے سے نیچے گر پڑا لیکن اسکے وزیر خوش تدبیر حاجی ابراہیم نے اس واقعہ کو پوشیدہ رکھا اور یہ بات بنائی کہ شاہ فرطِ غضب سے اپنے حواس میں نہیں اور قہر سلطانی کا سیلاب موجزن ہونے کو ہے۔

صادق خاں نے حاجی ابراہیم کی چرب زبانی سے متاثر ہوکر ہتھیار ڈال دیے اور اپنے تئیں فتح علی شاہ کے حوالے کر دیا۔ لیکن اس فرمانروا نے صادق خاں کو ایک حجرے میں بند کرا دیا تاکہ وہ بھوک سے مر جائے۔ چند روز کے بعد جب حجرے کا دروازہ کھول کے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ بھوک کی انتہائی تکلیف میں انگلیوں سے زمین کھود کھود کے اور مٹی کھا کھا کے وہ ہمیشہ کے لئے سیر ہوگیا ہے۔

فتح علی شاہ نے بھی اپنے چچا آقا محمد کی طرح نہایت ظالمانہ طرزِ عمل سے اپنے دورِ حکومت کی ابتدا کی اس میں نام کو بھی جہاں بانی و حکمرانی کی اہلیت نہ تھی بزدلی کی وجہ سے ہمیشہ اپنے وزیر کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رہتا تھا۔ گویا وزیر ہی ملک کے سیاہ و سپید کا مالک اور حقیقی حکمران تھا اس پر بھی اپنی مطلق العنانی سے باز نہ آتا تھا۔ اسکے ناروا حکم سے بعض بڑے بڑے امرا کا مال و متاع ضبط کر کے انھیں اتنا پٹوایا گیا کہ وہ سب کے سب اذیت زدوکوب سے جانبر نہ ہو سکے۔

یہ مضحکہ خیز نقل بھی سننے کی ہے کہ ایک دفعہ اُس نے کچھ اشعار نظم کئے اور اپنے دربار کے ملک الشعرا سے کہا کہ ان اشعار کو پڑھو اور ان کے متعلق اظہارِ رائے کرو۔ ملک الشعرا نے بادب اشعار کی ہیچمیرزی کی جانب اشارہ کیا۔ مدعی شعر و سخن نے برافروختہ ہوکر ملک الشعرا کی نسبت کہا کہ یہ گدھا ہے۔ اسے طویلے میں لیجاؤ۔ حکم شاہی کی تعمیل میں اس بدبخت شاعر کو گدھوں کے ساتھ طویلے میں رہ کر گھاس کھانا پڑی۔ کچھ دنوں کے بعد شاہ نے پھر اسے شرف باریابی سے سرفراز کیا اور اپنے

کچھ اور اشعار پڑھ کر سنائے۔ شاعر صاحب وہاں سے بغیر کچھ کہے جانے کے ارادے سے اُٹھے۔ شاہ نے پوچھا کہاں چلے۔ اُس نے جواب دیا کہ پھر طویلہ میں۔ فتح علی شاہ کو اس کی یہ صاف گوئی بہت پسند آئی اور حکم دیا کہ اسکا منہ مصری سے بھر دیا جائے۔ کسی کے ساتھ اس طرح کا طرزِ عمل اختیار کرنا اس وقت بڑا الطاف شاہانہ سمجھا جاتا تھا۔

فتح علی شاہ کی بہت سی بیویاں تھیں۔ رضا قلی خاں ہدایت تاریخ روضۃ الصفا کا مصنف ضمیمہ میں رقمطراز ہے کہ فتح علی شاہ کا محل چار سو بیویوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ان کی خدمت کے لئے پانچ سو خواجہ سرا ملازم تھے۔ ان بیگموں سے دو سو ساٹھ ۲۶۰ اولادیں ہوئیں۔ جن میں ڈیڑھ سو کی تعداد اولاد نرینہ تھی اور ایکسو دس ۱۱۰ لڑکیوں کی۔ جنھیں سینا پرونا، کاتنا، کار زر دوزی اور لکھنے پڑھنے کی بھی تعلیم دیجاتی تھی۔

لیکن اس پر بھی ان کا درجہ ایسا پست اور فرو تر تھا کہ یہ اپنے شوہروں کی نگاہوں میں کچھ نہ جچتی تھیں۔ ایسے بڑے گھرانے کے لئے جس میں تقریباً بارہ سو افراد کی بود و باش ہو۔ فتح علی شاہ کو ہمیشہ روپیہ کی ضرورت رہا کرتی۔ ایران کو اپنا مفتوحہ ملک سمجھکر وہ رعایا سے جبراً روپیہ وصول کیا کرتا تھا۔ شاہزادوں میں سے اکثر جو مختلف صوبوں کے گورنر تھے۔ حصول زر کے معاملہ میں شاہ کے قدم بقدم اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہٖ کے پورے مصداق تھے۔

خاندان قاجار سے عموماً اہل ایران کے تنفر کی اصلی وجہ یہی تھی کہ وہ اس خاندان کو ہر طرح کے ناروا ظلم و تعدی اور بیجا چیرہ دستی کا مرکز سمجھتے تھے۔ اپنے

آبا و اجداد کی خام کاریوں اور خود اپنی مہملیتوں کی وجہ سے دول یورپ کے ساتھ سیاسی تعلقات قائم کرنے پر فتح علی شاہ کو مجبور ہونا پڑا۔ سیاسی گتھیوں کو ناخن تدبر سے سلجھانے کی اہلیت نہ رکھنے کے باعث وہ اکثر دول غیر کے سیاست دانوں کے ہاتھ میں آلہ کار بنگیا تھا جس کا انجام اگرچہ ایرانیوں کی تباہی و بربادی کے سوا کچھ اور نہ تھا مگر خاندان قاچار کو اس کی مطلق پروانہ تھی۔

شاہ نے اپنے وزیر حاجی ابراہیم کے ذریعہ سے دولت برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس سے یہ اُمید بندھ گئی تھی کہ ہر ایک حملہ آور کے سامنے سینہ سپر ہوکر سلطنت برطانیہ اس پر آنچ نہ آنے دیگی۔ کچھ عرصہ کے بعد فتح علی شاہ نے حاجی ابراہیم کے روز افزوں تمول و اقتدار پہ رشک وحسد سے تنگ آکر اسکی آنکھیں نکلوانے کے ساتھ گُدّی سے زبان بھی کھچوالی۔

سات برس کے بعد فتح علی شاہ نے ایران میں روسیوں کی پیش قدمی روکنے کے لئے فرانس سے حکومت روس کے خلاف ایک نیا معاہدہ کیا۔ اسی سلسلہ میں ایرانی سپاہیوں کو قواعد وغیرہ سکھانے کے لئے فرانسیسی افسر بلائے گئے اور دربار شاہی میں فرانسیسیوں کا رسوخ روز بروز بڑھنے لگا۔ برطانیہ نے اسے رشک کی نظر سے دیکھا اور سابقہ معاہدہ کی تجدید کے لئے ایک دوسرا سفیر بھیجا۔

۱۸۰۸ء میں جب سفیر برطانیہ ایران پہنچا تو حسن اتفاق سے روس اور فرانس میں صلح ہوچکی تھی۔ اسی بنا پر فرانسیسی افسروں کی واپسی ہوئی اور دولت برطانیہ کے

ساتھ اقدام و دفاع کے ایک نئے معاہدے پر دستخط ثبت ہوئے۔ اور اب ایرانی سپاہ کی فوجی تعلیم و تربیت کے لئے برطانوی افسر مقرر کئے گئے۔ لیکن ایرانی سپاہ کے پاس نہ تن ڈھکنے کو کپڑا تھا اور نہ کھانے کو غذا۔ جب یہ حالت تھی تو روسیوں کی منظم و باقاعدہ فوج سے یہ بھلا کیا خاک مقابلہ کر سکتی۔

فتح علی شاہ کی ناعاقبت اندیشیوں کی بدولت روسیوں کے ساتھ عرصہ تک لڑائی چھڑی رہی۔ جسکا انجام یہ ہوا کہ گرجستان۔ سگریلیا۔ امرشیا۔ گنجاہ۔ کراغ۔ سیمی سرماں۔ اور تاش۔ جو بحر اخضر پر واقع ہیں دولت ایران کو اپنے یہ سب صوبے روسیوں کے حوالے کرنے پڑے۔ ایرانیوں کو بحر اخضر میں جنگی جہاز رانی کی ممانعت کر دیگئی اور جدید حدود کا تعین اس درجہ ناقص طریقہ پر کیا گیا کہ انھیں آیندہ ہر وقت مداخلت کا بہانہ ہاتھ آسکے۔

ملک کا اتنا بڑا حصہ نکل جانے سے ایرانیوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ اور دنیا کی نظروں میں انکی کوئی وقعت باقی نہیں رہی۔ سنہ ۱۸۱۱ء میں ایک محترم پادری ہنری مارٹن شیراز تشریف لائے اور یہیں کے ایک مستند عالم مولانا سید علی کی مدد سے انجیل کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ جسے شاہ کی علانیہ پسندیدگی نے اُن اسلامی علما کو برافروختہ کر دیا جو پہلے ہی سے اس پر خار کھائے بیٹھے تھے۔

سنہ ۱۸۱۴ء میں فتح علی شاہ نے انگریزوں سے ایک اور معاہدہ کیا جس کی رو سے قرار پایا کہ ہمیشہ ایک برطانوی سفیر دربار میں موجود رہے۔ ادھر روسیوں نے بھی ایران

میں اپنا سفیر رکھنے پر اصرار کیا۔ شاہ نے دونوں حکومتوں کے مطالبے تسلیم کر کے کوہِ البرز کے دامن میں ایک موضع جو طہران سے سات میل کے فاصلے پر ہے موسم گرما گزارنے کے لئے انگریزوں کو اور اسی کے قریب ایک دوسرا روسیوں کو عطا کیا جو موضع انگریزوں کو ملا وہ گلاف کے نام سے مشہور اور سطح دریا سے تین ہزار آٹھ سو فٹ بلند ہے۔ پختہ سڑکوں، بنگلوں اور دفتروں سے یہ جگہ برطانوی مقام کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتی ہے

تعیین حدود کا معاملہ ناقص رہنے کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے حکومت روس کو جارحانہ اقدام کا ایک بہانہ ملگیا۔ فتح علی شاہ قاچار کے سینتیس برس کے تباہ کن طرزِ حکومت نے اہل ایران کو اتنا زیر بار اور ملک کو ایسا برباد کیا کہ خاندان قاچار سے دنیا نفرت کرنے لگی اور حکومت و رعایا کے باہمی تعلقات نے ہمیشہ کے لئے نہایت نازک صورت اختیار کرلی۔ ایران کے اعلیٰ تعلیم یافتہ شرفا اور امرا کے ساتھ بے سبب نہایت ناروا برتاؤ روا رکھا گیا۔ اُن پر اعتماد نہ رہنے سے وہ سب کے سب مشتبہ اور غلاموں کی طرح حقیر سمجھے جانے لگے۔

بدوضعی بڑھنے لگی یہاں تک کہ وہ گستاخ قابل نفرت چالاک۔ خودغرض۔ بزدل اور لالچی بن کے رہ گئے۔ اہل حرفہ اور تجار کے انتشار خاطر اور بے اطمینانی نے صنعت و حرفت اور تجارت کا بازار سرد کیا۔ کاشتکار اور زراعت پیشہ ظالمانہ اور غیر منصفانہ طرز حکومت کے شکنجے میں دبے ہوئے زندگی کے دن کاٹ رہے تھے مُلاؤں اور مجتہدین کا کچھ لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ افراد دربار شاہی میں اپنی

بے اثری کی وجہ سے حکومت قاچاریہ سے نفرت کرنے لگے۔ سرکاری امداد نہ ملنے سے مدرسوں اور مکتبوں میں خاک اُڑنے لگی۔

ایسے خانہ بدوش قبائل جن کے افراد پہلے فوج میں بھرتی ہوتے تھے۔ حکومت قاچار کے ساتھ انھیں اب کوئی ہمدردی نہ تھی فتح علیشاہ کا جرم اولین اسکی طماعی تھی مگر اسپر بھی خزانہ ہمیشہ خالی ہی رہتا اور اس کی جمع کی ہوئی دولت سے وہی لوگ مستفید ہوتے تھے جو ہر طرح سے حصول زر کے طریقوں سے بہرہ مند ہونے پر بھی اکتفا نہیں بلکہ ملک کے حصّوں کو ہضم کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔

فتح علی شاہ کے آخری عہد میں ان باغیانہ خیالات کا بیج بویا گیا ناصر الدین شاہ کے زمانہ میں اس میں اکھوے پھوٹے اور محمد علی شاہ کے دور میں وہ ایسا تناور درخت ہوگیا جسکی شاخیں ہر طرف پھیل گئیں۔ ۱۸۳۵ء میں فتح علی شاہ کے انتقال کے کچھ روز قبل سپاہ ایران کو فوجی تعلیم و تربیت دینے کے لئے انگریزی افسروں کی ایک جماعت جسمیں شیل اور راکنسن جیسے افراد شامل تھے ایران میں داخل ہوئے۔

انگریزوں نے روسیوں کی طرح کبھی جارحانہ پیش قدمی نہیں کی تھی۔ ایران کو مدد دینے میں ان کی خاص غرض یہ تھی کہ اسے ایسا منظم بنا دیں کہ اگر کبھی روس ہندوستان پر حملہ آور ہو جسکا انگریزی مدبّرین کو بڑا اندیشہ تھا تو اس صورت میں یہ کچھ نہ کچھ مدافعت کرسکے ایران و افغانستان کے ساتھ انکا اتحاد محض دکھاوا اور ایک سیاسی چال تھی۔ انکی یہ خواہش تھی اور اب بھی ہے کہ ایران ایسی طاقتور اور خود مختار سلطنت بنجائے کہ وہ ہندوستان

اور روس کے درمیان (بفراسٹیٹ) کا کام دے سکے۔

سر ہنری بٹیون نے ایرانی فوج کا بحیثیت کمانڈر جائزہ تو لے لیا لیکن محمد شاہ کا خزانہ خالی تھا اور فوج کو تبریز سے طہران تک آنے کے لئے سپاہیوں کی تنخواہ اور دوسرے ضروریات کا انتظام کئے بغیر لانا دشوار تھا۔ اس وجہ سے وہ کچھ نہ کر سکا۔ سر جان کیمبل سفیر دولت برطانیہ نے بامید منظوری اپنی گورنمنٹ سے ایک معقول رقم لیکر بطور قرض کے سر ہنری بٹیون کے حوالہ کر دی تاکہ وہ فوج کو طہران لیجا کر تخت بچا سکیں۔

محمد شاہ کے زمانے میں ایرانیوں پر کچھ ظلم تو نہیں ہوا لیکن اس میں حکمرانی کی مطلق اہلیت نہ تھی، وہ فوجی مظاہرہ کا بڑا شوقین تھا مگر تھا نہایت خوشامد پسند۔ اس سے ایک بڑی حماقت یہ سرزد ہوئی کہ روسیوں کے ساز باز سے وہ ہرات پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ اس حرکت سے دولت برطانیہ جو اس کی سچی مخلص دوست تھی ناخوش ہو گئی۔ اس نے اس بارے میں کسی کی ایک نہ سنی اور ہرات پر حملہ کر ہی دیا۔

انگلستان ہمیشہ ایران کو یہ مشورہ دیتا رہا کہ وہ اپنے ملک کی اندرونی حالت کی اصلاح کرے اور بیرونی فتوحات کا خیال بالکل دل سے نکال ڈالے لیکن روس کی چال تو کچھ اور ہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر شاہ کو شکست ہوئی تو وہ اور کمزور ہو جائے گا اور اپنے قوی ہمسایہ سلطنتوں کے رحم و کرم کا خواستگار رہو گا اور اگر قسمت سے فتحیاب ہوا تو ہندوستان کے ساتھ اس کی مڈبھیڑ ہو گی۔ دونوں صورتوں میں

اس کا فائدہ تھا لیکن انگلستان کو کبھی یہ گوارا نہ تھا کہ ہرات کسی ایسی حکومت کے تحت آجائے جو ہمیشہ سے روس کی دست نگر رہی ہو۔ شاہ نے انگلستان کی عمدہ رائے پر عمل کیا جزیرہ اشورداجو بحر اخضر میں استرآباد کے قریب بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے روسیوں نے موقع پاکر اس پر قبضہ کرلیا۔ ایرانی برابر احتجاج کرتے رہے لیکن اُنھوں نے اُلٹا ایران ہی کو ناشکر گذار ٹھہرایا۔ ہرات کے حملے میں پسپائی سے شاہ کی آنکھیں کھلیں اور برطانیہ کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے جو ایک قسم کی شکر رنجی ہوگئی تھی اُسے دُور کر کے ترکی سرحد کی طرف متوجہ ہوا جہاں کی حالت عرصہ سے ناگفتہ بہ تھی۔

یہاں بھی برطانیہ کی مدد نے سرحدی نزاعوں کا تصفیہ کرا کے شاہ کو اپنے ایک ہم مذہب و ہمجوار کے ساتھ جنگ آزمائی سے بچالیا۔ محمد شاہ کے آخری عہد میں بدقسمتی سے کربلائے معلٰے میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے ایرانیوں کو بڑا صدمہ پہونچا۔ کربلا کے باشندے جو اکثر ایرانی تھے برسوں سے حکومت سلطان کی حلقہ بگوشی سے آزاد ہو رہے تھے۔

ناوک پاشا گورنر بغداد نے ایک فوج روانہ کی تاکہ وہ حکومت سلطان کی مطیع ہو۔ کربلا پر قبضہ کرلیا گیا اور تقریباً تین ہزار ایرانی قتل ہوئے۔ اس حادثے کا شاہ پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک بدستور دریچے میں بیٹھا ہوا ریوالور سے پرندوں کا شکار کرتا رہا ملک کا سیاہ و سپید اس کے نیم دیوانہ وزیر کے ہاتھ میں تھا۔ جو علانیہ اپنے تئیں روس کی رعایا ظاہر کرتا تھا۔ ہر ایک قابل

اور دانشمند شخص جس میں ذرا بھی حب الوطنی کی بو پائی اسے یا قتل کر دیا یا جلاوطن کر دیا۔

گورنروں کے عہدے نیلام ہوا کرتے تھے جس کی بولی سب سے زیادہ ہوتی اسی کو وہ عہدہ مل جاتا اور وہ رعایا پر ہر قسم کا ظلم و ستم ڈھاتا۔ ۱۸۴۸ء میں محمد شاہ نے وفات پائی اور ناصر الدین شاہ کی جانشینی عمل میں آئی۔

ناصر الدین شاہ کے زمانہ میں وسی ساز باز انتہائی درجہ پر پہونچ گیا تھا۔

آٹھواں باب

ناصر الدین شاہ اور بابیوں کا خروج

تخت نشین ہوتے ہی شاہ کو نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک شخص سیّد علی محمدؐ نے اپنے تئیں "باب" کے نام سے مشہور کیا (جسکے معنی دروازہ کے ہیں) اس نے اس نئی بات کو شہرت دینا شروع کی کہ کلام مجید کے چند نئے پارے دستیاب ہوئے ہیں جو ایرانیوں کے اعتقاد کے بموجب کھو گئے تھے۔ ان نئے پاروں سے کلام مجید کے بعض مضامین کی تردید ہوتی ہے۔ چنانچہ اُس نے اس نئے مذہب کے مواعظ کا آغاز کیا جس کا اصل اصول یہ تھا کہ ذات واجب الوجود سے صرف قدرت مراد ہے اور طرح طرح کے اصول مساوات ترتیب دیئے۔ ملک کے بیشتر تعلیم یافتہ اور لائق افراد مبلغ کے نہج تبلیغ اور نوعیتِ مواد کو جانچے پرتالے بغیر اس عجیب و غریب مذہب کے پیرو ہو گئے۔

یہ رنگ دیکھ کر مذہبی پیشوا سخت برافروختہ ہوئے اور بنظر مآل اندیشی اس کے فوری استیصال کے لئے حکومت سے استدعا کی۔ اس نئے مذہب کے پیرؤوں کی روز بروز افزدنی اور ان کے ترقی پذیر اثرات کی پیش قدمی سے متاثر ہو کر شاہ نے ان کے قتل کا حکم دیدیا اور حکم شاہی کے نفاذ میں یہانتک سختی کیگئی کہ اس نئے مذہب سے جس کا کچھ بھی لگاؤ پایا فوراً اُسے ملک عدم پہونچادیا۔ سیکڑوں مشتبہ لوگ قتل ہوئے اور حکومت کی طرف سے ان کے رہنما یعنی باب کی گرفتاری یا قتل کے لئے بڑا انعام مقرر کیا گیا۔ باب سے مراد دروازہ یا وہ راستہ ہے جس کے ذریعے سے حق تک رسائی ہو سکتی ہے۔

آخر کار بابیوں نے ایک بڑا ہنگامہ برپا کیا لیکن ان کی کوشش رائگاں ہوئی، چھوٹے چھوٹے جھتے منتشر کر دیے گئے اور تھوڑے عرصے کے بعد اُن کا رہبر گولی سے مارا گیا۔ بابیوں نے شاہ کے قتل کا تہیہ کر کے حملہ بھی کیا مگر اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس سازش میں جتنے افراد شریک تھے سب پکڑے گئے اور اس بیدردی اور بیرحمی سے ان کا خاتمہ ہوا کہ تیل میں ڈبوئی ہوئی رسیوں سے مجرموں کو خوب جکڑ کے آگ لگادی اور طہران کے گلی کوچوں میں ان کو تشہیر کیا گیا۔ اس حالت میں بھی مجرم برابر کوستے اور یہ پیشین گوئی کرتے رہے کہ ملاؤں اور شاہ کا زوال عنقریب ہوگا۔

اس ظالمانہ برتاؤ نے اتنے پاؤں پھیلائے کہ جس کسی پر بغاوت کا یوں ہی سا بھی شبہہ ہوتا وہ فوراً قتل کر دیا جاتا۔ کئی دن تک بے سر لاشیں سڑکوں پر پڑی سڑتی رہیں

جن پر کتوں کا شور و غوغا بلند تھا۔ اس معاملہ میں برطانوی سفیر کی دخل دہی سے یہ قتل عام موقوف ہوا۔ چند سال بعد ایک دستہ فوج جس کے سپاہیوں کو مدت سے تنخواہ نہ ملنے کیوجہ سے نہ کھانیکو غذا میسر تھی اور نہ پہننے کو کپڑا۔ تو "مرتا کیا نہ کرتا" کے لحاظ سے عہدہ داروں کے ناجائز تغلب اور شاہ کی تغافل شعاری اور ناانصافی سے تنگ آکر فوج کے اس دستے نے مشہد پر قبضہ کرنے اور اپنے مطالبات کے پورا کرنے تک اسے خالی نہ کرنے کی دھمکی حکومت کو دی۔

اس پر ان سے ان کی عفو تقصیر اور ان کے ساتھ اچھا برتاو کرنے کے حتمی وعدے کئے گئے۔ ان وعدوں پر بھروسہ کرکے وہ اپنی بارکوں کو واپس ہوئے اور متعلقہ عہدہ داروں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ لیکن جوں ہی وہ گورنمنٹ کی زد میں آگئے شکایات کے تصفیہ کے بجائے وہ پچاس سر برآوردہ اشخاص جنھوں نے اس بغاوت میں زیادہ حصہ لیا تھا نہایت سفاکانہ طریقے سے قتل کر دیے گئے، جور و بیداد کی ایک نئی روش یہ اختیار کیگئی تھی کہ ہر ایک کے دانت اکھیڑ کے اسی کے سر میں ہتوڑے سے ٹھونک ٹھونک کر پیوست کر دیے جاتے تھے۔

دوسرا طرز ستم یہ تھا کہ شریان کھولدی جاتی تھی اور خون کے پرنالے بہ کر خاتمہ کر دیتے تھے۔ خود شاہ کے برادر نسبتی مرزا تقی اسی طرح ہلاک کئے گئے۔ ایسا ہی ایک اور ہنگامہ برپا ہوا جو اسی طرز ستمرانی سے دبا دیا گیا۔ فصلیں تباہ ہوگئیں ملک میں قحط پھیل گیا۔ طہران کے مالداروں نے گراں قیمت پر بیچنے کی غرض سے تمام غلہ خرید کر

جمع کرلیا تھا۔ اِس سے طہران کی حالت اور بدتر ہوگئی۔ لوگوں کے پاس روپیہ ہوتے ہوئے
فاقہ کشی کی نوبت پہنچ گئی۔ حالانکہ غلّے کے انبار کے انبار پوشیدہ طور پر موجود تھے۔

صبح سے شام تک نان بائیوں کی دکانوں پر زن و مرد کا میلہ سا لگا رہتا تھا
جو روٹی خریدنے کیلئے ایک دوسرے سے سبقت کرکے نانبائی تک پہونچنا چاہتے
تھے۔ بازار میں جسقدر غلہ فروخت ہوتا وہ ساکنان شہر کے لئے کافی نہ ہوتا تھا۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ جب شاہ گھوڑے پر سوار واپس آرہا تھا۔ بہت سی
عورتوں نے اُسے گھیر کے کہنا شروع کیا کہ یا تو آپ تخت سے دست بردار ہوں اور یا یہ انتظام
فرمائیں کہ بڑے بڑے لوگوں کے غلہ جمع کرلینے سے فاقہ کشی کی مصیبت میں ہم مبتلا ہیں
اس کا کسی طرح انسداد ہو۔ اِس ملامت آمیز استدعا پر شاہ کو بہت غصہ آیا اور حاکم شہر
کو سامنے بلاکر اس ہنگامے کے متعلق جواب طلب کرتے ہوئے کہا کہ شاہ راہ عام پر
اِسطرح کے ہنگاموں کا انتظام کیوں نہیں کیا گیا تا قبل اِسکے کہ وہ کچھ جواب دے،
شاہ نے بہت کچھ بُرا بھلا کہہ کے حکم دیا کہ فوراً اس کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ حکم شاہی
کی تعمیل ہوئی اور تمام شہر میں لاش کی تشہیر کے بعد تین دن تک وہ اس ستون میں
لٹکی رہی جہاں لوگوں کی گردنیں ماری جاتی تھیں۔

اسکی ساری جائداد ضبط کرلی گئی اور اسکے اہل و عیال ایک ہی دن میں خوشحالی کی
بلندی سے فقیری کے ہولناک گڑھے میں ڈھکیل دیے گئے تمام شہر میں ایک ہلچل
پڑگئی لیکن فاقہ کش ہستیاں تو خاموش نہیں رہ سکتی تھیں۔ نحیف و ضعیف عورتوں کا

ایک بڑا مجمع غفیر روتا پیٹتا سفارت خانۂ برطانیہ پہونچا اور سفیر برطانیہ مسٹر ایلین سے استغاثہ کیا کہ للّٰہ انکی حالت گرسنگی پر رحم فرماکے وزیر داخلہ کو لکھا جائے کہ وہ بھوک کی ماری مخلوق پر ترس کھاکے بہ قیمت غلہ فروخت کرنیکا حکم دیدیں۔

مسٹر ایلین نے وزیر داخلہ کو لکھا جس نے جواب دیا کہ اس بارے میں شاہ سے مشورہ کیا جائے گا۔ لوگوں کے گروہ یہ دریافت کرنے کے لئے سڑکوں پر جمع ہونے لگے کہ وزیر داخلہ نے سفیر برطانیہ کو کیا جواب دیا اور ذراسی دیر میں گروہ منتشر ہوگئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ان کے مطالبات کا تصفیہ کر دیا گیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت جو طریقہ انھیں منتشر کرنے کا اختیار کیا گیا وہ نہایت ظالمانہ تھا۔

فرخ نامی وزیر داخلہ نے مسکراتے ہوئے سفیر برطانیہ کا خط شاہ کے ملاحظے میں پیش کرکے عرض کیا کہ چار گھنٹے میں میں اسکا انتظام کئے دیتا ہوں۔ یہ کہکر اُس نے بہت سے فراشوں کو حکم دیا کہ آدھے درجن کان کاٹ کے لے آؤ۔ یہ سنتے ہی فراش جھپٹے اور جس کسی کو اس گروہ میں خوش پوشاک پایا اس سے کہا یا تو اپنے کان کٹواؤ یا فوراً معقول معاوضہ دو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر میں تمام سڑکیں خالی ہوگئیں لیکن چونکہ کانوں کا پیش کرنا ضروری تھا اس لئے چند فقیروں کو کن کٹا کرکے فرخ کے سامنے کٹے ہوئے کان پیش کر دیے۔

فرخ نے پوچھا کیا مجمع منتشر ہوگیا۔ فراشوں نے جواب دیا کہ اب سڑک پر ایک متنفس بھی نہیں۔ یہ واقعہ سنکر شاہ نے فرمایا کہ فرخ تم ایرانیوں پر خوب حکومت کرسکتے ہو

اسے حسنِ اتفاق سمجھنا چاہیے کہ اسی اثنا میں مواضع سے غلہ آگیا اور یوں فاقہ کشی کی اذیت سے انھیں چھٹکارا ملا۔ فن خوشامد میں فرخ بے نظیر تھا۔ اس نے چکنی چپڑی باتیں بنا کے حقیقت حال سے شاہ کو بے خبر رکھا اور مزے سے اپنی خدمت پر ڈٹا رہا۔ ملک میں سے چن چن کے لائق و تعلیم یافتہ اشخاص کو شہر بدر کرنے یا انھیں معزول کر کے اہم عہدوں پر اپنے نا اہل عزیز و اقارب کو بھرنے میں یہ بھی اپنے پیش رو وزیر حاجی مرزا سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اسکی نا اہلی اور ظالمانہ خود سری کے باوجود اتفاقاً ایسی چند صورتیں ناصر الدین شاہ کے عہد حکومت میں نمایاں ہوئیں جن سے ایران کی آیندہ ترقی اور رفاہ و فلاح کا راستہ کھل گیا۔

مدت دراز سے ایران کی غیر متعینہ اور تصفیہ طلب سرحدوں کی وجہ سے ہمیشہ جھگڑا چھڑا رہتا تھا۔ شاہ کے آخر عہد میں سرحدی نزاعوں کا پورا تصفیہ ہوگیا اور جانبین کے ذمہ دار عہدہ داروں نے مل کے حدود کی حد بندی ایسی واضح اور نمایاں طور پر کر دی کہ پھر کسی نزاع کا اندیشہ باقی نہیں رہا اور آئے دن کے فتنہ و فساد سے ملک محفوظ و مامون ہوگیا۔ ۱۸۶۳ء میں حکومت برطانیہ اور دولت ایران کے آپس میں ار برقی کے معاہدے پر دستخط ہوئے چنانچہ ۱۸۷۰ء میں انڈو یورپین ٹیلیگراف کمپنی نے طہران سے لندن تک برقی تار نصب کر دیا۔

۱۸۷۳ء میں ناصر الدین شاہ نے نہایت تزک و احتشام سے یورپ کا سفر کیا۔ جسمیں بہت سے اہل دربار اور اعزہ اور پیش خدمت وغیرہ شاہ کے ہمرکاب تھے

مغرب میں جگہ جگہ ترقی کی حیرت انگیز ضیا گستری دیکھ کے شاہ کی نگاہوں میں قیقہ رسی اور معلومات میں کافی وسعت پیدا ہوگئی اور اس سفر سے یہی سوغات اپنے ساتھ ایران لائے ۔

نواں باب

ایران میں سید جمال الدین کی آمد اور تحریک انقلاب کا فروغ

۱۸۸۹ء میں تیسری مرتبہ سیاحت یورپ سے واپسی میں ناصر الدین شاہ فریر نامی ایک فرانسیسی ڈاکٹر اور سید جمال الدین کو میونک سے اپنے ہمراہ ایران لائے۔ سید جمال الدین ایک مشہور اسلامی انقلاب پسند ایک زبردست صاحب الرائے بڑے جید عالم بجید مستعد و جفاکش، جسور ادرندر حکیم اور صاحب قلم، نہایت فصیح البیان مقرر، صحافت و سیاست میں بلند پایہ اور جوشِ حُبّ وطن سے سرشار تھے۔

ان کے معاندین انھیں ہر انقلاب کا بانی ٹھہراتے تھے۔ بہت سے اسلامی ممالک اور بلاد یورپ کی سیاحت کے دوران میں زمانہ کے ممتاز و سربرآوردہ افراد سے مل چکے تھے۔ ناصر الدین شاہ کا برتاؤ ابتداءً تو ان کے ساتھ بہت اچھا رہا۔ انکی قابلیت و جامعیت نے شاہ کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ لیکن انکی قوم پرستی اور انقلاب پسندی

کا راز چھپ نہ سکا۔

سید جمال الدین کو طہران آئے ابھی چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ شاہ نے ایک انگریزی کمپنی کو پچاس برس کے لئے تمباکو کی کاشت اور اسکی خرید و فروخت کے جملہ حقوق تعہد پر دیکر یہ طے کیا کہ اس کے عوض میں دولتِ ایران کو سالانہ پندرہ ہزار پونڈ اور کمپنی کے منافع میں سے ایک چوتھائی بطور حق شاہی پیش کیا کرے۔ چونکہ ملک کے لئے یہ طرز عمل نقصان عظیم کا سبب تھا۔ اس لئے قوم ایران میں اس معاہدے سے سخت اضطراب اور بےچینی پھیل گئی۔ حساب کرنے پر معلوم ہوا کہ موجودہ معاہدے کی بدولت کمپنی کو سالانہ پچھتر لاکھ روپیہ کا خالص منافع ہوگا۔ یہ دیکھکر سید جمال الدین سے رہا نہ گیا اور مختلف مقامات پر انھوں نے دھواں دھار تقریریں کیں۔ ساتھ ہی حجۃ الاسلام صدر مجتہدین حاجی مرزا حسن شیرازی کو جو سامرہ میں سکونت گزین تھے، اس مضمون کا ایک خط لکھا۔

> افسوس ہے کہ بادشاہ اہلیت حکمرانی نہیں رکھتا اس میں عقل و شعور کا نام نہیں۔ رشوت ستانی میں منہمک ہے۔ بد سرشت و بد اطوار وزیر امین السلطنۃ کے ہاتھ میں پورا ملک دیدیا ہے۔ یہ شخص غدار، ظالم تنگ خیال اور غاصب ہے۔ سردار دو عالم رسول اکرم کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کیا کرتا ہے اور احکام شرعیہ کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ مے نوشی اور سادات کی تذلیل کو روا رکھتا ہے۔

کافروں کا دوست اور مسلمانوں کا دشمن ہے۔ اس لئے شاہ کو سکھا پڑھا کے ایران کو بتدریج غیر سلطنتوں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کا اس نے تہیہ کرلیا ہے۔ چنانچہ ناصرالدین شاہ نے ایران کے تمباکو کی خرید فروخت کا ٹھیکہ ایک بیرونی کمپنی کو دیدیا۔ لاکھوں زن و مرد اب تمباکو کے لئے غیروں کے رحم وکرم کے محتاج رہیں گے۔ اغیار کا ایک نیا بینک بھی قائم ہوا ہے، گویا ملک کی زمام حکومت دشمنان اسلام کے ہاتھ میں دی جارہی ہے۔ شاہ کی طرف سے لوگوں کو یہ کہکر تسلی دی جاتی ہے کہ یہ ٹھیکہ صرف پچاس سال کی محدود مدت کیلئے ہے

"یکے نقصان مایہ و دیگر شماتت ہمسایہ"

روس چھوٹے چھوٹے عطیوں پر مطمئن نہیں وہ توصوبۂ خراسان کا الحاق چاہتا ہے۔

ہمارے ملک کے سارے ذرایع آمدنی غیر سلطنتوں کے پاس رہن کر دیے گئے ہیں۔ جن سے شاہ نے روپیہ قرض لیا ہے۔ قرض لینے کی طرف اسکا رجحان ایسا ہے کہ گویا اُس نے تمام صوبجات کو نیلام کرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔

اے مجتہدین اسلام بیدار ہو اور باشندگان ایران کا ساتھ دو اور انکی صحیح رہنمائی کرو۔ اگر اس موقع پر تم نے اپنا اسلامی فرض ادا

نہ کیا تو یاد رہے کہ سرزمین اسلام دشمنوں کے ہاتھ میں چلی جائیگی۔
سارے علما تمھارے فیصلے کے منتظر ہیں"۔

سیّد کے اس خط نے اپنا پورا اثر دکھایا اور انھوں نے فوراً ایک فتوے جاری کیا کہ تمباکو کی کاشت اور اسکا استعمال ممنوع ہے۔ تمام علما نے اسے شایع کیا اور اس فتوے کی تعمیل اس قدر جلد ہوئی کہ تمام ملک میں تمباکو جہاں کہیں بھی ملا ضایع کردیا۔ حقّے توڑ کر سڑکوں پر پھینک دیے گئے۔ تمباکو فروشوں کی دکانیں بند ہوگئیں۔ یہانتک کہ شاہ کے استعمال کے لئے بھی کہیں سے تھوڑا سا تمباکو بھی نہ مل سکا۔ آخر کار شاہ اس تعہد کو منسوخ کرنے پر مجبور ہوئے گو انھیں پانچ لاکھ پونڈ کا تاوان دینا پڑا۔ اور یہ رقم امپیریل بینک سے قرض لی گئی۔

اس کارروائی سے سید کے ساتھ شاہ کے برتاؤ میں ایسی نمایاں تبدیلی ہوئی کہ سید صاحب نے یورپ واپس جانیکی اجازت چاہی۔ جس پر بے اعتنائی کے ساتھ اجازت دینے سے انکار کیا گیا۔ اس انکار سے برافروختہ ہوکر شاہ عبدالعظیم کے مقبرے میں سیّد نے پناہ لی اور سات مہینے تک وہیں رہے۔ ملک کے قدیم روایات نے شاہ کی درازدستی سے انھیں وہاں محفوظ رکھا۔

سیّد نے اب علانیہ شاہ کی مخالفت شروع کی اور اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے سے اسے نااہل قرار دیکر یہ رائے ظاہر کی کہ شاہ کو معزول کردینا چاہیئے ان کے بہت سے معتقدین جمع ہوگئے جنمیں شیخ علی قزوینی قاضی عدلیہ اور مرزا آغا خان

خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخر کار سید ان لوگوں کے ساتھ قسطنطنیہ گئے۔ جہاں سے انھوں نے ایک انقلابی رسالہ موسوم بہ اختر جاری کیا اور اسکی بہت سی کاپیاں تقسیم کے لئے ایران بھیجیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا رضا کرمانی نے ناصر الدین شاہ کو گولی سے ہلاک کر دیا۔

شاہ عبد العظیم کے مقبرے میں سید کی پناہ گزینی کے زمانہ ہی میں ان کی مخالفانہ تحریروں اور تقریروں سے شاہ اس قدر برہم ہوا کہ اس مقبرے میں کسیکو ایذا و تکلیف نہ پہونچانے کی روایات کے خلاف حکم دیدیا کہ پانچسو سواروں کا ایک دستہ سید جمال الدین کو وہاں سے گھسیٹ کر لے آئے۔ یہ بیچارے اسوقت غلبۂ مرض کی وجہ سے صاحب فراش تھے۔ لیکن اسکی کچھ پروا نہ کیگئی اور ان کو وہاں سے نکال کے ترکی سرحد تک پہنچا دیا۔

جمال الدین جیسے عالم متبحر کے ساتھ ایسے بیرحمانہ برتاؤ نے تمام علما اور سید کے معتقدوں کو ایسا مشتعل کر دیا کہ یہی روش ناصر الدین شاہ کی ہلاکت کا باعث ہوئی سید قسطنطنیہ سے لندن پہونچے اور وہاں انھوں نے ایران کی ظالمانہ حکومت کے خلاف کھلم کھلا پر زور تقریریں کیں اور سخت مضامین لکھے جو ایران میں بھی پہنچے۔ دو برس تک لندن میں قیام کے بعد وہ پھر قسطنطنیہ چلے آئے اور یہاں سے بھی تقریباً چار سال تک انھوں نے یہی سلسلہ جاری رکھا جو آخر کار اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہا سنہ ۱۸۹۶ء کے آخر میں سید جمال الدین کے جبڑے میں ایک سرطان نکلا۔

جس کا زہر اُن کی گردن تک پھیل گیا اور ۹ رمارچ ۱۸۹۷ء کو انکی شمع حیات ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ بڑے اہتمام اور دھوم دھام سے ان کی تجہیز و تکفین ہوئی اور قبرستان مشائخ میں سپرد لحد کئے گئے۔ گو ترک اس سے انکار کرتے ہیں مگر بعض ایرانیوں کا گمان غالب ہے کہ سید کو زہر اس طرح دیا گیا کہ سلطان کے ایک مصاحب ڈاکٹر ابوالہدیٰ نے ان کے ہونٹ میں نشتر دے کے زہر جسم میں پہونچا دیا جو سرطان کی شکل میں نمایاں ہوا۔

سید جمال الدین کی جلاوطنی سے حالت اور ابتر ہوگئی۔ جو لوگ طرز حکومت سے بیزار ہو چکے تھے وہ ملک چھوڑ کے دوسرے ممالک میں جا بسے اور وہیں سے انھوں نے تحریر و تقریر کے ذریعہ نہج حکمرانی پر سخت حملے شروع کئے۔ مثلاً پرنس ملکم خاں جو شاہ اور وزیر امین السلطنتہ کے ہم خیال و ہمنوا نہ تھے لندن چلے گئے اور وہاں سے ایک ایرانی اخبار قانون کے نام سے جاری کیا۔ تاکہ خفیہ طور پر ایران میں اس کی اشاعت ہو۔

اخبار کے ایک پرچہ میں انھوں نے لکھا کہ:-

ملک ایران چند فرومایہ اور نا اہل لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ حقوق ملک کے حصے بخرے کر کے غیر ملکیوں کے ہاتھ بیچے جا رہے ہیں۔ عہدے اور خطابات گنتی کے چند اوباشوں کے ہاتھ میں بازیچۂ اطفال بنے ہوئے ہیں۔ ہماری فوج پر دنیا ہنستی ہے۔ ہمارے شہزادوں پر

فقیرانہ ترس آتا ہے۔ ہمارے ملاجن کا یہ فرض تھا کہ بادشاہ کی صحیح رہنمائی کرتے خود شاہ کے ہاتھ میں کھلونا بن گئے ہیں۔

ہمارے شہر ہر طرح کی نجاست و کثافت سے آلودہ ہیں۔ ہمارے یہاں کی سڑکیں گاؤں کی پگڈنڈیوں سے بھی بدتر ہیں اور قانون کا تو ملک میں کہیں نام و نشان تک نہیں۔

ایک دوسرے پرچہ میں لکھا کہ :۔

کیا قانون کی رو سے حقوق ملک کو غیروں کے ہاتھ فروخت کرنے کا شاہ کو اختیار حاصل ہے؟ کیا ایران کے سب لوگ مردہ ہو گئے ہیں؟ کیا وہاں کے مردوں نے چوڑیاں پہن لی ہیں؟ اگر واقعی ایسا ہے تو عورتوں کو چاہیئے کہ اپنے شوہروں کو مردانگی کا سبق دیں ان تحریروں اور شاہ کے معاہدہ تمباکو کے خلاف تحریک میں کامیابی سے لوگوں کی ہمت بڑھ گئی اور اب وہ شاہ کو پورا غدار سمجھنے لگے

سنہ ۱۸۹۶ء میں سید جمال الدین کے عقیدت مندوں میں سے مرزا رضا شاہ کرمانی کے ہاتھ سے ناصر الدین شاہ کا خاتمہ ہوا۔ ناصر الدین شاہ میں اپنے پیش روؤں کی سی ستم رانی اور ظلم و جور کی چیرہ دستی نہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ کی سیاسی لغزشوں نے ایران کو متزلزل کر دیا تھا اور یہی نا عاقبت اندیشیاں بڑھتے بڑھتے خود اس کے لئے پیام اجل بن گئیں۔ یہ سب سہی لیکن واقعات کو دقت نظر

سے دیکھنے کے بعد ناصرالدین شاہ کی نیک نیتی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

طہران میں کالج دارالفنون کا قیام اسی تاجدار کی یادگار ہے۔ جس کے حکم سے انگریزی، فرانسیسی، روسی اور جرمنی زبانوں کی تعلیم اور سائنٹفک اصول پر فنون مفیدہ سکھانے کے لئے کالج میں یورپ سے کامل الفن اساتذہ بلا کے مامور کئے گئے تھے۔ جن کے فیضِ تعلیم نے سیکڑوں میں بیداری کی روح پھونک کے انھیں مقتضیاتِ دَور کے سانچے میں ڈھالدیا۔ تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا ہوا۔ موجودہ ضروریات پر متعدد کتابیں لکھی گئیں اور انھیں ترجمے کے ذریعے سے فارسی میں بھی منتقل کردیا گیا۔ ایران کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ناصرالدین شاہ نے مختلف طریقے اختیار کئے۔ سیاحت یورپ میں جو منظر نظر سے گذر چکا تھا شاہی پسندیدگی کی ٹکٹکی ادھر ہی بندھ گئی تھی۔

سیاحت سے پائے تخت واپس آتے ہی شاہ نے ایران کو تمدن یورپ کے سانچے میں ڈھالنا چاہا۔ لیکن آخر عمر میں اس میلان ترقی پر اسکے تاسف کی حد اتنی بڑھی کہ اس نے اپنے امرا کو سفر یورپ سے حکماً روکدیا۔ اس کے نزدیک ٹھیٹ ایرانی کہلانے کا وہی فرد استحقاق رکھتا تھا جو یہ بھی نہ جانتا ہو کہ بروسل کوئی شہر ہے یا کوئی ترکاری اعلےٰ اور متوسط طبقوں کی اولاد امریکی اور برطانوی پادریوں کے مدارس میں تعلیم پارہی تھی۔ برطانیہ اور روس کے معاشی تفوق و برتری کی وجہ سے بہت سے یورپین اپنے خیالات کا سرمایہ لئے ہوئے یہاں آئے اور ملک میں پھیل گئے

مظفر الدین شاہ | ناصر الدین شاہ کا یہ جانشین ہمیشہ کا روگی تھا۔ علالت
کے طولانی سلسلے نے اسے ناکارہ کرکے اسکی خود اعتمادی سلب کر لی تھی۔ اسی لئے
وہ عام انتشار جو ملک میں پھیلتا جا رہا تھا یہ اپنے اسلاف کی طرح کچھ تھوڑا بہت
بھی اسے نہ دبا سکا۔ تخت نشین ہوتے ہی ڈاکٹروں نے معدنی چشموں میں غسل وغیرہ
کے لئے اسے سفر یورپ کی رائے دی۔ اب مشکل یہ آپڑی کہ خزانہ بالکل خالی اور سفر
میں شاہانہ مصارف کے واسطے کافی روپیے کی ضرورت۔ ایک کروڑ پونڈ
قرض لینے کے لئے ایران نے دولتِ برطانیہ کے آگے ہاتھ پھیلایا مگر وہاں سے
جواب صاف ملا۔ اس ناکامی نے روس کی طرف متوجہ کر دیا اور دولتِ روس
سے دو کروڑ دو لاکھ پچاس ہزار ربل (جو روس کا سکہ ہے) کے قرض کی غیر معمولی
رقم پانچ فیصدی سود پر اس طرح ملی کہ فارس و خلیج ایران کو چھوڑ کر اور کروڑ گیری کے
جملہ ذرایع آمدنی اسکی کفالت میں دیدینا پڑے۔ قرضہ کی ادائی پچھتر سال میں ٹھہری
اسکے علاوہ روس سے بھی یہ خواہش کیگئی کہ امپیریل بنک ایران کو پانچ
لاکھ پونڈ دیدیے جائیں۔ یہ وہ رقم تھی جو ناصر الدین شاہ کو تمباکو کا اجارہ فسخ کرتے وقت
تاوان کے طور پر کمپنی کو دینا پڑی تھی۔ روس اس طرح قرض دیکر پورے ایران پر چھا گیا
اور چنگی کے سارے محصول خانے ان بلجین عہدہ داروں کے قبضہ میں آگئے جو روس
کی طرف سے کارپرداز مقرر کیے گئے تھے۔ پھر یہ انتظام تھوڑے عرصہ کے لئے نہ تھا
بلکہ قرض کی پوری رقم اور سود کی ادائی کے لئے پورے پچھتر برس کی طولانی مدت

طے کی گئی تھی۔ بلجین افسروں نے شرح محصول پر نظر ثانی کر کے روز مرّہ کی ضروریات جیسے گوشت، روٹی، مسکہ وغیرہ وغیرہ پر بھی بھاری محصول لگا دیا۔ یورپ سے واپسی کے بعد شاہ نے پھر سفر یورپ کا ارادہ کیا۔ روپیہ کی پھر ضرورت پیش آئی اور سنہ ۱۹۰۱ء میں یہ پھر روپیہ قرض لیکے سیدھا یورپ پہنچا۔

گیارھواں باب

باقاعدہ تحریکِ انقلاب کی ابتدا

سنہ ۱۹۰۱ء

اِسی سنہ سے ایران کی مصیبت اور تباہی کا آغاز ہوا، اور سارے ملک میں انقلابی تحریک پھیلنے لگی۔ اُس وقت سے ابتک غیر معمولی دِقّتوں اور دشواریوں کے پیش آنے پر بھی ہر قسم کی ترقی و اصلاحات کی ترویج تاریخ ایران کا ایک اہم باب ہے۔ ایرانیوں میں قوت تحمّل بدرجہ اتم موجود ہے، میدانِ حیات میں دوڑتے وقت وہ علائق دنیوی کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور ان بندشوں، مزاحمتوں سے کتراکے صاف نکل جاتے ہیں۔ ماحول وگرد وپیش کی نباضی یہی وہ معیار ہے جس پر یہ ہر چیز کو جانچتے اور پرتالتے ہیں، وہ ہر قسم کے رنج وراحت کو لازمۂ حیات سمجھکر اُس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

اُن کے ہاتھ سے مصائب میں دامن صبر کبھی نہیں چھوٹتا۔ یہ ہمیشہ موقع

کے منتظر رہتے ہیں۔ ان کا ظاہری لاابالی پن عامیانہ اور احمقانہ "تن بتقدیر" کے عقیدے کا ہرگز مرادف نہیں۔ ان کے صبر و شکیب کی آڑ میں وہ عزم بالجزم اور طاقت و توانائی چھپی رہتی ہے کہ جو موقع پاتے ہی شکست کے خارزار کو فتح و ظفر کا گلزار بنا دیتی ہے، انھیں اپنی موقع شناسی، وقت کی نبّاضی اور طاقتِ مردانگی و جوانمردی پر پورا بھروسہ ہے۔ عموماً ان کی سست رفتاری زیادہ تر دور بینی و مآل اندیشی پر مبنی ہوا کرتی ہے نہ کہ جبلّی بزدلی اور کاہلی پر ان کا احساس موقع شناسی جب اجازت دیتا ہے تو پھر یہ نہیں چوکتے اور ان کا ولولہ اقدام ابروباد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ناصر الدین شاہ کا کام تمام کرنے میں انھیں جو کامیابی ہوئی اس سے ان کے حوصلے اتنے بڑھ گئے کہ آئندہ کی سعی و کوشش کے مظاہروں کے یہ خواب دیکھنے لگے، اپنی رہبری کے لیے انھیں سچے رہنماؤں کی ضرورت تھی، دنیا کا یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی بڑی تحریک اٹھائی جاتی ہے تو آگے بڑھ کر اسے کامیاب بنانے کے لیے بڑے بڑے لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ شرح محصول کی نظرثانی کے بعد ایران کے کل اشیاء درآمد پر بلجین عہدہ داروں کے بھاری محصول لگانے سے رعایا میں عام برہمی پھیل گئی۔

تجار محصول خانوں کے عہدہ داران کی عدول حکمی پر تل گئے۔ اور بندر بوشہر پر اپنا مال چھڑانے سے صاف انکار کر کے آئندہ مال نہ بھیجنے کی نسبت

ہندوستان کو تار دے دیے۔ کربلائے معلّٰی، نجف اشرف کے مجتہدین نے شاہ کو ایک سخت تحریر بھیجکر تنبیہ اور غیر سلطنتوں کے ہاتھ میں ملک دے دینے پر بہت ملامت کی، انھوں نے اس امر کا اظہار کر دیا کہ ایسی صورت میں زمام اختیار شاہ کے دست اقتدار میں نہیں رہ سکتی۔ سنہ ۱۹۰۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۰۶ء تک ملک میں بالکل امن نہ تھا۔ بڑے بڑے حادثات و انقلابات ایران میں رونما ہونیوالے تھے، سارے ملک میں انقلابی تحریکوں کے رسالے اور اشتہار تقسیم ہونے لگے اور فری میسن لاجوں کی طرح متعدد خفیہ انجمنیں قائم ہو گئیں، ایران سے باہر قومی اخباروں میں شاہ اور حکومت کے متعلق سخت مضامین نکلے اور یہ اخبار ملک میں مفت تقسیم کرائے گئے۔

لندن سے اخبار اختر، کلکتہ سے اخبار حبل المتین اور قاہرہ سے اخبار حکمت نے اپنے پُرزور جوشیلے مضامین سے ملک میں آگ لگا دی اور بڑی ہلچل ڈال دی اگرچہ شاہ نے اس طرح کے انسدادی طریقے بہت کچھ اختیار کیے۔ جیسے منظر عام پر تاجروں اور مُلّاؤں کو پٹوایا، جن متعدد افراد، مذہبی پیشوا اور تعلیم یافتہ اشخاص کے پاس سے انقلابی تحریریں برآمد ہوئیں وہ گرفتار کر لیے گئے، ملک کی معزز اور ہر دلعزیز ہستیاں پا بزنجیر کر کے مقید کر دی گئیں، مگر اس طرز عمل سے یہ آگ اور بھڑک اٹھی، انجام یہ ہوا کہ حکومت کی گرفت تدریجاً ڈھیلی پڑی اور وہ مصلحین ملک جو شاہ کی نظر میں باغیانہ حیثیت رکھتے تھے اقتدار شاہی سے باہر ہو گئے۔

حکومت کی ستم شعاری سے ایرانیوں کا پیمانۂ صبر اگرچہ لبریز ہو چکا تھا، لیکن ان کی کوششیں نہایت سنجیدگی کے ساتھ برابر جاری رہیں۔ اُنھوں نے جو مصائب جھیلے، تکلیفیں اُٹھائیں، اور آئندہ بھی اسی طرح کا بھاری بوجھ اُٹھانے کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ سب اس لیے کہ ملک کے نقارۂ احتجاج کی بلند آہنگیاں بہ گوشِ دل سُن رہے تھے۔ ان کا نصب العین معین ہو چکا تھا، انھوں نے اپنے پورے منصوبوں اور تدبیروں کی تکمیل کر لی تھی، اب دستوری حکومت کے سوا اور کوئی چیز ان کو مطمئن نہیں کر سکتی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں تقریباً (۱۶) ہزار ایرانیوں کا ٹڈی دل سفارت خانۂ برطانیہ میں پناہ گزیں ہوا اور سلطنت سے مطالبہ کیا کہ قیامِ حکومت دستوری اور عین الدولہ کی برطرفی، جب تک ہمارے یہ دونوں مطالبے پورے نہ ہوں گے اُس وقت تک ہم یہاں سے ہرگز جنبش نہ کرینگے۔

عدم تشدد کے ہتیاروں سے ایسی لڑائی مسٹر گاندھی کی ستیاگرہ کے مماثل تھی، ملک کے مروجہ قانون کی رو سے اگر ایک یا چند اشخاص کسی مسجد یا معبد یا کسی بڑے مقتدر کے یہاں پناہ لیں تو اُن پر ہاتھ ڈالنا غیر ممکن تھا، ایران میں اس طرح پناہ لینے کو (بست) کہتے ہیں۔ سفارت خانۂ برطانیہ میں پناہ گزینوں پر کچھ بس نہ چل سکنے سے سطوت شاہی کی سُبکی پھر یہ ڈر بھی کہ کہیں یہ چنگاری شعلہ بن کے اقتدار سلطنت کو خاکستر نہ کر دے۔ انہی باتوں سے مجبور ہو کر عین الدولہ کی برطرفی کے ساتھ رعایا کے حسبِ خواہش

۹۰

شاہ کو دستوری حکومت کے قیام کی منظوری دینا پڑی۔

بارھواں باب

دستوری حکومت کا قیام

سنہ ۱۹۰۶ء

چنانچہ اس طرح بغیر کسی کی نکسیر پھوٹے باقاعدہ دستوری حکومت کے قیام نے شاہان ایران کی صدیوں کی مطلق العنانی کا خاتمہ کر دیا، اہل ملک کو اس عدم تشدد کے ساتھ پیش قدمی کی قدر و قیمت معلوم ہوئی، اور جلد تر اُصول انتخاب معیّن کر کے درستی و اصلاح ملک کی جانب سب کے سب جھک پڑے۔

اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء میں ایران کے کل صوبوں کے نمائندے منتخب ہو کر آئے اور پہلی دستوری مجلس شوریٰ کا افتتاح ہوا، سلطنت کی طرف سے خطبہ افتتاحیہ پڑھنے کے بعد دستوری حکومت کے اختیارات کا اعلان کیا گیا، اس اعلان کا ایک عجیب و غریب اثر یہ ہوا کہ تمام ملک میں صحافت کے فروغ سے متعدد اخبارات جاری ہو گئے، سنہ ۱۹۰۷ء میں ایران سے چھپ کر شایع ہونے والے کل اخباروں

کی تعداد نوّے ۹۰ تک پہونچ گئی، قومی اخباروں مثلاً صور اسرافیل، مساوات، مجلس، فدائے وطن، تمدن وغیرہ میں مختلف سیاسی طبقوں کی طرف سے شاہ کی ذہنیت قوم فروشی کی روک تھام کے ساتھ مجلس کی کارروائیوں کی بھی نگرانی کی گئی مظفرالدین شاہ سے بدقت تمام دستوری حکومت کا پروانہ حاصل کیا گیا، ابتداءً یہ تشویش پیدا ہو چکی تھی کہ نہ جانے اراکین جدید نئی مجلس شوریٰ کی کیا گت بنائیں اور اسے کس سانچے میں ڈھال دیں، اسی لیے مختلف صوبوں کے منتخب نمائندوں کی طرف عوام نظر دوختہ تھے۔

خفیہ انجمنیں بدستور اپنا کام کر رہی تھیں، ایرانیوں کا اپنے معاشرتی اصلاح کی طرف مائل ہونا اُس زمانے کی قابل لحاظ بات تھی، وہ وطن پرست جنھوں نے عہد سابق میں جان و مال کے خوف سے دوسرے ممالک میں جاکر پوری آزادی سے اخبارات جاری کئے تھے، ہوا کا بدلا ہوا رُخ دیکھ کر ایران پلٹ آئے، اور یہاں آتے ہی ملک میں مغربی خیالات پھیلانے لگے۔

پرنس ملکم خاں کا لندن سے جاری کیا ہوا اخبار اختر اور سید حسن تقی زادے کا اخبار کاوا یہ دونوں کے دونوں مغربیت کے بڑے حامی تھے، اخبار کاوا کے ایک خاص مضمون کا درج ذیل ترجمہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ نوجوانان ایران مغربی تہذیب کی طرف کس درجہ مائل تھے۔

"ایران کو تعصب کے خس و خاشاک سے صاف کرکے اس میں

مغربی تہذیب کی اشاعت کرنا ہمارا مقصد اولیں ہے، پھر اتحاد و احساس قومی کی کوشش حفاظت اور اُس کی ترقی کی جد و جہد کرنا اپنی زبان و ادب کو خالص کر کے ان خطرات سے محفوظ رکھنا جو اس کے خرابی کے درپے ہیں۔"

وہ داخلی اور خارجی آزادی جو ہمارا نصب العین ہے تین طرح سے حاصل ہو سکتی ہے، پہلے تو ہم کو یہ چاہیے کہ ہمہ تن یورپین تہذیب کے مقلد بن کر وہاں کے رسم و رواج تعلیم و تربیت عادات و خصائل تنظیم علوم و فنون سے بیدرنگ استفادہ کریں اور فوراً اُس پر کاربند ہوں۔

دوسرے ایرانی زبان و ادب کے تحفظ و ترقی کی طرف توجہ تام مبذول کی جائے، تیسرے عام تعلیم کے لیے پورے ملک میں مدارس اور کالج قائم کیے جائیں تاکہ یورپین علوم و فنون سے ملک کا ہر طبقہ مستفید ہو سکے، اور بیرونی و اندرونی جسمانی و روحانی جملہ حیثیتوں سے ایران دوسرا یورپ بن جائے، ملک کے لیے اس قسم کی بہترین خدمت انجام دینے کا طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ مغرب کی مشہور و معروف کتابوں کا سلیس اور شستہ ایرانی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔

مؤخر الذکر تجویز پر فوراً عمل ہوا اور حاجی محمد حسن خان اعتماد السلطنت کی سرپرستی میں ادیبوں کی ایک انجمن قائم کی گئی، جس نے بہت سی مغربی زبانوں کی کتابیں فارسی میں ترجمہ کر ڈالیں، ایران میں جو اخبارات جاری ہوئے اُن میں حب الوطن من الایمان

احتیاج اور تلقین نامہ، بہت مشہور ہوئے، کم و بیش ان سب کا نہج و طرز تحریر ایک ہی سا تھا، سارے ملک میں ہلچل پڑی، انقلاب زندہ باد کا نعرہ چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب کے زباں زد ہوگیا، ادبا نے اپنا قدیم طرز تحریر بدل دیا، شعرا اور نثّار امرا کی مدح و ثنا میں قصائد لکھنے کے بجائے اپنی ساری سرگرمی پُر اثر جوشیلی قومی نظموں میں صرف کرنے لگے، اور ایسے سیاسی رسالے نکالے جو انقلابی تحریکوں کے اہم مضامین سے لبریز ہوتے تھے۔

تیرھواں باب

اُس زمانے کے اہل قلم کی تحریروں کے نمونے

عشقی ہمدانی نے جو بڑا محب وطن تھا ایک ایسا سیاسی ڈرامہ لکھا جو بلحاظِ نوعیت فارسی زبان میں پہلا اور اکیلا شمار کیا جاتا تھا، یہ ڈرامہ ایران میں دو دفعہ دکھلایا گیا، جسے دیکھ کر حاضرین بے اختیار رونے لگے، بیچارہ عشقی تو کسی غیر ذمہ دار قدامت پسند کے ہاتھ سے مارا گیا لیکن اس کے ڈرامے نے ملک پر جادو سا کر دیا اور گویا یہ ڈرامہ ایک ایسا آئینہ تھا جس میں ایران نے اپنی پستی ہیچمپرزی دیکھ کر ترقی کی شاہراہ اختیار کی، اسکا فوری اثر تو یہ ہوا کہ فدائیان ملک نوجوانوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی۔

ڈرامہ کا نام خواب عشقی یا روز قیامت کا عجیب و غریب منظر تھا، اس ڈرامہ کے خاص خاص اداکار یہ تھے۔

خسرو دخت، دخترِ نوشیرواں، دارا، افراسیاب، نوشیرواں، خسرو پرویز، شیریں ملکۂ ایران، زردشت اور خود عشقی۔ ڈرامہ کا پہلا سین مدائن میں شروع ہوتا ہے جو ایران کا کبھی نہایت بارونق اور مشہور شہر تھا، مگر اب کھنڈر بن گیا ہے، اس طرح ڈرامہ شروع ہوتا ہے کہ عشقی خواب میں اپنے آپ کو مدائن میں دیکھتا ہے، مدائن جو کسی زمانے میں ساسانیوں کی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا ایسی تباہی اور ویرانگی کی حالت میں دیکھ کر عشقی کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور متاسفانہ انداز میں یہ کہتا ہے۔

اے خدا ! میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں ؟ یہ شکستہ دروازے، منہدم در و دیوار اور یہ بلند ستون کیا کہہ رہے ہیں ؟ کیا یہی وہ جگہ ہے جو ملک ایران کی تاریخی شان و شوکت کی جلوہ گاہ تھی ؟ کیا یہی وہ سرزمین ہے جہاں ساسانی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے دریائے مواج کا خروش دیدنی تھا، ہائے افسوس! صد ہزار افسوس! کبھی تو ایرانیوں کی سطوت و صولت، عظمت و جبروت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، جس نے اس شہر کو بقعۂ نور بنا دیا تھا، اور آج اُن ہی کی اولاد ہے جس کی تیرہ خیالی و ناتواں بینی، کمزوری و پستی، غرور و جہالت سے یہ جگہ تباہی و بربادی کا جگر خراش منظر بن گئی ہے، اے مدائن کے اجڑے ہوئے فرسودہ قصرو ! کیا تم ہماری شان و شکوہ رفتہ کا پتہ دے کر ہمیں عرق انفعال سے نہلا رہے ہو ؟ اُف ! میرے ساتھیو مجھے سنبھالو، ارے یہ دل بیٹھا جا رہا ہے، میری آنکھیں خون کے

آنسو بہا رہی ہیں، ہماری عظمت گزشتہ اور ذلت سے لبریز پستی موجودہ میں کیسا تفاوت ہے۔

عشقی اپنے احساس پستی سے بیخود ہو کر وہیں زمین پر غش کھا کے گر پڑتا ہے اتنے میں ایک کمسن شہزادی آہستہ آہستہ خلوت کدۂ قبر سے اُٹھ کر یہ کہتی ہوئی سامنے آتی ہے " ہائیں یہ کیا؟ خدایا! میں کہاں ہوں؟ یہ ویرانہ تو ایران میں کبھی نہیں ہوسکتا، کجا یہ بھیانک سنسان ویرانہ کجا عظمت کدۂ ایران کا فلک شکوہ آستانہ! اے ایران کی گونگی، بہری، چلتی پھرتی مردہ مخلوق! بتا کہ ایران کہاں ہے؟ ارے میں دختر نوشیرواں ہوں، ہائے! تمھاری بزدلی و نامردی نے مجھے گوشۂ قبر میں بھی چین نہ لینے دیا اور بےچین کر کے اٹھا دیا، میری زندگی میں تو یہ تختۂ زمین رشک فردوس بریں تھا!

شاخ گل زمزمہ سنجوں کی نشیمن تھی مُدام
اُرغنوں وار جہاں گونجتی تھی صوتِ ہزار
شاخیں بے برگ ہوئیں ٹوٹی پڑی ہیں روشیں
خاک اُڑتی ہے گلستاں میں پڑے ہیں خس و خار
گھونسلے سقف میں لاکھوں ہیں ابابیلوں کے
مسکن فاختہ ہے قصر کا ہر نقش و نگار

قسم بہ یزداں اس ملک کی کبھی ایسی عبرتناک حالت ہرگز نہ تھی، آہ!

ایران تجھے یہ کیا ہوگیا! تجھے کس کی نظر کھا گئی، ایران کے نوخیز و نوجوانو کیسی غفلت کی نیند سو رہے ہو! اے تاجدارانِ ایران تم کہاں ہو؟ ذرا آؤ اور اپنے ملک کی زبوں حالی دیکھو، بابا! بابا اپنی آخری آرامگاہ سے اُٹھ کر اپنے ملک کو ایک نظر دیکھ تو لو، ایرانیوں پر کیسی مردنی چھائی ہوئی ہے، ان کی زندگی کی رگیں کیسی خشک ہوگئی ہیں، ذرا دیکھو تو کیا یہ وہی فردوس نشاں ایران ہے یا نکبت و نحوست کا مکان خرابۂ قبرستان، اے سرزمین ایران کے ناخلفو اے جہل ونادانی، پست ہمتی و نافرمانی کے مجسمو! خدا کے لیے ہم جیسی خواتین ایران کا کچھ تو پاس کرو، اپنے عالم افروز و جہاں ستاں اسلاف کے شہرۂ آفاق کارناموں کی تو آج لاج رکھ لو"

اس کے بعد سیروس کنج مزار سے اُٹھ کر چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتا ہے اور ایک آہ سرد بھر کر سر جھکا لیتا ہے، اور پھر رُک رُک کے کہتا ہے کہ " افسوس! آج ندامت تو سر اُٹھانے نہیں دیتی، ان سلاطین کے سامنے میں شرم سے گڑا جاتا ہوں جو میرے دور حکومت میں تخت شاہی کے سامنے قیدیوں کی حیثیت سے پیش کیے گئے تھے وہی اب میری تضحیک پر آمادہ ہیں اور مضحکہ کے طور پر کہہ رہے ہیں کہ "حضور! جہاں پناہ کی ہیبت نے ہمیں تو رسن بستہ کر کے ڈال دیا تھا مگر اب ذرا اپنی رعایائے ملک کی منزلت و برتری تو ملاحظہ فرمایئے کہ وہ سب کی سب کس شان سے پا بزنجیر ہے۔

پھر دارا خواب مرگ سے چونک کر یہ کہتا ہوا اُٹھتا ہے "حیف! صد حیف!

میں نے دُنیا چھوڑتے وقت اپنے نااہل جانشینوں کی فرمانروائی کے لیے جو نصف عالم چھوڑا تھا وہ سب اغیار دبا بیٹھے، میرے گیتی ستاں نبرد آزماؤ! پُرجگرو! منچلو! سُورماؤ! دُنیا کو متزلزل کر دینے والوں میں سے کیا آج ایک متنفس بھی باقی نہیں؟"

اس کے بعد نوشیرواں اپنے مرقد سے نکل کر یہ کہتا ہے کہ:۔

اے بہادر زا سرزمین ایران تیرے سورماؤں کی للکار سے کبھی تمام دُنیا لرزہ براندام ھی آج تو کن بے حمیت بزدلوں اور نااہل روباہوں کی بستی بن گئی؟"

پھر خسرو آغوشِ لحد سے باہر آکر کہتا ہے کہ "اے ایرانیو! میں کیا کہوں؟ ارے تم زندہ ہو یا کہ سب مر گئے؟ میں نہیں جانتا کہ تم باوقار آقا ہو یا بدشعار غلام اے اہلِ مُلک کیا اسی کا نام زندگی ہے جو تم گزار رہے ہو؟ ایسی زندگی سے موت کہیں بہتر ہے، کمبختو تم ننگ اسلاف ہو، دُنیا تمہارا مضحکہ اڑا رہی ہے":

"ازمنہ گزشتہ سے پوچھ لو عالم میں ہماری کیسی دھاک تھی اور پوری دُنیا ہمارا لوہا مان کے کیسی سرنگوں ہوگئی تھی، ذلیلو تمہارے کرتوت نے ہماری برتری و سربلندی سب خاک میں ملا دی اور جس دُنیا کو ہم نے سرنگوں کر دیا تھا اسی کے آگے تمہاری بدبختیوں اور تن آسانیوں نے ہمارے سرِ افتخار کو جھکا دیا۔ حالت تو یہ ہے کہ اقتدار سلطنت مجروح ہو چکا، ملک دم توڑ رہا ہے مگر تمہیں اس کی کچھ پروا نہیں، کیا رگ حمیت میں غیرت کے خون کی ایک بوند بھی باقی نہیں رہی":

دفعتہً شیریں ماتمی لباس پہنے حجاب تربت سے برآمد ہو کر کہتی ہے کہ:۔

اے عہدِ تقدس وجلالت ایران، اے شیریں کے سقط الراس تیرے تخت و دیہیم آج کہاں ہیں؟ وہ انمول جواہر کیا ہوئے جو میرے سرتاج (یعنی شوہر) کا سرمایۂ نازش تھے؟ ہمارے جانباز سرفروش منچلے اوپچی کدھر ہیں؟ ہمارے فاتح عالم سلاطین تاجور اور اُن کے وزراے خرد گستر کہاں چلے گئے؟ ارے میں ملکۂ ایران شیریں ہوں، اے نامور اسلاف کے گمنام و نااہل فرزندو! تم نے اپنے آبا و اجداد کا نام ڈبو دیا، تم میں احساس غیرت کا نام تک نہیں، میری ہڈیوں کو دشمنوں سے پامال کرا کے تمھیں چین آیا۔"

"اُٹھو اے ایران کے سلاطین سلف اُٹھو، دیکھو ملک پر کیسی آ بنی ہے تمھارے فرومایہ ناخلف غدار جانشینوں کے کمزور و ناتواں بازو ملک کو تھام نہیں سکتے اور ہمارے تفوق و منزلت، شان و شکوہ کا جنم بھوم ہاتھ سے نکلا چلا جارہا ہے، دغاباز ایرانیوں کے دل میں اپنی مادر وطن کی پرمگس کے برابر بھی محبت باقی نہیں، ایسے مصیبت کے وقت میں آؤ ہم سب مل کر اپنے محترم پیشوا پیغمبر زردشت سے امداد و استعانت کی گڑگڑا کے التجا کریں۔"

یہ سُنتے ہی تمام سلاطین ایران اپنی اپنی پُرسکون خوابگاہوں سے نکل کے دونوں ہاتھ اُٹھا کے زردشت کی جناب میں یہ دعا مانگتے ہیں:۔

"اے بزرگ و مقدس زردشت! ہمارا سفینۂ عظمت و اقتدار گرداب بلا میں پھنس کر ڈوبنے کو ہے، تشریف لا کر ہماری مدد فرمایئے، ہمارے زمانہ

میں چپہ چپہ برابر زمین بھی ایران میں ویران نہ تھی اور آج تمام ملک ویرانے سے بدتر ہو گیا۔"

"ہمارے جاہ وجلال، حشمت و اقبال کی یادگار وہ سرزمین جسے ہم نے بزور شمشیر نصرت گیر فتح کر کے انصاف و معدلت کے سایے میں بسایا اور آباد کیا تھا، آج ظلم و بیداد کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو رہی ہے۔"

ان سب کے مل کر دعا مانگنے سے نورانی سفید لباس میں زردشت جس کے سفید سفید بال کمر تک مقیش کے تاروں کی طرح لٹکے ہوئے ہیں جلوہ نما ہو کے کہتا ہے کہ:۔

"میں نے تمھیں بہت سی اہم نصیحتیں کیں، تم کو صراط مستقیم کی ہدایت کی گئی، شیریں زبانی، نکوکاری، نیک نیتی و خوش اخلاقی کو تمھاری بہبودی و خوش حالی کا سبب بتایا، تم نے میری ایک نہ سُنی، اب اسی کا خمیازہ بھگت رہے ہو تم نے اپنے گیتی نورد، فاتح عالم اسلاف کی روحوں کو بےچین اور بسمل کر دیا ہے، تم سے ان کی انتہائی بیزاری حق بجانب ہے، اپنے ملک کی تباہی بربادی اور اپنے آبا و اجداد کی برتری کو خاک میں ملانے کی ذمہ داری تمھیں پر عائد ہوتی ہے"

"اے بزدلو، نابکار و دشمنوں کو دیکھتے ہی تمھارے زہرے آب ہوئے جاتے ہیں اور تم میں تلوار سونتنے کی بھی سکت نہیں، مغرب میں ایران کے پیچھے ایک ہنگامہ بپا ہے، ایک سلطنت اسے اپنا بتاتی ہے اور دوسری اپنا، تمھارے

ملکوں پر قبضہ پانے کے لیے مغرب میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں، یورپ نے ایشیا کو ایک لقمۂ تر سمجھ لیا ہے جسے آسانی سے نگلنے کے لیے چھری کانٹے ہاتھوں میں لیلیے گئے ہیں۔"

"یورپ والے وہ دن بھول گئے جب مغرب درس روحانیت لینے کیلیے مشرق کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیے ہوئے تھا، ایک کوہ بلند کو اپنی خامکاری سے منہ کا نوالا سمجھ لینا ممکن ہے لیکن اتنے بڑے نوالے کو فرو کرنا اور حلق سے اُتارنا ناممکن ہی نہیں بلکہ محال ہے۔"

"آفتاب عالمتاب کی ضیا بار و نور گستر کرنیں پہلے بھی دریچۂ مشرق سے نکلتی تھیں اور اب بھی، مغرب بیدار ہے اسلیے کہ مشرق سو رہا ہے مگر یہ مشرقی نیند ہمیشہ نہیں رہ سکتی، اس خواب غفلت سے بیداری لازمی ہے، اور جب یہ بیداری کی انگڑائیاں لیتا ہوا اُٹھے گا تو مغرب کی طرح گھر والوں کو بے گھر اور خاں وماں بناکے تباہ و برباد کرنے کے لیے نہیں بلکہ یہ بنی نوع انسان کی خوشحالی و بہبودی کا بیڑا اُٹھائے ہوئے اقتدار کی بلندی پر جلوہ افروز ہوگا۔"

وہ یہی کہہ رہا تھا کہ اتنے میں آسمان سے ایک مرصع گہوارہ آہستہ آہستہ اُترتا دکھائی دیا، جس میں ایک خوبصورت بچہ ایرانی جھنڈا اپنے ننھے ہاتھوں میں لیے ہلا رہا تھا، زردشت نے اس کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ "غور سے دیکھو! اس گہوارے میں وہ ہستیاں زیر پرورش ہیں جو ایران کو پہلا سا ایران بنا دینگی اور یہی اُن اولوالعزم ان کجکلاہوں کی حقیقی جانشینی کے فرائض ادا کریں گی جنھیں موجودہ

نسل کی تغافل شعاری نے شرمسار کر دیا ہے"۔

"اسی گہوارے سے وہ نوجوان اُٹھیں گے جو ضعیف و کمزور ایران کو پھر از سرِ نو طاقتور و قوی بازد بنا دینگے، یاد رکھو ایران کبھی پسپا نہیں ہو سکتا اور سر زمین سیروس کا خدم و حشم صفحہ دہر سے کبھی مٹ نہیں سکتا، ظالم اہرمن مغلوب ہو چکا اب تائید و نصرت یزداں تمہاری استعانت کے لیے آمادہ ہے اسی پر بھروسہ رکھو اور توفیق امور خیر کے متوقع رہو، تمہارے لیے میں دست بدعا ہوں کہ توفیق خیر تمہاری رفیق اور فیروزی و کامرانی تمہاری ندیم رہے اچھا اب میں اپنی ابدی آرامگاہ کو واپس جاتا ہوں"۔

اتنے میں عشقی یہ خواب دیکھ کر اُٹھتا ہے اور حیرت و استعجاب سے کہتا ہے کہ یا اللہ! میں نے جو کچھ دیکھا کیا یہ خواب تھا یا حقیقت؟ اُف! اُف! ہماری زبوں حالی و پستی اب اس حد تک پہنچ گئی کہ ہمارے آبا و اجداد کی مقدس روحیں بھی کبیدہ خاطری اور افسردگی کی تکلیف میں مبتلا ہیں، خدایا! تو ہماری مدد کر اور زردشت نے ہم سے جو وعدہ کیا ہے اُسے پورا فرما، عشقی نے تو ایک خواب ہی دیکھا ہے، تیری تائید و رحمت شامل حال ہو تو ہم اس کو سچا کر دکھائیں"۔

اسی زمانے کے دوسرے مشہور شاعر قزوینی ہوے جن کا کلیات حال ہی میں بمقام برلن طبع ہوا ہے ان کے طرز تحریر میں بھی عشقی کا انداز ہے، ان کی

قومی نظموں اور تقریروں نے ملک کو متاثر کرنے میں بڑا حصہ لیا اور یہی وجہ تھی کہ ان کے نتیجۂ دست وقلم کو حُسنِ قبول نے ہاتھوں ہاتھ لے کر تمام ملک میں پھیلا دیا۔

ایک اور صاحب ڈاکٹر شفق نامی اس دَور کے بڑے ادیب تھے، ملک ایران کو مغربی خیال آفرینیوں سے روشناس کرنے کی ان کی سعی وکوشش بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی، آجکل وہ دانش سرائے علی طہران میں فلسفہ کے نہایت مستعد پروفیسر ہیں کئی دفعہ ان سے ملنے کا اتفاق ہوا اور اُنھوں نے ہر مرتبہ مجھ سے اپنے ہمعصروں کی تو بہت تعریف وتوصیف کی لیکن اپنے متعلق ایک لفظ تک نہیں کہا۔"

عارف قزوینی کا کلیات زیرِ مطالعہ تھا کہ ڈاکٹر شفق کی وہ بہترین تقریر جو موصوف نے پچیس برس پہلے دار الفنون طہران میں کی تھی نظر سے گزری اُس کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ موصوف الصدر نے ایران کی توجہ کو مغربی چمن زار کی طرف منعطف کرنے کیلئے کیا کیا جتن کیئے۔ ان کی اسپیچ کا لفظی ترجمہ درج ذیل ہے:۔

"یاد رکھو کہ ہماری زندگی دور ترقی کی شاہراہ سے گزر رہی ہے تمام دُنیا ہم سے آگے ہے صرف ایرانی ہی سب کے پیچھے ٹھوکریں کھا رہے ہیں، قافلہ جا چکا اور ہم ابھی تک دشت میں بھٹکتے پھرتے ہیں، اہلِ مغرب کس سُرعت وتعجیل سے آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں، اُنھوں نے ریلیں، موٹریں، عقاب کی طرح اُڑنے کے لیے طیارے ایجاد کیئے ہیں، مگر ہم ہیں کہ اپنے گدھوں، خچروں، گھوڑوں

اور اونٹوں پر قناعت کیے بیٹھے ہیں۔"

پروفیسر براؤن نے اپنی عنایت سے ہمارے خچروں کی بہت تعریف کی جنھوں نے اُن کو ملک کے ایک حصّے سے دوسرے حصہ تک بآرام پہونچا دیا، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم کو ریل یا موٹر کار کی ضرورت نہیں، ہم کو رفتارِ زمانہ کے ساتھ چلنا ضروری ہے، مغرب نے اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں آزادیٔ خیال کی روح پھونک دی ہے، ہمارے دماغوں میں جمود کے قفل لگے ہوئے ہیں، اور ہم اسی مقام پر ہیں جہاں پانچسو برس پہلے تھے۔

مغرب نے عجائبات کا انبار لگا کے اپنے دَور کو دورِ ایجادات وتحقیقات بنا دیا ہے، وہ دنیا کی نئی معلومات حاصل کرنے میں شب و روز منہمک ہیں، ہم ان چیزوں کو استعمال کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے جو انھوں نے ہمارے آرام وآسائش کے لیے ایجاد کی ہیں، ہم معاشرتی امراض میں مبتلا ہیں۔"

" ہمیں چاہیے کہ جلد سے جلد اپنی ناگفتہ بہ حالت کی درستی واصلاح کیلیے مؤثر تدابیر اختیار کریں اور اسکی صرف ایک ہی صورت ہے کہ قدامت پسندی کو خیرباد کہہ کر تہذیب یورپ کی پیروی کی جائے، اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اپنی مشرقیت کو بالکل بھلا دیں، بلکہ بغیر اپنی اجتماعی حیثیت کو کھوئے ہوئے ان کے معاشرتی محاسن کو اخذ کریں، چھری کانٹے سے کھانا کھانے میں کوئی برائی نہیں ہاں سور کے گوشت کو ہاتھ نہ لگانا چاہیے۔"

اپنے ماحول کو بدل کے ہمیں انھیں کے قدم بقدم چلنے کی ضرورت ہے۔ ہماری زندگی کا ہر شعبہ تغیر چاہتا ہے، ہمارا شخصی حکومت کو دستوری حکومت کی شکل میں تبدیل کر دینا یا سیاست میں ہماری ترقی کا ثبوت ضرور ہے، لیکن اسی پر اکتفا زیبا نہیں، سیاسی اور معاشرتی تغیرات یکے بعد دیگرے باہم لازم و ملزوم ہیں، ہماری معاشرتی حیات کا حل محتاج تغیر ہے"۔

"ہمارے ادبی ذوق میں کافی تبدیلی کی ضرورت ہے، یہ زمانہ غزل گوئی اور مثنوی نگاری کا نہیں، سلاطین و امرا کی مدحت گری کے لیے دھوم دھامی قصائد میں تضیع اوقات اب نہیں کی جا سکتی، حافظ، سعدی اور عمر خیام اپنے اپنے وقت میں بڑے پائے کے ادیب تھے، لیکن یہ زمانہ ایسی ہستیوں کو اب قابل التفات نہیں قرار دیتا، اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے زمانے کے سربرآوردہ تھے، جہاں تک وسعت زبان و حسن بیان کا تعلق ہے ہم انھیں مسلم الثبوت اُستاد تسلیم کرتے ہیں، لیکن اب ہمیں ایسی چیزیں درکار ہیں جو ملک کی ترقی کے لیے شہپر کا کام دیں"۔

"جامی کی یوسف زلیخا اور نظامی کی مثنوی خسرو شیریں ضرور اپنے وقت کے قابل قدر کارنامے تھے مگر ضرورت زمانہ کے مدنظر اس قسم کی تصانیف کا خاتمہ ہی ضروری ہے، اس بارہ میں ہمیں یورپ کی تقلید میں اہم حالات و واقعات حاضرہ پر نظم اور نثر میں کتابیں لکھنا چاہئیں، ترقی پذیر معاشرت میں زمانہ

کے نقش قدم پہ چلنے کے بجائے ہمیں آگے بڑھنا چاہیے، موجودہ معاشرت پر مصنفین یورپ ابتک جتنی کتابیں لکھ چکے ہیں اگران کی فہرست مرتب کی جائے تو اسکے لیے کئی جلدیں درکار ہونگی، ہم ابھی تک گل وبلبل ہی پر خامہ فرسائی کرتے رہے اور اُدھر بھولے سے بھی نہ جا سکے جدھر یورپ اپنے گرانمایہ تصانیف کا انبار لگا چکا ہے۔"

"سیکڑوں ایسے نئے اور اچھوتے موضوعات تشنۂ اظہار باقی ہیں جنھیں ہمارے اربابِ قلم نے ابھی تک چھوا بھی نہیں، حالانکہ ان نئے موضوعوں پر نہایت مفید اور کارآمد مضامین قیدِ تحریر میں آسکتے ہیں، مثلاً عورت کو سوسائٹی نے کیا درجہ دیا، اور حقیقتاً اسے کونسا درجہ ملنا چاہیے، آج کل اس سوال نے کافی اہمیت پیدا کرلی ہے، اب ہم اس دائم الحبس قیدی کے متعلق بے اعتنائی نہیں برت سکتے۔"

"ہم ایک ایسا ایران جدید تعمیر کر رہے ہیں جسے جنّت بنا کے چھوڑینگے اس فردوس میں اگر مصروفِ گلگشت حوریں نہ ہوں تو پھر ایسی بہشت کس مصرف کی؟ تنہا غلمانوں کے جھرمٹ کیا بکارآمد ہو سکتے ہیں جب تک حوروں کے پرے پرا جمائے نظارے سے دوچار نہ ہوں، اسلیے کہ جنّت حوروں کے بغیر جنت ہی نہیں بن سکتی۔"

ایک اور اہم موضوع خدمتِ ملک و مادرِ وطن ہے جس پر اہلِ قلم کو اپنے جوہر دکھانا چاہییں، مغرب نے اس موضوع پر بصیرت افروز کتابوں کا

ڈھیر لگا دیا ہے، یہ بلند پایہ اور نادر ذخیرہ سفینے سے نہ سینے میں منتقل کرنے کے قابل ہے ہم ابتک اس ادب جدید میں کوئی حصہ نہ لے سکے، اب جلد سے جلد پورے انہماک سے ہمیں ادھر متوجہ ہونا چاہیے، اس کمی کی تلافی اس طرح ہو سکتی ہے کہ محض خیالات ہی کی تبدیلی پر اکتفا نہ کی جائے بلکہ طرز اظہار میں بھی جدت و تبدیلی کی قوی ضرورت محسوس کر کے زبان کی سادگی و سلاست کو نہایت ضروری تصور کیا جائے، بڑے بڑے بوجھل لفظوں کی ٹھونس ٹھانس ادبی زبان کے شایاں نہیں، حقیقتاً زبان کی شان سادگی و سلاست ہی میں مضمر ہے"۔

ان تحریروں کے پڑھنے سے اس بات کا پورا ثبوت ملتا ہے کہ ایران میں بتدریج مغربی تہذیب کی کارفرمائی کو تیس برس ہوئے اور دنیا کو اس کی خبر نہیں۔

چودھواں باب

جدید معاشرت کے متعلق مزید واقعات کا ظہور

سنہ ۱۹۰۷ء میں مظفر الدین شاہ نے وفات پائی اور اُس کی جگہ محمد علی شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ پیکرِ معائب اُن سب افعالِ ذمیمہ کا منبع تھا جو خاندان قاچار کی انگشت نمائی کا باعث ہوئے۔ ابتدا ہی سے اِس نے رعایا کی طرف سے سخت منافرت کا اظہار شروع کر دیا۔ اپنے ایک روسی اتالیق کے نہج تربیت سے وہ دولت روس اور اس کے ایجنٹ کا ایک آلۂ کار بن گیا۔ اور حقوق رعایا کی پامالی شروع کر دی۔

یہ مجلس کی طرف سے بے اعتنائی برتنا چاہتا تھا۔ لیکن عوام اپنے نمائندوں کے ذریعہ اپنے حقوق حاصل کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ یہ گویا شاہ اور رعایا میں ایک قسم کی خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ مجلس نے اپنے بعض اختیارات جو قانونًا اسے حاصل تھے عمل میں لانا چاہے۔ شاہ اور اسکے قدامت پسند وزرا اور اہل دربار نے

مجلس کے اختیارات گھٹا کر شاہ کا اقتدار قائم کرنے کے لئے قاچاریوں کا وہی سفّاکانہ دیرینہ طرزِ حکومت اختیار کرنے کا تہیّہ کر لیا تھا۔

اسنے روسی ایجنٹوں کے ساتھ اپنی رعایا کے خلاف درپردہ سازباز شروع کیا اور اس تاک میں تھا کہ مجلس کا کسی طرح سے خاتمہ کر دے۔ مجلس کے نمایندے اس کی اِس ناروا روش سے بیخبر نہ تھے انھیں یقین ہو گیا تھا کہ شاہ رعایا کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ لیکن انھیں اس کی کچھ پروا نہ تھی کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ سارا ملک انکی طرف ہے۔ انھوں نے بعض ضروری اصلاحیں عمل میں لاکر اپنے اختیارات قائم کئے اور ملک کی سلامتی و خودمختاری کے لئے خطرناک خیال کر کے روس اور انگلستان سے آئندہ قرض لینا قطعًا موقوف کر دیا۔

شاہ کی بڑھتی ہوئی فضول خرچی اور اسکے رفقا کی نازیبا عیاری کے انسداد کیلئے انھوں نے مؤثر تدابیر اختیار کرنے کا باہم مشورہ کیا قرض کی ضرورت کے وقت بیرونی اغیار کی منت پذیری سے بچنے کیلئے ملک ہی میں قرض لیکر قومی بنک قائم کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔

۱۹۰۷ء میں اربابِ مجلس نے اپنے اختیارات کا پہلا مظاہرہ اس طرح پر شروع کیا کہ محصول خانے کے بلجین افسر مانس ناس جو بہت بدنام تھا اسے برطرف کرنے کے لئے شاہ کو مجبور کر دیا۔ اس نے روپیہ کی ضرورت کی وجہ سے اتابک اعظم کو جو ایک مشہور سازشی شخص تھا اپنا وزیرِ اعظم مقرر کر کے قرض لینے کے لئے روس بھیجا۔

وزیر اعظم نے قرضہ کا انتظام تو کیا مگر قبل اِس کے کہ روپیہ ہاتھ آئے عباس آقا تبریزی ایک نوجوان ایرانی نے اس کو گولی سے ہلاک کر دیا اور اسکے بعد معًا خودکشی کر لی۔

یہ نوجوان ایران میں بہت سی خفیہ انجمنوں کا ممبر تھا۔ اپنے ملک کو ایسے غدار کے ہاتھوں سے بچانے کے لئے یہ اپنی جان پر کھیل گیا۔ ایسے بڑے عیّار کی ہلاکت اِس بات کا بیّن ثبوت تھی کہ ایران میں ایک بہت بڑی جماعت ایسی پیدا ہو گئی تھی جو حکومت دستوری کو بچانے کیلئے ہر قسم کی قربانی کے لئے تیّار تھی۔

۳۱ر اگست ۱۹۰۷ء کو روس و برطانیہ میں ایران کے متعلق ایک معاہدے پر دستخط ہوئے، ماہ ستمبر میں اِس معاہدہ کا اعلان ایران میں ہوا۔ جس پر بڑا جوش پھیلا۔ اِس معاہدے کی رو سے دولت روس کا ایران کے شمالی حصّہ پر قابض رہنا قرار پایا اور اِس حصّہ کے حدود معین کرنے کیلئے ایک خط قصر شیریں سے کاخ تک کھینچا گیا جہاں روس ایران اور افغانستان کی سلطنتوں کے ڈانڈے ملتے ہیں اور برطانیہ کا ایران کے جنوبی حصہ پر قبضہ تسلیم کیا گیا جس کے حدود قازک سے بیر جند اور کرمان ہوتے ہوئے بندر عباس تک چلے گئے تھے جو خلیج فارس پر واقع ہے۔

ان دونوں سلطنتوں نے ایران کی خودمختاری کی ذمہ داری لیکر آئندہ کسی قسم کا مطالبہ نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ اہل ایران نے اس معاہدے کو اچھی نظر

سے نہیں دیکھا، جب تک ایران کے یہ دونوں زبردست حلیف لڑتے بھڑتے رہیں گے اسوقت تک دونوں میں سے کسی ایک کو خوش کرکے کام نکالنا ممکن ہے اور اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک پیش قدمی کرے تو بھی دوسرے سے امداد حاصل کرکے اسکا انسداد ہو سکے گا۔ ایران کی خودمختاری کے لئے اصولاً تو دونوں سلطنتیں ضامن ہوئی تھیں لیکن اس خودمختاری کا وجود در اصل ان کے رحم وکرم ہی پر مبنی تھا۔ اس باب میں ایرانیوں کا نقطۂ نظر یہی تھا۔ ان دونوں سلطنتوں کے اتحاد سے ایران کو ابتک جتنے نقصانات اٹھانا پڑے ایرانی انھیں کبھی بھول نہیں سکتے تھے گو برطانیہ کی طرف سے کیسا ہی یقین دلایا جاتا۔

ایران اپنے شمالی ہمسایہ کی پیش قدمیوں سے ہمیشہ خائف رہا۔ اور خوزجستان میں افواج برطانیہ کی موجودگی کو ایرانیوں نے غلطی سے شبہہ کی نظر سے دیکھا اس سے برطانیہ کے مقاصد کی غلط فہمی ہوئی۔ ایران نے یہ خیال کیا کہ دولت روس اور دولت برطانیہ میں مصالحت ہوجانے سے یہ دونوں ایران کے حصے بخرے کرنا چاہتے ہیں۔ اسوقت ایرانیوں کی زبان پر یہ شعر جاری تھا؎

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

اس زمانہ میں طہران کے کسی اخبار میں ایک کارٹون نکلا۔ جسمیں یہ دکھایا گیا تھا

کہ گربۂ مسکین ایران کو ایک طرف سے خرس روس اور دوسری جانب سے شیر برطانیہ یہ دونوں دبا رہے ہیں اور وہ بےچین پڑی ہوئی یہ کہہ رہی ہے ؎

اب کیا رہا ہے جس پہ رقیبوں کا ڈر کروں
میں تو موؤں کی جان کو پہلے ہی رو چکی

خرس شیر سے کہتا ہے کہ میں اس کے سر پہ دست شفقت پھیرونگا۔ اور شیر صاحب فرماتے ہیں کہ میں اسکی دُم سہلاؤں گا۔ یہ سُنکر گربۂ مسکین کہتی ہے کہ مجھ سے اس بارہ میں مشورہ نہیں کیا گیا۔

اس کارٹون سے عوام خوف زدہ ہوکر اُٹھ کھڑے ہوے اور قسم کھائی کہ وہ اپنے ملک پر جان و مال قربان کر دیں گے۔ عوام کا جوش ان دونوں سلطنتوں اور شاہ کے خلاف جو ان کے ہاتھوں میں آلہ کار بنا ہوا تھا اتنا بڑھا کہ شاہ بدحواس ہو گیا۔ اخباروں میں نہایت سخت اور حقارتانہ انداز میں اسکے خلاف مضامین شایع ہوئے۔ محمد علی شاہ ایسا ڈرا کہ جلوس کے ساتھ مجلس میں آیا اور کلام مجید پر ہاتھ رکھکر قسم کھائی کہ آیندہ سے وہ دستوری حکومت کا مؤید رہے گا۔ لیکن اس کی نیت اپنے عہد پر برقرار رہنے کی نہ تھی بلکہ ساری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح مجلس شوریٰ توڑ دیجائے۔ چنانچہ پھر خانہ جنگی شروع ہوئی۔

شاہ کی باقاعدہ فوج میں بارہ سو ایرانی سپاہی جن کے افسر روسی تھے

اور فوج بے قاعدہ میں اس کے خانگی ملازمین جیسے سائیں، قاطرچی خدمتگار وغیرہ شامل تھے۔ ان سب نے مجلس کے خلاف شرارت شروع کی لیکن یہ شیطانی لشکر ایسا بدنام تھا کہ کوئی اس کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ مجلس بدستور اپنا کام کرتی رہی۔ تمام راستوں اور دروازوں پر مسلح رضاکار حفاظت کے لئے متعین اور ہر طبقہ کے لوگ مجلس کو حملہ شاہی سے بچانے کے لئے مجتمع اور فراہم ہوگئے تھے آخر جو ہونے والا تھا وہ ہو کے رہا۔ شاہ کی فوج نے مجلس شوریٰ کی عمارت کا محاصرہ کر لیا۔ چند گھنٹے کی جنگ و جدل کے بعد مصالحت ہوگئی اور شاہ نے اپنا ایک حلف نامہ مہر شدہ لفافہ میں مجلس کو بھیجا۔ جس میں یہ تحریر تھا کہ وہ دستوری حکومت کی متابعت کرے گا۔ عوام کو اس کے حلف پر اعتبار نہ آیا اور اُسے قتل کرنے کی کوشش کے سلسلے میں ایک بم پھینکا گیا۔ لیکن وہ بال بال بچ گیا۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں اس کی باقاعدہ معزولی کے بعد اس کا فرزند سلطان احمد شاہ جانشین قرار پایا۔ سلطان احمد چونکہ ابھی نابالغ تھا اس لئے عضدالملک جو سن رسیدہ اور خاندان کے بزرگ سمجھے جاتے تھے اس کے نائب السلطنت مقرر ہوئے۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں مجلس نے اپنا کام تو شروع کر دیا مگر ایک طرف خزانہ بالکل خالی دوسری طرف غیر سلطنتوں کے قرضہ کا بار گراں۔ اور تیسرے بجائے ترقی کے آمدنی گھٹ رہی تھی۔ ملک کی عام انتظامی حالت کے غیر معمولی طور پر

ابتر ہو جانے سے ایران کی ساکھ جا چکی تھی۔ اگلی بدنظمیوں کے گہرے اثرات کو ملک سے دور کرنے کے لئے بڑی سوجھ بوجھ اور پوری اولوالعزمی کی ضرورت تھی۔ ان معاملات کو درباصلاح کرنے اور ملک کی مالی حالت کو منظم بنانے کے لئے مجلس نے کافی غور وخوض کے بعد ۱۹۱۱ء میں ایک ماہر مالیہ مسٹر مارگن شسٹر کو امریکہ سے بلا کے ایران کا ٹریژرر جنرل مقرر کیا اور ملک کے داخل و مخارج اور مالی معاملات کے پورے اختیارات انھیں دیدیے۔

اپنی خدمت کا جائزہ لیتے وقت انھیں یہ نئی بات معلوم ہوئی کہ یہاں کا کوئی بجٹ ہی نہیں۔ سارا ملک متعدد صوبوں میں منقسم اور ہر صوبہ کا جداگانہ دارالحکومت تھا، ہر ایک دارالحکومت میں گورنمنٹ کی طرف سے ایک مالی ایجنٹ یا بالفاظ دیگر ٹیکس کلکٹر آمدنی وصول کرکے اپنی اور اپنے محکمہ کی تنخواہوں اور دوسرے اخراجات کی رقوم منہا کرنے کے بعد باقی رقم وزیر خزانہ کے پاس بھیجدیتا اور حسابات کو ایسی ابتر حالت میں رکھتا تھا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا نہ سمجھ سکے۔

وزیر خزانہ کو جب کبھی روپیہ کی ضرورت ہوتی تو اُن ٹیکس کلکٹروں کے نام ہُنڈیاں جاری کی جاتی تھیں۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہ بھی انھیں ہُنڈیوں کے ذریعہ ادا کی جاتی۔ بازار میں بھی ان کا چلن تھا۔ لیکن ہنڈیوں پر درج شدہ رقم کے لحاظ سے لین دین میں ان کی قیمت کبھی آدھی اور کبھی چوتھائی رہجاتی تھی مسٹر مارگن شسٹر نے حسابات کے موازنہ اور تنقیحات کا جدید طریقہ

جاری کر کے عہدہ داروں کی بد دیانتی اور رشوت ستانی کا خاتمہ کر دیا۔ محصولات پر نظر ثانی کے بعد وصولیابی کے لئے سخت تدابیر اختیار کئے۔ خاصکران متمولین کے مقابلہ میں جو واجب الادا رقموں کو بلطائف الحیل ٹالنے کے عادی تھے۔

لیکن قبل اس کے کہ مسٹر شسٹر مجلس کے سامنے ایک ایسا موازنہ پیش کر سکیں جس میں بجٹ ہو دولت روس نے مسٹر شسٹر کے جدید اصلاحات کو اپنے تجارتی مفاد کے خلاف پاکر اُن کی فوراً علٰحدگی اور روس و برطانیہ کی مرضی کے بغیر کسی بیرونی افسر کے تقرر کے بارے میں نہایت تحکمانہ انداز میں مجلس سے مراسلت کی۔ مجلس نے اس دھمکی کی کوئی پرواہ نہ کی۔ روس چین بجبیں ہوکر مجلس کی چلتی ہوئی گاڑی میں روڑے اٹکانے لگا۔ نوبت یہاںتک پہونچی کہ نمایندگان مجلس ان دونوں سلطنتوں کی منظوری کے بغیر غیر سیاسی تعلیمی اصلاحات بھی جاری نہ کر سکتے تھے اور ہر طرح کے تغیر اور امور سیاسی کے اقدام کے واسطے روسی سفارت خانہ کی منظوری لازمی تھی۔

معاملات ملکی میں بیرونی حکومتوں کی ایسی ناروا مداخلت اور ایسا ناپسندیدہ طرز عمل اہل ملک کے لئے ناقابل برداشت تھا جس کو ایرانی اپنی اُس خودمختاری کے واسطے جس کی دونوں سلطنتیں بارہا ضامن ہو چکی تھیں نہایت خطرناک خیال کرتے تھے۔

مسٹر شسٹر کی برطرفی کسی طرح انھیں گوارا نہ تھی۔ اس لئے کہ ان کا وجود

ملک کے واسطے نہایت سودمند تھا۔ اسی بنا پر روس کی گیدڑ بھبکیوں کی مجلس نے کچھ پروانہ کی۔ دولت روس کا گھمنڈ اپنی بات کو بھلا کیسے نیچی ہونے دیتا۔ اُس نے یہ جتلانے کے لئے کہ روس اپنی تجویز کو پورا کرکے رہے گا مصیبت زدہ ایران پر فوج کشی کا حکم دیدیا۔ ملک میں نبرد آزمائی کی سکت کہاں تھی مجلس کے لئے اسکے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا کہ مسٹر شسٹر کو برطرف کردیا جائے اور مجبوراً یہی کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ برطانیہ اور روس کی وہ شرطیں بھی بادلِ ناخواستہ تسلیم کرنا پڑیں جن کی رو سے بغیر منظوری حاصل کئے کسی بیرونی شخص کا تقرر مجلس نہیں کرسکتی تھی۔

برطانیہ اور روس کی بدولت ایران کی حریت و آزادی کو جو ناگوار منظر دیکھنا پڑا۔ یہ اہانت آمیز شرائط گویا اس کی ابتدا تھے۔ نائب السلطنت ان سلطنتوں کا بندۂ بیدرم بنا ہوا تھا۔ اُس نے ملک کے روشن خیال رہبر و رہنما افراد کو یا قید کیا اور یا جلاوطن۔ سیاسی کلب بند ہوگئے۔ ان دنوں طہران کے مقتدر سیاسی لوگوں کی خودداری و خودمختاری متزلزل ہوگئی۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں احمد شاہ کی تاجپوشی کے کچھ ہی دن بعد یورپ کی جنگ عظیم کا سیلاب امنڈنے لگا۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں حالت موجودہ پر مجلس میں بہت کچھ پرجوش مباحثے ہوئے۔ اس جنگ میں یہ بھی اپنی قسمت کو جرمنی اور آسٹریا کے ساتھ وابستہ کردینا چاہتے تھے۔ لیکن اس بارے میں قطعی تصفیہ کرنے سے پہلے روسی فوج

طہران کی طرف بڑھ آئی۔ اس اقدام نے اہل ایران کو سراسیمہ و مضطر کر دیا اور مجلس بھی دم بخود ہو گئی۔ بے روک ٹوک برطانوی اور روسی فوجوں کی نقل و حرکت ایران میں ہو رہی تھی۔

بے یار و مددگار ایران جنگ میں کوئی حصہ لئے بغیر روسی۔ انگریزی اور ترکی افواج کی جولانگاہ بنکے رہ گیا۔ شمالی و مغربی حصۂ ملک میں روسی اور ترکوں کی مڈبھیڑ گرمی میدان کارزار کا سبب بن گئی اور شمال و مشرقی حصہ پر روس متصرف رہا۔ اب رہا ملک کا جنوبی حصّہ اُس پر انگریز قابض ہو گئے۔ شمال میں روسیوں نے اُن ایرانیوں کا جو روس اور قفقاز میں رہتے تھے ایک برگیڈ بنایا اور اسی طرح سر پرسی سائکس نے جنوبی ایران میں ایرانی باشندوں کی ایک پلٹن تیار کی۔

۱۹۱۸ء میں روسیوں کی فوجی پسپائی کے وقت انگریزوں نے جرمنی فوجوں کو قفقاز کی طرف ہٹانے کے لئے شمالی حصہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ کسی قبیلے کے سردار کوچک خاں نے ایک انجمن "اتحاد الاسلام" کے نام سے قائم کی ان کا دعویٰ تھا کہ ایران صرف ایرانیوں کے لئے ہے۔ اِس طرح انھوں نے شمال میں انگریزوں کا مقابلہ کر کے جنوب کی طرف انھیں پسپا کر دیا۔ انگریزوں نے جنوبی ایرانیوں کی جو پلٹن تیار کی تھی دوران جنگ میں تو اِس کی نسبت کوئی خیال ہی نہیں آیا۔ لیکن اب اس اہمیت پر نظر پڑی کہ وہ ایرانی خودمختاری کیلئے

سخت خطرناک و مخدوش ہے، چنانچہ حکام مقتدر کے پاس اِس مضمون کی تحریر بھیجی گئی کہ دولت برطانیہ اپنی فوج جنوب سے ہٹالے گی لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں سر پرسی کاکس سفیر برطانیہ نے یہاں آکے انگلستان اور ایران میں یہ معاہدہ کیا کہ اب "ایران" کی نگرانی و دستگیری انگلستان کے ذمے رہے گی اور پورے ایران پر انگلستان مسلط ہو کے ایرانیوں کے لئے سارے ملک کا انتظام کرے گا۔ اِس معاہدے سے گو ایران کی امانت اور خود مختاری کی ضمانت کی گئی لیکن اِس شرط سے ایران دولت برطانیہ کا ایک جز بنکر رہجاتا تھا اِس لئے ملک کی رائے عامہ معاہدۂ مذکور کے سخت خلاف تھی۔ وثوق الدولہ وزیر اعظم جو اس عہدنامہ کی تکمیل میں خاص حصہ لے رہا تھا۔ عام برہمی دیکھ کر ایسا خوف زدہ ہوا کہ اسے مجلس میں توثیق کیلئے پیش نہ کرسکا اور اسے ملتوی کر کے بغیر مجلس کے جب تک ہو سکے ملک پر حکومت کرنے کا خیال اسنے قائم کرلیا۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں جب اِس کی غداری کا بھانڈا پھوٹا تو مجلس کے غیظ و غضب سے بچنے کیلئے وہ استعفا دے کے یورپ بھاگ گیا۔ مجلس نے فوراً یہ معاہدہ فسخ کر کے انگریزی فوجی افسروں اور مالی مشیروں کو برطرف کردیا اور اب انگریزی اقتدار کے لالے پڑگئے۔ سنہ ۱۹۰۷ء والے معاہدۂ برطانیہ و روس کی وجہ سے ایرانیوں کی نظر میں برطانیہ کی نیت جو مشتبہ ہو چکی تھی اِس کی پوری توثیق

و تصدیق ہوگئی اور اب اسکے روز افزوں اقتدار ایران پر مخدوش و خشمگیں نظریں پڑنے لگیں۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں سپہدار اعظم جو وثوق الدولہ کا عکس اور فوٹو تھا وزارت عظمےٰ کے عہدۂ جلیل پر مامور ہوا۔ اُس نے گورنمنٹ روس سے ایک نئے معاہدے کے لئے طولانی مراسلت شروع کی۔ مراسلت کی غرض صرف یہ تھی کہ انگریزوں کے بجائے روسیوں کو ملک حوالے کر دیا جائے۔ دولت روس نے بہت خوشی سے ایران کے انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لینا منظور کیا اور اسکے صلہ میں روسیوں نے جنگ کے پہلے جو مراعات بشمول رشین بنک حاصل کئے تھے۔ ان سے دست برداری منظور کر لی ارکان مجلس کی ہوشیاری، تجربہ کاری اور احساس ذمّہ داری سے ایسے معاہدہ کی توثیق ناممکن تھی۔ یہ ارکان ملک کے ان غدار امراء کے مثل نہ تھے جو اپنی حرص و آز کی تھیلیاں بھرنے کیلئے ہمیشہ وطن فروشی کی دُھن میں رہا کرتے تھے

مجلس اِس طرح کی غدّاری اور رشوت ستانی کی روک تھام کے لئے سخت تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کر چکی تھی۔ ناصر الدین شاہ قاچار کے زمانہ سے جب کہ پہلی دفعہ دول غیر کے ساتھ ایران کے سیاسی تعلقات قائم ہوئے تمام ایرانی وزراء عیاری و فتنہ پردازی میں عدیم النظیر تھے اور محض چالاکی اور سازش کی بدولت یہ اپنے عہدوں پر بحال رہے دوسری حکومتوں کے اشاروں پر چلنا

اور اپنے ملک میں ان کے اقدام کا خیر مقدم کرنا ان وزراء نے گویا اپنا پیشۂ آبائی اور خاص شعار بنالیا تھا۔

سنہ ۱۹۰۶ء کا دستور العمل ان کی مخالفانہ سرگرمیوں کا سدباب کرتا تھا لیکن وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آکر دستوری حکومت کی کارروائیوں میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے، ایک وزیر کے معزول ہونے سے اسکی جگہ دوسرا جو مقرر ہوتا تھا وہ سازش و مکاری میں اپنے پیش رو سے بھی دو قدم آگے ہوتا تھا، **وثوق الدولہ** انگریزوں کے ہاتھ ملک فروخت کرنا چاہتا تھا، تو اسکے جانشین نے اس کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا کہ ملک کو روس کے ہاتھ بیچ ڈالے، لیکن یہ ساری کارروائیاں جو پہلے نظر انداز کردی جاتی تھیں اب ان پر کافی نگرانی ہونے لگی، اخبارات نے بڑا زور پکڑا اور عوام سیاسیات میں بہت دلچسپی لینے لگے، ملک میں بہت سے ایسے اولوالعزم اٹھ کھڑے ہوئے، جو دامے، درمے، سخنے، قدمے ہر طرح سے خدمت ملک کیلیے تیار ہو گئے۔

پندرھواں باب

دورِ رضا شاہ پہلوی

سنہ ۱۹۲۱ء میں قومی تفاخر، حب الوطنی اور قومی خیالات کے شیوع نے ایرانیوں میں ایک ہیجان پیدا کر دیا، ہر شخص کی زبان پر یہی تھا کہ ایران ایرانیوں کیلیے ہے بیدلی اور بےچینی ملک میں بڑھتی چلی جا رہی تھی، یہاں تک کہ افسرانِ فوج بھی مطمئن نہ تھے، ملک میں قومیت کا مقناطیسی اثر پھیلا ہوا تھا، ایسے نازک وقت میں ایک ایماندار، راستباز، قائد و رہنما کی ضرورت تھی کہ وہ رہبری کا صحیح فرض ادا کر سکے۔ سیّد ضیاء الدین مدیر روزنامہ رعد جو بڑے زبردست وطن پرست پرانے طرزِ حکومت اور دقیانوسی خیال کے اُمرا سے متنفر، بیرونی سازشوں کے جال میں نہ پھنسنے والے سیّد جمال الدّین مرحوم کے قدم بقدم تھے، ضرورت وقت کو محسوس کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ملک کو ان سے

بہتر کوئی اور نہیں مل سکتا تھا۔

بادۂ حُبِّ وطن کے سرشاروں نے ضیاء الدین کا پُر جوش خیر مقدم کیا ان کے گرد ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے، خدمت ملک کی ابتدا کس طرح کی جائے، اس سوال پر کافی غور اور باہمی مشورے سے یہی طے ہوا کہ زمام حکومت انھیں کے ہاتھ میں رہنا ضروری ہے لیکن یہ کوئی آسان بات نہ تھی مگر

بہر کاریکہ ہمت بستہ گردد اگر خارے بود گلدستہ گردد

کے لحاظ سے ایک غیر متوقع صورت ایسی پیش آئی جو ان کے رجحانات کیلیے نہایت سود مند ثابت ہوئی۔

آذربائجان کے علاقہ میں بالشویکوں کی شورش رونما ہونے پر ایرانیوں کی ڈھائی ہزار فوج اس فساد کے انسداد کیلیے بھیجی گئی، اسے شکست فاش ہوئی، اور اس ہزیمت کا الزام ان کے افسروں پر عائد کیا گیا، رضا خاں قلی نے جو قزوین میں فوجی افسر کی حیثیت سے مامور تھے اپنے ہم مرتبہ عہدہ داروں مسعود خاں اور قاسم خاں کی مدد سے تمام روسی افسروں کو نکال باہر کیا اور روسیوں کے اس اخراج سے ان پر بالشویکوں کی طرفداری کرنے کا شبہ ہوا انھوں نے ٹھیٹ ایرانیوں کا ایک فوجی دستہ بھی ترتیب دیا، جب روسی افسروں کے استیصال سے ضیاء الدین کو رضا خاں قلی اور اُن کے شرکار کے ساتھ مفصل مراسلت کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے فوج کے ساتھ طہران کی طرف پیش قدمی کر کے بزور حکومت ملک حاصل کرنے کا

انھیں مشورہ دیا، رضا خاں اور اُن کے ساتھیوں نے کامیابی کی توقع پر ضیاالدین کی رائے پر عمل کیا اور فوج لے کر طہران روانہ ہوئے۔

۲۰ رفروری ۱۹۲۱ء کی شب میں دروازۂ قزوین کی راہ سے طہران میں داخل ہوتے ہی صبح ہونے سے پہلے تمام دفاتر سرکاری پر قبضہ کر لیا، شاہ کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی گئی، اسلیے کہ وہ بالکل بے بس تھا، قبضے کے ساتھ ہی پارلیمنٹ کی ترتیب اس طرح عمل میں آئی کہ سیّد ضیاالدین وزیر اعظم مسعود خاں وزیر افواج قاسم خاں گورنر طہران اور رضا خاں کمانڈر فوج مقرر ہوئے، اور حکومت کے اس انقلاب سے تاریخ ایران کا ایک نیا باب شروع ہوا ۱۹۲۱ء سے حقیقی معنوں میں حکومت دستوری قائم ہوئی، وزیر اعظم، گورنر طہران اور کمانڈر فوج یہ سب کے سب ایسے شیدائے وطن، ملک کے فدائی، روشن خیال، حریت پرست راستباز تھے، جن پر ملک کو پورا بھروسہ تھا رضا خاں ۱۸۷۸ء میں شمال ایران کے ضلع سواد کوہ میں بمقام الشت پیدا ہوئے، ان کے جد امجد مُراد علی خاں پہلوی جو ہرات کی مہم میں کام آئے سواد کوہ کی رجمنٹ میں لفٹنٹ اور ان کے والد ماجد عبّاس علی خاں پہلوی ہیں کرنل کے عہدہ پر فائز تھے، خاندانی سپہ گری اور آبائی نبرد آزمائی کے خدمات کی طرف ان کا ایسا میلان تھا کہ نوعمری اور کمسنی سے اسی رجمنٹ میں یہ داخل ہو گئے جس میں رہ کر ان کے بزرگ دادِ مردانگی دے چکے تھے۔ بالٹرن کی حیثیت سے یہاں ابھی ایک ہی برس ہوا تھا کہ سلسلہ ملازمت

کو شاک ڈویژن اور پھر ملک کے اکثر مقامات پر انھیں منتقل کرتا رہا، یہ جہاں رہے اپنی فرائض شناسی اور حسن کارگزاری کا سکہ بالادست افسروں کے دلوں پر بٹھاکر رہے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ یہ ہمدان بریگیڈ کے کمانڈر مقرر ہوئے ایک قواعد داں سپاہی کی حیثیت سے ان کی ملازمت شروع ہوئی مگر ان کی جرأت و قابلیت مستعدی و جفاکشی، اولوالعزمی و حوصلہ مندی بتدریج فوجی بلند عہدوں پر انھیں پہنچاتی رہی۔

۱۹۱۷ء میں روسی بغاوت کا قدم بڑھا اور اس موقع کو غنیمت سمجھ کر ایران کے فوجی خدمات سے کچھ روسی افسروں کو انھوں نے علیحدہ کر دیا اور کو شاک ڈویژن کی ضروری اصلاحات میں یہ مصروف ہو گئے، ابھی کام پورا نہ ہونے پایا تھا کہ انھیں طہران بھیجدیا گیا، ۱۹۲۰ء میں صوبہ گیلان کی آتش بغاوت کے بھڑکتے ہوئے شعلے انہی کی نہج تدبیر اور آب شمشیر سے بجھائے گئے، ۱۹۱۹ء میں رشت اور تونا کبان ہوتے ہوئے یہ اپنے جنم بھوم آئے اور یہاں اطمینان سے بیٹھ کر حکومت کی بدنظمی و بے عنوانی اور قوم کی بیچارگی و بے بسی پر غور تام کے بعد وہ لائحہ عمل تیار کر کے اُٹھے جسے دیکھ کر دُنیا حیرت زدہ ہوگئی، ابتدا سے رضا خاں اپنے سپاہیوں پر فریفتہ اور سپاہی ان کے شیدائی اور فدائی تھے، ایک ایرانی سپاہی نراجنگی ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ بڑی حساس طبیعت رکھتا ہے وہ چست و چالاک، محنتی جفاکش، نڈر، بہادر اپنی تربیت پذیری سے ہمیشہ اپنے افسر کی اطاعت پر کمربستہ رہتا ہے بشرطیکہ

افسر کو بھی اُس پر پورا اعتماد ہو۔

اُس وقت کے قرائن دیکھ کر بہ آسانی یہ پیشین گوئی کی جا سکتی تھی کہ رضا خاں اپنی تربیت یافتہ اور منظم فوج سے سب کچھ کر سکتے ہیں، یہ دیکھ رہے تھے کہ پورے ملک میں بدنظمی پھیلی ہوئی ہے، عام طور پر مُلّاؤں، مجتہدوں اور مالداروں کی تو عزت کی جاتی، لیکن قانون کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا، یہ ظاہر ہے کہ آئین و قوانین ہی اصلاح و درستی ملک کا واحد ذریعہ ہیں اور جو یہ نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں جس طرح تربیت فوج، غذا، لباس، آلات و اسلحہ جنگ کے بغیر نہیں ہو سکتی اسی طرح ایک بے آئین ملک میں کسی قانون کا نفاذ منظم فوج کی استعانت و مدد کے بغیر ناممکن ہے۔

رضا خاں نے اپنے ذاتی اثر سے ایسی تربیت یافتہ فوج تیار کی جسے وہ فخر و محبت کی نظر سے دیکھتے اور اتحاد ملک، قومی تفوق اور آئین جدید کے نفاذ کیلئے اسے نہایت کارآمد اور ضروری سمجھتے تھے، مگر سلطنت کی ابتری و زبوں حالی کی وجہ سے ایسی مایۂ ناز فوج کے سپاہیوں کو بروقت پوری تنخواہیں بھی نہ مل سکتی تھیں، اسلیے روپے کی فراہمی رضا خاں کے واسطے سب سے پہلا اور اہم کام تھا، مگر خزانہ نعمت خان عالی کے اس شعر کا پورا مصداق بنا ہوا تھا:۔

فلسفی آنکس کہ می گوید خلا باشد محال   در خزانہ می رود ہرگز نگوید این سخن

اس پر بھی ان کی ہمت و استقلال کی پیشانی پر شکن تک نہ آئی، حقیقت یہ ہے کہ رضا خاں کی سی بلند قامت، قوی ہیکل ہستی میں قضا و قدر نے فراست و ہوشمندی، عزم راسخ و اصابت رائے، طاقت رہبری و رہنمائی، قوت فیصلہ وخود اعتمادی کا سرمایہ کوٹ کوٹ کے بھر دیا تھا۔

کمانڈر کی حیثیت سے اپنے فرائض متعلقہ کے علاوہ بلحاظ عہدہ کیبنٹ کی سرکاری رکنیت پر بھی یہ فائز ہوئے، مُلکی انتظامات کے سلسلے میں موجودہ اور نئی فوج کی بھرتی کے لیے کافی روپے کی فوری ضرورت، خزانہ طبل تہی کی طرح بالکل خالی، رُوس و انگلستان سے قرض نہ لے سکنے کی مجبوری، رضا خاں کے اہم مطالبات کی لازمی ادائی، ان سب باتوں سے ضیاءالدین عجب شش و پنج میں پڑ گئے۔ رضا خاں نے ضرورت وقت سے عاجز آ کر چند ایرانی جاگیرداروں کو گرفتار کر کے ان کی جاگیریں اور جائدادیں ضبط کرنے پر ضیاءالدین کو مجبور کر دیا، پہلے تو یہ جھجکے مگر پھر انھوں نے رضا خاں کے حسب خواہش احکام ضبطی جاری کر دیے، نافذ شدہ احکام کی تعمیل میں اکثر متمولین ایران کو گرفتار کر کے ان کی جائدادوں پر قبضہ کر لیا گیا، اس پکڑ دھکڑ سے شاہ کے ابن عم بھی نہ بچ سکے۔

یہ فعل خلاف قانون سہی لیکن ملک میں امن و امان قائم کرنے کی غرض سے فراہمی زر کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا، اس لیے مفاد ملک کے مدنظر اس

طرزِ عمل کو جائز قرار دیا، علاوہ ازیں گرفتار شدہ لوگوں میں اکثر ایسے تھے جنھوں نے جنگ عظیم میں اپنے ملک کے خلاف بیرونی حکومتوں سے سازش کر کے خوب روپیہ کما لیا تھا، اس بنار پر جو کچھ بھی ہوا وہ بہت ٹھیک ہوا۔

اختیارات کے اس پُر زور مظاہرے نے محصولات کی تحصیل وصول میں کافی سہولت پیدا کر دی، یہ کام رضا خاں کے تفویض ہوا، اس طرح کی فوری ضروریات کیلیے روپے کی فراہمی اور آئندہ حسب ضرورت مزید روپے کی دستیابی زیر اختیار آجانے سے رضا خاں نے فوج کی از سرِ نو تنظیم شروع کی جو ایک وطن پرست شاعر کے الفاظ میں "دُنیا کی نظروں میں ایک مضحکہ خیز ہیولے" تھی۔

ضیاء الدین نے بھی اپنی مجوزہ اصلاحات کی ضیا پاشی کے لیے بساطِ حکومت پوری اُلٹ دی، تمام بد دیانت و مُرتشی ملازموں کو علیحدہ کر کے اُن کی جگہیں راستباز و ایماندار افراد کو دی گئیں، اس پر بھی حکومت کی مشین کے پُرزوں کو تیل کی ضرورت تھی، ضیاء الدین ضرورت وقتی کا لحاظ کر کے اس نقص کو دور کرنے کے لیے باہر سے ماہرینِ فن بُلانا چاہتے تھے، اس باب میں برطانیہ سے مراسلت ہوئی لیکن انگلستان اینگلو ایرانین معاہدے کی تکمیل تک اس طرح کی دخل دہی اپنی مدبرانہ روش کے منافی سمجھتا تھا۔

رہا روس تو اُسے خود اپنے حلوے مانڈے کی پڑی تھی، اُنھوں نے

ہر طرف نظر دوڑائی کہیں سے صید مرام ہاتھ نہ آیا، اسی اثنا میں ان کی وزارتِ عظمیٰ متزلزل نظر آنے لگی اور یہ ہر طرف سے نرغے میں گھر گئے، ادھر نوعِ شاہ کجکلاہ اپنے بھائیوں کی گرفتاری اور ان کی جاگیروں کی ضبطی جو وزارت عظمیٰ ہی کے احکام سے ہوئی تھی وزارت پناہ سے روٹھے ہوئے تھے اُدھر وہ طبقہ اُمرا جنکے کل اختیارات تذرِ وزارت ہوکر خالی ہاتھ رہ گیا تھا وزیر با تدبیر کی گھات میں لگا ہوا انتقامی موقع کا منتظر تھا، ان میں رضا خاں کی سی قوت اقدام نہ تھی، اسلیے وہ شاہ و اُمرا کی برہمی سے ایسے ڈرے کہ جس دلیری اور جوانمردی سے اُنھوں نے وزارت شروع کی تھی اب اُس جرأت وجسارت سے کام نہ لے سکے رضا خاں نے یہ رنگ دیکھ کر اُنھیں وزارت سے مستعفی ہونے پر مجبور کیا اور ایک نئی کابینہ ترتیب دی، خود وزیر فوج بنے اور قوام السلطنت کو وزیر اعظم بنایا۔

سولھواں باب

رضا خاں کی آمریت

رضا خاں کو ان کی عسکری آمریت، سحر طراز شخصیت، بسالت و بطلیت دانش افروز قابلیت نے حلم و وقار کا کوہِ بلند بنا دیا تھا وہ اب ملک میں بے تاج کے بادشاہ تسلیم کئے جاتے تھے وزراء کا عزل و نصب انھیں کے دستِ اقتدار میں تھا۔ عسکری طاقت میں اضافہ کر کے ڈھائی ہزار سے چالیس ہزار کا لشکر جرار بنا دینا انھیں کی اولوالعزمی اور بیدار مغزی کا قابل حیرت کارنامہ ہے۔ ایسی زبردست منظم و فوج ظفر موج زیر اقتدار آنے کے بعد کس کی مجال تھی جو سرتابی کر سکے تنظیم و اضافۂ سپاہ نے ولولہ آور جوش اقدام کیلئے اب راستہ بالکل صاف اور ہموار کر دیا۔

سب سے پہلے از سر نو ملک کی اصلاح، خوشحالی، طاقتوری، فارغ البالی

اور بیرونی سلطنتوں کے خطرۂ مداخلت سے نجات دلانے کی جانب ملتفت ہوئے ان کے پاس سازوسامان کے ساتھ ایک منظم فوج تو تیار تھی لیکن انھیں مصارف لشکر کے لئے جابرانہ طریقہ سے ہمیشہ روپیہ کی فراہمی ناپسند تھی۔ ملک کی مالی حالت کی اصلاح کے لئے ایک ماہرِ فن امریکن مسٹر اے۔ سی ملسپا کو بلاکر مصلح مالیات کے عہدے پر مقرر کیا۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں مسٹر ملسپا نے محکمۂ مال کے اڈمنسٹریٹو جنرل کی خدمت کا جائزہ لیا۔ ان کو وسیع اختیارات دئے گئے۔ ابتداءً جب یہ ایران آئے تو وہاں کے ایک اخبار نے لکھا کہ :-

"مسٹر ملسپا! آپ آخری معالج ہیں جو ایک ایسے صاحب فراش مریض کے علاج کے لئے بلائے گئے ہیں جو بستر مرگ پر پڑا سسک رہا ہے آپ کی ناکامی سے یہ جاں بلب مریض جاں بحق اور کامیابی سے از سر نو حیات تازہ حاصل کرسکتا ہے۔ لہذا میں آپ کے آنے کی خوشی نہیں مناتا۔ مع الخیر مطمئن ہو کر آپکی کامیابی پر مسرت و انبساط کا جشن مناؤنگا"

چنانچہ اس آخری ڈاکٹر کی تشخیص و طرزِ علاج سے مریض کی حالت روبصحت ہونے لگی اور رفتہ رفتہ توانائی آئی۔ ان کی حذاقت نے سب سے پہلے اسی قوی شکایت کا استیصال کیا۔ جسے نظر انداز کرنے میں یہ خوف تھا کہ کہیں اور خطرناک پیچیدگیاں پیدا ہو کر مریض کا کام تمام نہ کردیں۔ انھوں نے بیان کیا کہ یوں تو اب بھی

بہت سی پیچیدگیاں باقی ہیں، جنمیں سے بعض کی اہمیت ناقابل انکار ہے لیکن ان کے لئے کسی بڑے آپریشن یا سیاسی مشت مال کی ضرورت نہیں ہے۔ مریض ایران کی امید جاں بری ہی نہیں بلکہ اس کے تندرست و توانا ہونے کی کافی توقع ہے اگر اسے اپنے حال پر چھوڑ کر مالی سادہ غذا، کھلی ہوئی صاف اور تازہ ہوا میں اسے معاشیاتی مشق کا موقع دیا جائے۔

جب مسٹر ملسپا نے ایران کا سابقہ موازنہ طلب کیا تو انھیں یہ جواب صاف ملا کہ یہاں کوئی باقاعدہ موازنہ ہی نہیں البتہ مسٹر شسٹر نے موازنہ تیار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ترتیب موازنہ سے قبل ہی ان کی برطرفی کیلئے ایران مجبور ہو گیا ایران کی مرکزی حکومت کو باہر اضلاع کی کچھ خبر ہی نہ تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ چنگی کے محکمے اور ڈاک خانے بلجینس کے ہاتھ میں تھے۔ اینگلو انڈین کمپنی تار برقی پر قابض تھی۔ افسران سویڈن کا محکمہ کوتوالی پر قبضہ تھا۔ فرانسیسی ڈاکٹر پاسچیور انسٹیٹیوٹ کو چلا رہے تھے۔ فرانسیسی پروفیسر وزارت وضع قوانین کے فرائض ادا کرنے کے علاوہ درس قانونی بھی دیتے تھے۔ حسب معمول خزانہ خالی اور سرکاری ملازمین کی تنخواہیں ایک ماہ سے آٹھ ماہ تک کی واجب الادا تھیں۔ مدرسین تنخواہیں نہ ملنے سے ہڑتال پر تل گئے تھے۔ تقریباً پچاس ہزار وظیفہ یاب جنھیں مہینوں سے تنخواہیں نہیں ملی تھیں بے صبری کے ساتھ پنشن کی رقم کا انتظار کر رہے تھے۔

فوری ضروریات کو پورا کرنے کیلئے مسٹر ملسپا نے امپریل بنک ایران سے چالیس لاکھ تومان قرض لے کے کام شروع کر دیا۔ لیکن یہ کام آسان نہ تھا اس لئے کہ ملک کے غیر منظم ہونے سے معاشی اور معاشرتی صورت حال ابھی تک ابتدائی حالت میں تھی۔ ہر جگہ یہی ہو رہا تھا کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" غربا تو محصول ادا کرتے لیکن متمولین اکثر ٹالتے رہتے تھے۔ ملک میں قاعدہ و قانون مفقود باہر والوں کو مداخلت کا استحقاق نہ تھا۔ مسٹر ملسپا کی رائے میں اہل ایران خود اپنے ملک کے سنبھالنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ بشرطیکہ مرکزی حکومت آئین و قوانین جدیدہ پر عمل پیرا ہو کیونکہ ملکی فلاح و آسودگی اور مستقبل کی ترقی اسی پر منحصر تھی۔

مسٹر ملسپا نے ملک کی زبوں حالی کی پوری کیفیت رضا خاں کے ملاحظہ میں پیش کی۔ موصوف نے ان کی ہر طرح تائید اور مدد کرنے کا پر زور وعدہ کر کے اطمینان خاطر سے کار مفوضہ انجام دینے کی ہدایت دی۔ حاصل یہ کہ رضا خاں کی توجہ تمام ملک کی تنظیم میں صرف ہوئی اور مسٹر ملسپا کی پوری دیکھ بھال حکومت کی انتظامی تشکیل میں۔ پہلے انھوں نے نمایاں رخنوں کا سد باب ضروری سمجھ کر تمام ایسے مرتشی اور بد دیانت عہدہ داروں اور ملازموں کو یکقلم برخاست کر دیا جنھوں نے یا خوب رشوت دے دیکر اور یا بڑے گھرانوں کی قرابت و سفارش سے ملازمتیں حاصل کی تھیں۔

صرف یہی ایک خرابی نہیں۔ عام ملازموں کی تنخواہوں کی غیر معمولی کمی ـــ

رشوت ستانی کا بازار گرم اور طرح طرح کے ناروا وسائل اخذ زر کیلئے اختیار کرنے سے چوری اور دغا بازی ایک خاص فن بن گیا تھا۔ تنخواہوں کی کمی کا اس تصریح سے بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ ٹیکس کلکٹروں اور انسپکٹروں کو ماہانہ چھ تومان جو ہندوستانی سکہ کے لحاظ سے نو روپیہ کے مساوی ہوتے ہیں ملتے تھے۔ اتنی کم تنخواہیں گزر وبسر کے لئے بھلا کیسے کافی ہو سکتی تھیں اور ایسی صورت میں ان فلاکت زدہ افراد سے امانت و دیانت کی توقع کس طرح کی جا سکتی تھی۔

مسٹر ملسپا کے نزدیک ایران میں رشوت ستانی کی اصلی وجہ زیادہ تر سیاسی اور انتظامی خامیاں تھیں نہ کہ ایرانیوں کے خصائص طبعی میں اس نقص کی پوشیدگی جب ملک میں نہ کسی قانون کا نفاذ ہو اور نہ کوئی تنظیم۔ وزرار اور گورنر انتظامی اختیارات کے خدمات ڈنکے کی چوٹ خرید رہے ہوں وہ ملازم جن کے ہاتھ میں سرکاری روپیہ کی ریل پیل ہو۔ ان کی تنخواہیں بسر اوقات کیلئے بالکل کافی نہوں تنگی بکھیڑوں میں پھنس کر حکومت پست سے پست تر ہو گئی ہو تو ایسی ہنگامہ آرائی ں دغا، فریب، رشوت ستانی، جعلسازی، تغلب و تصرف جو بھی نہ ہو وہ ہت کم ہے۔

مسٹر ملسپا نے یہ بگڑا ہوا رنگ دیکھ کر ملازمین کی تنخواہیں دُگنی اور بعض جگہ سب قابلیت تگنی کر دیں۔ انھوں نے انتظامات میں نگرانی اور تنقیح کے ایسے طریقے ی کئے جو پہلے بالکل نہ تھے۔ اس نہج انتظام نے قالب حکومت میں نئی روح

پھونکدی اور درستی معاملات کے بعد مسٹر ملسپا نے اس طرح اپنی رائے کا اظہار کیا:۔

ملک ایران کے مالیات کو دیکھ کر بید مڑک یہ کہہ بیٹھنا کہ ایرانیوں میں اس کے سنبھالنے کی صلاحیت ہی نہیں صحیح نہیں ہو سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایرانیوں میں مالی معاملات کو سمجھنے کی بہت کچھ قابلیت موجود ہے بہت سے ایرانی پہلے بھی تھے اور اب بھی موجود ہیں جو ہماری طرح نہ صرف اس سے واقف ہیں کہ کیا اصلاحی طریقے اختیار کرنے چاہئیں بلکہ ان میں کام کرنے کی مناسبت سے طاقت، ہمت اور خواہش یہ سب باتیں موجود ہیں کون ایسا ملک ہے جو مالی مشکلوں اور پیچیدگیوں سے دوچار نہ ہوا ہو مسئلہ مالیہ کوئی مستقل فن نہیں۔

تمام مغربی ممالک کو مالی مشکلیں پیش آ چکی ہیں اور محض تجربہ نے ان کو سکھایا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ اب تک ایران کو موقع ہی نہ ملا کہ وہ کوئی معقول نظام سیاسی قائم کر سکتا۔ جنگ اور اس کے بعد ہی معاشی نقصانات نے بدانتظامی کی خرابیوں میں اور اضافہ کر دیا۔ ابھی ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر آہستہ آہستہ معاشی الجھنوں سے نکلنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ جگہ جگہ تجارتی کساد بازاری نظر آنے لگی۔ چنانچہ بعض وہ تجار اور بڑے بڑے ساہوکار جو جنگ سے پہلے فارغ البال اور نہایت مرفہ الحال تھے دیوالیہ ہو گئے۔ اسی طرح کبھی جو بڑے بڑے زمیندار تھے اب وہ ہی فلاکت اور

تہی دستی کے بیمار بن گئے۔ بڑے بڑے کارخانے بند۔ ہر طرف اضطراب و انتشار۔ ملک میں کوئی شہر قصبہ یا موضع ایسا نہ تھا جہاں خوشحالی نظر آتی ایسی حالت میں یہ بات تعجب خیز تھی کہ ایک ذمہ دارانہ طرز حکومت پہلے کی طرح جاری رہا اور اس خلفشار میں انقلابی یا بالشویکی رجحانات سے متاثر نہ ہونا ایرانیوں کی فطرتی مستقل مزاجی کی دلیل تھا۔"

مسٹر ملسپا نے پہلے حکومت کی خامیاں دور کیں اور پھر محصولات کے ذرائع پر نظر ثانی کر کے ان کو ترقی پذیر بنایا۔ اکثر محصولات معینہ تھے۔ جن محصولوں کی وصولیابی راست کی جاتی ان میں سے بہت سے بجائے نقد کے جنس کی صورت میں وصول ہوتے تھے۔ ذرائع نقل و حمل کی مشکلات کی وجہ سے ایسے اجناس جیسے کہ گیہوں، جو، بھوسہ، چاول یا دوسری پیداوار جو محصولات کی صورت میں وصول کی جاتی وہ نقدی میں بآسانی تبدیل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ کبھی پوری وصولیابی کی نوبت ہی نہ آتی۔

شاہ کے فرمانوں کی متابعت میں مقتدر افراد اور اہل دربار کے استثنائی حقوق نظر انداز نہیں ہو سکتے تھے۔ محصولات وصول کرنے والے محصول دہندہ اشخاص کو اپنی جانب سے اکثر خانگی رسیدیں دے کر سرکاری مالگذاری خزانہ میں داخل کرنے کے بجائے اس سے اپنی جیبیں بھر لیتے۔ خزانے کے خالی رہنے کی وجہ سے وظیفے اور تنخواہیں عموماً اجناس کی صورت میں ادا کرنے کی نسبت ٹکس کے کلکٹروں کے نام راست احکام بھیجے جاتے تھے۔

جب مسٹر شسترایران کے مشیر مالیات مقرر ہوئے تو ان کے سامنے وزیر دربار کی جانب سے ایک عجیب مضحکہ خیز مطالبہ پیش ہوا جس میں شاہی شتر خانے اور موٹر خانہ کے لئے تیل اور بھوسہ خریدنے کی منظوری چاہی گئی تھی مسٹر شستر اس نئے مطالبہ کو دیکھکر بہت بگڑے اور چین بجبیں ہو کر کہنے لگے کہ" یہ میرے عہد کی انتہائی تذلیل ہے صرف ایران ہی ایک ایسا نرالا ملک ہے جہاں سرکاری اونٹوں اور موٹروں کے لئے تیل اور چارہ مہیا کیا جاتا ہے"۔ لیکن پھر انھیں معلوم ہو گیا کہ مطالبہ غیر واقعی نہ تھا۔ کیونکہ جلد نرم اور چکنی رکھنے کیلئے ایک خاص قسم کا تیل اونٹوں کے بدن پر ملنے اور شاہی موٹر خانہ کے ملازمین کی تنخواہوں کو چارے کی شکل میں دئے جانے کا دستور تھا۔

مسٹر ملسپانے وصولیابی کے طریقوں میں حسب ضرورت تبدیلیاں کیں اور رضا خاں نے اس جدید معاشی لائحۂ عمل کو بروئے کار لانیکے لئے ضروری اختیارات کے ساتھ حسب ضرورت انھیں فوج بھی دی۔ ۱۹۲۵ء میں فوجی روز افزوں مصارف اور سرکاری ملازموں کی تنخواہوں میں اضافہ کے باوجود مسٹر ملسپانے ایک ایسا موازنہ پیش کیا۔ جس میں تاریخ ایران کے لحاظ سے پہلی مرتبہ بچت دکھائی گئی تھی۔

۱۹ مئی ۱۹۲۵ء میں لارڈ بلفور نے دارالامرا میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

" ایران کے متعلق جو اطلاعیں ملی ہیں۔ ان کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ

آج ایران کا مالیہ بہت سی بڑی بڑی سلطنتوں کے مالیات سے بہتر ہے
ایران نے ایک ایسا موازنہ مرتب کیا جو عملاً نہایت درست و مناسب ہے
اور یہ سب کچھ ان امریکن مشیران مالیہ کی کوششوں کا نتیجہ ہے ۔
جنھیں ایران نے اپنی کونسل میں جگہ دی۔ بعض امریکن نکتہ چینوں کا
یہ خیال ہے کہ انگلستان ایران کی خودمختاری میں مداخلت کر رہا ہے
یا کرنا چاہتا ہے۔

اِس قسم کی ناتواں بینی اِس لئے صحیح نہیں کہ دولت برطانیہ کا
ہمیشہ سے ایران کے متعلق یہی نظریہ رہا ہے کہ جہاں تک اُسکے مفاد کا
تعلق ہے۔ ایران کو ایک خودمختار آزاد اور قوی ہمسائے کی صورت میں
وہ دیکھنا چاہتی ہے۔ آپس کے تعلقات مساویانہ رہیں۔ اِس لئے
کہ ایران کی عمدہ حکومت، تہذیب اور اقتدار کو برطانیہ مشرق میں امن عامّہ
کا ضامن سمجھتا ہے۔ وہی نظریہ اب بھی ملحوظ ہے ہم ایران کی خودمختاری
کے خواہاں اور ایران کو آسودہ حال دیکھنا چاہتے تھے۔ اب ہم خوش ہیں
کہ ایران کی خودمختاری محفوظ ہوگئی اور وہاں مرفہ الحالی میں روز بروز
ترقی ہو رہی ہے۔"

یہ صحیح ہے کہ ایران میں مالی حالت کو مستحکم کرنے کا سہرا امریکن مالی مصلحین
کے سر ہے لیکن ایرانیوں نے ان کے ساتھ تعاون اور آسانیاں پیدا کرنے میں

جس مستعدی اور قابلیت سے کام لیا وہ کبھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں مسٹر ملسپا کا بیان ہے کہ سب سے زیادہ ہمت افزا یہ بات تھی کہ اہل ایران سب خرابیوں کو خود محسوس کرکے تمام خرابیوں کو بطیب خاطر دور کرنا چاہتے تھے۔

مسٹر ملسپا کہتے ہیں کہ" ایرانی عادۃً پست ہمت اور کاہل نہیں۔ جب موقع آتا ہے تو وہ صرف اپنی جودت اور ذکاوت ہی نہیں دکھاتے بلکہ اپنی طاقتوری و مستعدی ظاہر کر دیتے ہیں۔ ایرانی مزدور جب کسی کام پر لگایا جاتا ہے تو وہ بڑی محنت سے انجام دیتا ہے۔ جو ایرانی محکمۂ مال میں ملازم ہیں انھوں نے اپنی فرائض شناسی وفاشعاری اور انہماک کار میں مسلسل جانفشانی کا ایسا نمایاں ثبوت پیش کیا کہ ممالک مغربی کے بہترین عہدہ داران مال سے ان کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ مانا کہ ابھی انھیں بہت کچھ سیکھنا ہے لیکن جہاں تک محنت وجفاکشی کا تعلق ہے ان میں ان عناصر کی کوئی کمی نہیں وہ اس قدر محنتی ہوتے ہیں کہ اوقات معینہ کے علاوہ بھی کام کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے اور بخندہ پیشانی مسلسل تعطیلوں سے بھی استفادہ نہیں کرتے امریکنوں کی حیثیت تو معلین کی سی تھی لیکن ایرانی قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے مغربی جدید اصول کو جذب کرلیا۔ ان کے محکمۂ مال میں آج کوئی ایک بھی بیرونی فرد نہیں۔ اس پر بھی کام نہایت عمدگی سے چل رہا ہے مسٹر داور مرحوم سابق وزیر مالیات کی غیر معمولی قابلیت تمام سفارت خانوں کے ارکین میں تسلیم کی جا چکی ہے۔ غرض کہ ایران کی موجودہ ترقی کو بالکل آورد نہیں کہا جاسکتا۔

مسٹر ملسپا کہتے ہیں کہ :-

"اسے محض نقالی یا توہم نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ ایران میں استفادہ کیلئے باہر سے ماہرین علوم و فنون کے بلانے کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ اپنی سیاسی دست نگری اور خود اعتمادی کے ساتھ کام کرنے کی نااہلی کے مقر ہیں۔ یہ معاملہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے یورپ کی کوئی یونیورسٹی کسی دوسری یونیورسٹی کے پروفیسروں کو اپنے یہاں لکچر دینے کی دعوت دے۔"

سترھواں باب

اعلحضرت رضا شاہ پہلوی کے اصلاحات

سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک

مالی اصلاحات کے لئے مسٹر ملسپا کی جد و جہد کا چار سالہ زمانہ وہی تھا جس میں اعلحضرت رضا شاہ پہلوی کا آمرانہ التفات ملک ایران کو مرکز برتری پر لانے میں مصروف تھا۔ شاہ اور وزیر مال دونوں کی انتھک کوشش مزاحمتوں اور مشکلوں کے پہاڑ پیہم کاٹتی رہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ:۔

"دو دل یک شود بشکند کوہ را"

اعلحضرت کی دفاعی طاقت و قوّت فوج اور پولیس (نظمیہ) اور امنیہ ان تین شعبوں میں منقسم تھی" امنیہ" جس کا فرض راہوں کی دیکھ بھال و حفاظت ہے

یہ شعبہ نہایت ناکارہ بدچلن اور بددیانت افراد سے ایسا مملو تھا کہ مسافروں کی نگہبانی و محافظت کے بجائے رہزنوں لٹیروں سے محافظین راہ سازباز کرکے مسافروں کو لوٹتے اور مال تجارت کے ہضم کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔

تجارتی مال سے لدی ہوئی موٹریں سڑک پر رکواکر مال آتار لیا جاتا اور باقاعدہ دستخطی رسیدیں شوفروں کو اس لئے دیدی جاتی تھیں کہ مالکوں کی طرف سے تلف شدہ اشیاء کی نسبت شوفروں پر بے ایمانی کا الزام عائد نہو سکے۔ پولیس کی جمعیت جو ابھی تک افسران سویڈن کے تحت تھی کچھ بری نہ ہونے پر بھی موجودہ معیار سے پست تر تھی۔ دو سال کی قلیل مدت میں رضا شاہ نے ردّو بدل کرکے طرز جدید پر ان دونوں جمعیتوں کی ایسی بہتر تنظیم کی کہ کسی غیر آباد مقام پر بھی کوئی اگر اپنا گرانبہا سرمایہ بھول کے چھوڑ جائے تو اس کے تلف ہونے کا ذرا بھی اندیشہ نہیں۔

سنہ ۱۹۲۳ء تک ایک زبردست فوج تیار ہوکر چار حصوں میں تقسیم کردیگئی ان کے علاوہ ایک خاص بریگیڈ بھی تیّار ہوا۔ ملک میں اس طریقہ پر فوج متعین کی گئی کہ طہران کو فوجی مرکز قرار دیا۔ خاص طہران کی متعینہ فوج میں پیدلوں کے دو، سواروں اور توپخانے کا ایک، ایک کل چار بریگیڈ شامل تھے تبریز میں شمالی و مغربی حصۂ فوج کی چھاؤنی ایک بریگیڈ پلٹن اور ایک رسالہ توپخانے کی ایک رجمنٹ اور فوجی انجنیروں کی ایک جمعیت پر مشتمل تھی۔

کرمان شاہ میں مغربی فوج کا پڑاؤ تھا۔ کم و بیش اس کی تعداد بھی اسی کے برابر تھی جنوبی فوجوں کا مرکز شیراز تھا۔

شیراز، اصفہان، کرمان، نخجستان میں جنوبی مخلوط چار برگیڈز مساویانہ طور پر تقسیم کر کے ایک علیحدہ بلیٹن بوشہر میں متعین کی گئی۔ مشہد کو مشرقی فوج کا مرکز قرار دے کر صوبۂ خراسان کے مختلف مقامات پر چند برگیڈ متعین کر دئیے گئے تھے۔ اور ایک خود مختار برگیڈ بمقام گیلان متعین کر دیا تھا پورے ملک میں زبردست فوج کا جال سا بچھا دیا تھا۔ پائے تخت او ر دارالامارہ کی منظم فوج خود اعلیحضرت کی نگرانی میں تھی۔ شمالی حصۂ ملک میں قیام اقتدار و امن و امان سے شاہی کامرانی کی ابتدا ہوئی۔ اعلیحضرت نے مفسد و سرکش کوچک خاں کی سرکوبی کر کے بے لڑے بھڑے ایرانی آذربائجان کو مرکزی حکومت کے تحت لے لیا۔

پھر وہ سرحدی جنگجو قبیلوں سے ہتھیار چھیننے کیلئے بڑھے۔ قبائل کرد، لر، بختیاری قزاق اور دوسرے خانہ بدوش قبائل وغیرہ اپنے اپنے سرداروں کے تحت مدت سے آزادی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ سب باجگذار بھی تھے مگر ایسے کہ کبھی برائے نام کچھ ادا کیا بھی تو وہ سرداران قبائل نے لیکے چپکے سے اپنی جیبوں میں ڈال لیا۔ شاہی سطوت نے ایک سال کی قلیل مدت میں لڑائی بھڑائی کے بغیر ایسے جنگجو، بدسرشت، اکھڑ، شوریدہ پشت اشخاص سے

ہتھیار رکھوالئے اور وحشی لوگوں کو متمدّن بنا دیا۔

اکتوبر ۱۹۲۳ء میں مشیر الدّولہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اب کسی کی ہمّت نہ تھی کہ وزارت عظمےٰ کیلئے اپنا نام پیش کرسکے۔ اِس اہم عہدۂ جلیل کا رکھ رکھاؤ آسان نہ تھا۔ اب تک کوئی وزیر عظم ایک سال سے زیادہ یہ بار گران نہ اُٹھا سکا تھا جب اِسکے لئے کوئی آمادہ نہ ہوا تو رضا خاں یہ کہتے ہوے آگے بڑھے کہ:۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنام منِ دیوانہ زدند

ملک کے ہر ایک فرد نے خیر مقدم کیا کیونکہ نہ صرف فوج ان کی دلدادہ تھی بلکہ اہل ملک بھی انہی کی ذات ستودہ صفات کو مرکز امید و آرزو تسلیم کر چکے تھے وزیر جنگ اور کمانڈر افواج کے اہم ترفرائض کے علاوہ وزارت عظمیٰ کا بارگراں اٹھاتے ہی خوزستان کی ابتر حالت کی درستی و اصلاح کی طرف یہ متوجہ ہوے خوزستاں کے عرب مدتوں سے خود مختار بن بیٹھے تھے۔ کیونکہ اِس صوبے میں حکومت طہران کی جانب سے گورنر کے قدیم طریقۂ تقرر کو کسی بنا پر ترک کردیا گیا تھا۔ اینگلو ایرانین آئل کمپنی کا تیل کے چشموں پر تصرف اور کاروبار تجارت کے فروغ نے اِس صوبہ کی حیثیت کو ممتاز بنا دیا تھا۔ تمام ممالک عرب عراق و ایران میں بحر احمر سے بحر خضر تک کوئی حکمراں یا سردار دولت و تموّل میں شیخ محمّرہ کی ٹکر کا نہ تھا۔ لوریوں اور بختیاریوں جیسے زبردست قبائل کے

ہتھیار چھن جانے کے واقعے سے عروج واقتدار رضوی پر اُس کی خوفناک نظریں پڑ رہی تھیں۔

۱۹۲۳ء کے اختتام سے ۱۹۲۴ء کا ابتدائی زمانہ شیخ کے لئے سخت اضطراب آور تھا۔ اسنے اپنے بچاؤ کیلئے بعض ذی اثر اراکین مجلس کو رشوت دینے کی کوشش کر کے رضا خاں کے خلاف ابھارنا چاہا۔ لیکن ناکام رہا پھر اپنے ہمسایہ قبائل کو جنگ آزادی کے لئے ورغلا کے فوج روپے اور تمام جنگی سامان سے بختیاریوں اور کوشکوں کی اعانت کی۔ بختیاری ضبطی اسلحہ کی کارروائی سے ایسے برافروختہ تھے کہ ۱۹۲۴ء کے آخر میں جنوب کی جانب سے سخت بغاوت کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ بعض ایرانیوں کے خیال میں شیخ کی بغاوت پر آمادگی برطانیہ کے اشارے سے تھی۔ اِس سے بڑھ کر غلط فہمی اور کیا ہو سکتی ہے ؟ اِس لئے کہ رضا خاں کے حصول اقتدار کی ابتدا سے آخر تک برابر برطانیہ کی روش مخلصانہ و دوستانہ رہی کیونکہ وہ ہمیشہ سے ایران کو خودمختار و مرفہ الحال دیکھنا چاہتا تھا۔

صوبہ خوزستان کو دولت برطانیہ اپنے زیر سیادت لینا چاہتی تو ایرانکی بیدستی پائی کے زمانے ہی میں اسے کب کا ہضم کر چکتی۔ بہر طور یہ امر کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں کہ برطانیہ نے ایسے دور اصلاح و تنظیم میں رضا خاں کی مخالفت اور فتنہ و فساد برپا کرنے کیلئے شیخ کو آمادہ کیا ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ روابط دوستانہ کی

بنا پر بوقت ضرورت شیخ نے برطانیہ سے خواہش امداد کی ہو اور شاید یہی بات اِس افواہ کی بنیاد بن گئی کہ شیخ جی پر ہاتھ ڈالنے سے برطانیہ کی مخالفت کا امکان ہے۔

مگر رضا خاں نے ان افواہوں کی مطلق پرواہ نہ کی اور حدودِ خوزستان پر اجتماع افواج کے احکام دے کے خود شیراز روانہ ہو گئے۔ جہاں سے شیخ کے صوبے پر دھاوا کرنے کا پورا انتظام کر لیا تھا۔ رضا خاں کی مستقر شیراز کی طرف روانگی کی اطلاع نے شیخ جی کو ایسا حواس باختہ کر دیا کہ ان کی رگ مقاومت کو جنبش تک نہ ہوئی اور برقیے کے ذریعے رضا خاں سے اپنی گذشتہ بدکرداری کی معافی مانگ کر مرکزی حکومت کی متابعت کا اقرار کیا۔

رضا خاں نے برقیہ ہی سے جواب دیا کہ قبول اطاعت برقیے کے توسط سے قابل پذیرائی نہیں۔ پھر وہاں سے بوشہر روانہ ہو کر جنگی جہاز "پہلوی" پر سوار ہوئے اور شیخ جی کے مستقر پہنچے تو مقام نصیری میں یہ نظر فروز منظر دیکھ کر تعجب ہوا کہ بجائے مدافعت شیخ جی کے خوف زدہ حاشیہ نشینوں نے ان کے اعزاز آمد میں چراغاں سے تمام شہر کو پر نور بنا دیا ہے۔ شیخ صاحب اپنے نونہالوں اور بختیاری باغیوں کے سرداروں کو لئے رضا خاں کے روبرو حاضر ہوئے اور حکومت کی حلقہ بگوشی تسلیم کر لی ان کی التجائے اطاعت و فرمانبرداری قبول کر کے مستقل طور پر صوبۂ خوزستان پر ایک گورنر اور فوج کا ایک دستہ متعین کیا گیا تاکہ امن و امان قائم رہے

علاوہ ازیں شیخ سے نہ صرف حالیہ مالگزاری بلکہ بقایا بھی جو تعداداً پانچ لاکھ تومان (یعنی تقریباً دس لاکھ روپیہ) ہوتی تھی۔ وزارت مالیہ کو وصول کرنے کا حکم دیا۔

شیخ محمرہ کو جنگ کے بغیر مطیع کر لینا آسان بات نہ تھی۔ رضا خاں کے اس کارنامے کا ملک میں گھر گھر چرچا ہونے لگا۔ جب رضا خاں بغداد شریف کی راہ سے طہران واپس آنے لگے تو کربلائے معلّٰی میں قیام کیا۔ اور عتبات عالیات کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس موقع پر عراق کے ایرانیوں نے جوش عقیدت سے اپنے بادشاہ کے ہر ہر قدم پر ایک ایک بکرا قربان کیا۔ اس دھوم دھامی خیر مقدم کا سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ تھا کہ ایک ایرانی اپنے دو لڑکے بادشاہ کے قدموں پر بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کرنے کے لئے لایا۔ رضا خاں نے اسکے تیور پہچان کر کہا کہ ٹھہرو، اپنے بچوں کو مجھ پر قربان کرنے کے بجائے اس امنگ کے ساتھ جوان ہونے دو کہ وہ ملک کی بہترین خدمت کر سکیں۔ یہی وہ توقع ہے جو میں ہر مُلکی سے رکھتا ہوں۔

رضا خاں کی غیر معمولی قابلیت بہترین تنظیمی صلاحیت اور ملک کو مرفہ الحال خود مختار بنانے کی پر جوش اہلیت نے ایرانیوں پر اپنی عظمت منزلت کا سکّہ بٹھا دیا تھا۔ اور مسلسل کامیابیوں کے سلسلے سے ان کی سربلندی و برتری ایسی

مسلّم ہوچکی تھی کہ ارکان مجلس کی نظر میں ان کی ہر بات قانون کا درجہ رکھتی تھی۔

مشہور ہے کہ جب رضا خاں کربلا سے واپس آئے تو اپنے قائد اعظم کے دیدار کیلئے جس نے مصائب کے دریا میں کود کر دست استقلال و تدبّر سے ملک کی کشتی تباہی کے بھنور سے نکالی تھی۔ اسکے کاشانہ اقبال پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں صرف انھیں کی ایک ایسی ذات تھی۔ جس کی جانب پورے ملک کی ٹکٹکی بندھ گئی تھی۔

جس طرح رضا خاں کی عسکری اعلیٰ قابلیت لاجواب تھی۔ ایسی طرح ان کا ناخن دانش و تدبّر سیاست مدن کی اُلجھی ہوئی گتھیاں سلجھانے میں بینظیر تھا۔ وہ ان بڑے بڑے تغیّرات سے بیخبر نہ تھے جو ان کی ہم مذہب و ہمجوار سلطنت ٹرکی میں تدریجاً معاشرت یورپ اختیار کرنے کی شکل میں رونما ہو رہے تھے وہ مغربی تمدّن و معاشرت کی طرف ٹرکی کے جوش اقدام کو بہ نظر تعمق ایسی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے کہ غالباً ان کی یادداشت برابر اس قسم کے فوٹو لے لیکے جمع کرتی چلی جاتی تھی۔ کیونکہ یہ بھی اپنے مطمح نظر کی یکسانی کے لحاظ سے دوسرے مصطفٰے کمال تھے۔ صرف طرز عمل کا اتنا سا بل تھا کہ معاملات ملکی میں نہایت احتیاط سے قدم بڑھاتے وقت یہ تعجیل سے احتراز کرتے تھے۔

یہ مصطفٰے کمال کے سے لمبے لمبے ڈگ بھرنے کو اچھا نہ جان کے پروقار معتدل رفتار سے بڑھنے کے عادی تھے۔ ملک میں تحریک جدید کے اسی طرح

دلدادہ ہونے پر بھی اپنی طرف سے اسکی ابتدا نہیں چاہتے تھے، اہل ملک کے جذبات قومی کو بیدار کرنے کے بعد انھیں انتظار رہا کہ معاملات کا بہاؤ اپنی سمت کب معیّن کرتا ہے۔ مغربی تمدّن و معاشرت اختیار کرنے کے متعلق ان کا رجحان ملک کو بالکل مغربی بنانے کا نہ تھا۔ قدیم ایرانی تمدّن اور مغربی معاشرت کے امتزاج سے وہ چاہتے تھے کہ اہل ایران اپنی قومی وجاہت کو برقرار رکھتے ہوئے زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں۔

۱۹۲۴ء میں قیام حکومت جمہوری کی عام تحریک نے بڑھ کر رضا خاں کو صعوبت انتظار سے بچا لیا۔ کیونکہ یہ مدت سے اسی نظارے کیلئے چشم براہ تھے۔ ٹرکی میں جدید قومی تحریک کی نمایاں ترقی ہاتھوں کی لکیروں کی طرح ان کے پیش نظر تھی۔ اپنے نام پر صدارت جمہوریت کا قرعہ فال نکلنے کی قوی امید نے اِس معاملہ میں اپنی ذاتی رائے ظاہر کرنے سے انھوں نے انکار کر دیا۔ طہران کے اخباروں نے بڑے زور شور سے شخصی حکومت کی مخالفت شروع کی۔ ملک کے قومی بہی خواہ انقلاب پسند آزاد خیال افراد نے بالاتفاق قیام حکومت جمہوری پر اصرار کیا۔

تمام صوبوں سے جمہوریت کے قیام کیلئے تاروں کی بھرمار ہوئی اور کچھ ایسے مظاہرے ترتیب دیے گئے کہ سرکاری دفاتر بند ہو گئے، رضا خاں کے سامنے سپاسنامے پیش کئے گئے۔ اور قیام جمہوریت میں تعجیل کیلئے اصرار کیا۔

لیکن ابھی تک رضا خاں موقع و محل کو اس تحریک کے مناسب جان کر خود بڑھنے سے بیچ رہے تھے۔ جمہوری حکومت کی موافقت میں ملک ہا ہمی اور غیر معمولی سرگرمی کے باوجود بھی آنے والا یہ خطرہ ان کے پیش نظر تھا کہ ملک میں ابتک ملاؤں یا مذہبی آمروں کا اقتدار بہت کچھ باقی ہے۔ معاشرتی اور سیاسی اصلاحات کے بارے میں یہ سخت مخالف تھے۔ مجلس مدرس جو ان کا نمائندہ تھا وہ ان کا بڑا مؤید تھا۔ ملک میں زبردست قدامت پسندی کی وجہ سے تحریک انقلاب کی بارآوری دشوار تھی۔

تاہم انقلابی تحریک بتدریج قوی ہوگئی۔ انعقاد مجلس کے دو ایک دن بعد ایک ضروری جلسہ منعقد کیا گیا جس میں اگلے پچھلے سب وزرا اسی مسئلے پر غور اور بحث کیلئے جمع ہوئے۔ قیام جمہوریت پر سب نے اتفاق کر کے وزیر اعظم سے اس کے اعلان کی درخواست کی۔ لیکن رضا خاں اب بھی اس بارے میں پس و پیش کرتے رہے۔

اسی سال ترکی پارلیمان نے خلافت عثمانیہ کے شخصی اقتدار کا خاتمہ کرنے اور مذہب اسلام کو گرد تعصب سے پاک و صاف کرنے کیلئے ایک انقلابی تحریک کی ابتدا کی۔ گو مذہبی اعتقادات کے لحاظ سے ترکوں اور ایرانیوں میں کافی اختلاف تھا۔ اس پر بھی مجتہدین ایران اہم تغیرات ترکی کو نہایت خطرناک سمجھ کے اس سوچ میں پڑ گئے کہ جمہوریت ایران بھی اسلام پر کہیں ایسا ہی وار نہ کر بیٹھے۔

انھوں نے اپنے پورے اختیارات اِس تحریک کی پرزور مخالفت میں صرف کردیئے ایران کے تقریبًا تمام مولوی، ملّا، مقدّس افراد شہر قُم میں جمع ہوئے اور عوام کو سکھا پڑھا کر مجلس پر دباؤ ڈالنے کی پوری کوشش کی۔

رضا خاں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اِس خطرے کو وہ پہلے ہی محسوس کر کے بجائے خود تصفیہ کر چکے تھے۔ انھوں نے بڑی احتیاط اور نہایت سنجیدگی سے کام لیکر اس بارے میں آشتی اور نرمی اختیار کی۔ اور علمائے مقدرسے مشورہ کے لئے قُم پہونچکر ان سب کو ہموار کرنے کے لاکھ لاکھ جتن کئے۔ لیکن وہ کسی طرح قابو میں نہ آئے۔ مجبورًا انہیں علمار کے مطالبات قبول کرنے پڑے۔ اور طہران واپس آکر یہ فرمان جاری کردیا کہ از روے اِسلام مجلس شوری کا قیام ناروا اور ناجائز ہے۔

اِس موقع پر جو خاص رعایتیں ملاؤں کے ساتھ روا رکھی گئیں۔ یہ رضا خاں کی شکست نہ تھی بلکہ مآل اندیشی و مدّبری کی ایسی گہری چال تھی جس نے آگے بڑھ کر ملاؤں کو نہتّا اور از کار رفتہ کردیا۔ صبر و عاقبت بینی ایرانیوں کی قومی خصوصیات کا نمایاں جوہر ہے۔ اپنی مخالفت کے بسود ہونے کا یقین انھیں فورًا جھکا دیتا ہے اور وہ فروتنی پر اُتر آتے ہیں۔ لیکن یہ انکسار و فروتنی دوامی نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ کھوئی ہوئی قوت کو پھر حاصل کرنے اور دُگنی طاقت سے غنیم پر جھپٹ پڑنے کی گھات میں رہتے ہیں۔ بظاہر تو ملاؤں کی بن پڑی اور فتح ہوئی لیکن یہ دیرپا نہ تھی

اسے قدامت پسندی اور ترقی جدید کی لازمی قوتوں کے درمیان عارضی مصالحت سمجھنا چاہیئے۔ مدتوں سے ملاؤں نے تمام ملک میں جو اودھم مچا رکھا تھا رضا خاں اس سے بیخبر نہ تھے۔ اصلاحات کی راہ میں مزاحمت اور رکاوٹ پیدا کرنے والی انکی ضد اور ہٹ سب ان کے پیش نظر تھی۔ لیکن جاننے پر بھی ان کی کجردی اور فتنہ پردازی پر سکوت اختیار کرنا اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا ہی تقاضائے وقت تھا۔

اس واقعے سے کچھ ہی دن بعد ماژندران اور خراسان پر استرآباد کے ترکمانوں کی چڑھائی کی اطلاع سے رضا خاں کو اپنی بیجگری وبہادری دکھانے کا اچھا موقع ہاتھ آگیا اور اپنا لشکر جرار لیکر ان حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑے یونہی سے مقابلہ کے بعد دشمن نے ہتھیار ڈالدیے اور مرکزی حکومت کی اطاعت قبول کرلی۔ تمام ملک کو ایک منظم شکل میں لانے کا کام گویا انجام پا چکا اور اب کسی طرف سے قبائل کے سر اٹھانے کا کوئی خطرہ بھی باقی نہیں رہا۔

سنہ ۱۹۲۵ء کے اوائل میں رضا خاں مظفر ومنصور طہران واپس آئے۔ ان کی ہردلعزیزی معراج پر پہونچ گئی۔ تحسین وآفرین کے غلغلہ سے سارا ملک گونج اٹھا۔ سیاسی انجمنوں کے نمائندے بدل معترف تھے کہ قیادت ورہنمائی کی غیرمعمولی قابلیت وصلاحیت آج رضا خاں کے سوا کسی میں نہیں۔ یہ ملک کی خوش نصیبی تھی کہ بروقت وحسب ضرورت اسے بہترین قائد ورہبر مل گیا۔

ممکنہ ذرائع سے ایران کو مرکز ترقی پر لاکر رضا خاں نے اہل ملک کو دکھا دیا کہ خاندان قاچار کے دیرینہ جابرانہ وظالمانہ طرز فرمانروائی کے مقابلے میں ان کا جدید نصفت شعارانہ نہج حکمرانی حقیقی طور پر انہی کو وارث افسر واورنگ قرار دیتا ہے جب ان کا پورا انہماک مہمات ملکی میں صرف ہو رہا تھا تو اس وقت بیرون ملک سیر وسیاحت کی دلچسپیاں احمد شاہ کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے تھیں زمام سلطنت اسی کے چھوٹے بھائی کے ہاتھ میں تھی جو نہایت حسین وجمیل شہزادہ تھا لیکن صورت ہی صورت تھی سیرت کے لحاظ سے یہ بھی مطلق اہلیت حکمرانی نہ رکھتا تھا۔

سنہ ۱۹۲۵ء کے آخر میں بادشاہت اورخاص کر رضا خاں کی ہر دلعزیز شخصیت کے سوال نے ایک خاص اہمیت اختیار کرلی۔ پارلیمنٹ میں احمد شاہ اور ان کے جانشین کی اب کوئی وقعت باقی نہ تھی۔ اس لئے حکومت قاچار کا خاتمہ کر کے زمام سلطنت رضا خاں کے ہاتھ میں دیدی گئی۔ احمد شاہ کے بھائی کو مع اہل وعیال سرحد بھیجدیا۔ پھر وہاں سے کچھ گزر بسر کیلئے دے کر اسکے بڑے بھائی کے پاس فرانس روانہ کردیا۔ ملک کے استعمار جدید میں رضا خاں کی غیر معمولی کدوکاوش سے بے انتہا متاثر ہو کر مجلس نے وراثت اولاد ذکور کے تحفظ حقوق کے ساتھ ان کی شہنشاہی کا اعلان کردیا۔

یہ ہے خلاصہ ان تمام واقعات کا جو رضا خاں کی ان مختلف النوع قابلیتوں کو

روشنی میں لائے۔ جنھوں نے انھیں ایک معمولی سپاہی کے پست درجہ سے شاہی کے بلند مرتبہ پر پہونچا دیا۔

بعض ایرانی رضا شاہ کی تخت نشینی کو برطانیہ کا منت پذیر ٹھہراتے ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ڈیڑھ سو برس کی جمی جمائی شخصی سلطنت کو بے چون وچرا پارلیمان کی صرف ایک نشست نے کیسے ختم کر دیا۔ اور تمام شاہی خطابات جیسے "شاہنشاہ"، "ظل اللہ"، "نائب الصمد"، "جہان پناہ" وغیرہ نیز سلطانی اقتدارات محض ایک جنبش قلم سے اس ہستی کی طرف منتقل ہو گئے جسے وراثتہً تاج وتخت کا کوئی استحقاق ہی نہ تھا۔ یہ پورا واقعہ ان لوگوں کے نزدیک ایسا معمہ بن کے رہ گیا۔ جس کا قرین قیاس حل ان کی نظر میں صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس معاملہ میں پس پردہ طاقت برطانیہ کی کارفرمائی تسلیم کی جاے۔ لیکن یہ سب بے سروپا خیال آرائیاں دل کو نہیں لگتیں۔ اِس کج خیالی کی اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ روسیوں نے اِس طرح کی جوافواہیں پھیلانا شروع کی تھیں ظاہر بیں نافہموں نے بے سمجھے بوجھے انھیں سچ مان لیا۔ برطانیہ اور ایران میں سیاسی تعلقات کی جب سے ابتدا ہوئی اس وقت سے آج تک برطانیہ حدود ہندوستان وعراق کے درمیان ایران کو ایک مکمل خودمختار سلطنت دیکھنے کا آرزومند رہا۔

سلطنت ایران میں اعلےٰ نظم ونسق کا قیام جس کے لئے رضا خاں کو

اپنی پوری توجہ صرف کرنا پڑی۔ یہ سب اسکے حسب منشا تھا۔ ایران کو متحد کرنے اور بیرونی مداخلت سے آزاد کرنے میں رضا خاں کی انتھک کوششیں ایران کے استعمار جدید کی ابتدا کرکے خوش اسلوبی کے ساتھ اسے تکمیل پر پہونچانے کے لئے لائحۂ عمل کی تجویز وغیرہ ان سب باتوں کو برطانیہ نے نہایت خوشی و مسرت سے دیکھا۔ اور کبھی بالواسطہ یا بلاواسطہ ایران کے سیاسی معاملات میں اسنے مداخلت کرنے کی خواہش نہیں کی۔

شیخ محمرہ کو جو انگریزوں کی پشت پناہی میں خیال کیا جاتا تھا، مرکزی حکومت کی طرف سے اس کی پوری آزادی و خود مختاری سلب کرکے طہران میں رہنے پر مجبور کردیا تو انگلستان نے اشارۃً بھی کوئی احتجاجی شکل اختیار نہیں کی۔ برطانیہ نے نئی حکومت ایران سے آج تک کسی قسم کے رعایات یا مراعات حاصل نہیں کئے۔ اینگلو ایرانین آئل کمپنی کے معاہدے پر نظر ثانی کے بعد جو شرائط طے ہوئے وہ انگلستان کی بہ نسبت ایران کے لئے زیادہ منفعت بخش ہیں۔

رضا شاہ کی تاجپوشی میں پورا ملک جس جوش و انبساط اور فرط مسرت سے لبریز نظر آتا تھا یہ اِس بات کا پورا ثبوت ہے کہ اہل ملک دیرینہ خاندان قاچار کی جگہ نئے خاندان پہلوی کو دے کر کیسے شاد و مسرور تھے۔ اظہار نشاط صرف ایران ہی میں محدود نہ تھا بلکہ تمام وسط ایشیا تک یہ لہر دوڑ گئی تھی۔ تاریخ تاجپوشی سے دس دن پہلے جاذب نگاہ کھیل تماشوں اور طرح طرح کے طرب انگیز

جلسوں سے یہ جشن شروع ہو کر دس دن بعد تک منایا جاتا رہا۔

غرضکہ بتاریخ ۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء اہل ملک کے حسب خواہش وہ طلائی مرصع تاج جو اسی تقریب کیلئے خاص اہتمام سے تیار کیا گیا تھا زینت فرق شاہی ہوتے ہی دودمان پہلوی کا چشم و چراغ اورنگ نادری پر جلوہ گستر ہوا۔ اس تقریب مسعود میں وہ تمام رسوم انجام دئے گئے جو تاجپوشی کیلئے مختص ہیں۔ (یہ تخت نادری غالباً شاہ جہاں کا تخت طاؤس ہوگا۔ جسے نادرشاہ درانی ہندوستان سے لیگیا تھا)

قوانین دستور کے لحاظ سے اورنگ نشینی کے ساتھ ہی شاہ نے وزارت عظمیٰ اور وزارت جنگ کے خدمات نئی کابینہ کو تفویض کر کے فوج سے اپنا راست تعلق قطع کر لیا۔ مملکت کے انتظامی امور سے یہ کنارہ کشی ظاہری تھی ورنہ حقیقتہً خدمات ملک کی انجام دہی سب سے زیادہ التفات شاہی کا مرکز رہی۔

نئے اصول جنگ کے مطابق اپنی منظم فوج کی نگرانی میں کافی انہماک، ہر ایک وزارت کے کارمفوضہ کا خود بہ نفس نفیس معائنہ، شاہ کی بیدار مغزی و جفاکشی دیکھ کر اپنے ادائے فرض میں وزرا کی عرق ریزی، پارلیمان کی کارروائیوں سے بالذات شاہ کی باخبری، انعقاد مجلس کے دوران میں ہر ہفتہ ایک یا دو دفعہ ارکین پارلیمان کی مختلف اوقات میں باریابی، بعد مشورہ اہم مسودات قانون کی بحث و رائے زنی کے لئے ایوان وزرا میں پیشی، ملک کے خاص اداروں کا بغیر اطلاع معائنہ، سال بھر تک ایک دورہ کنندہ افسر کی طرح ملک کا دورہ کر کے صنعت و حرفت کے کارخانوں کی دیکھ بھال

رعایا کے نمائندوں سے ان کی صحیح حالت کی نسبت استفسارات، یہی سب باتیں اِس عہد نصفت کی اہم خصوصیات ہیں۔

ملکہ بھی صنف نازک کے مفاد کیلئے اپنے سرتاج شہریار کی طرح بغیر اطلاع زنانہ ہسپتالوں اور اسی قسم کے دوسرے اداروں کے معائنہ میں بڑی دلچسپی لیتی ہیں۔ سب سے بڑی شاہزادی شاہ دخت گرلس گائڈ کی سرگروہ اور ولیعہد بہادر یورپ کے تعلیم یافتہ اعلیٰ تربیت سے آراستہ، بوائے اسکاؤٹ ایسوسی ایشن کے سرخیل ہیں۔ حاصل یہ کہ تمام شاہی خاندان ملک کی بہبودی اور دولت کی ہر قسم کی اصلاحی سرگرمیوں میں شاہ کا شریک کار رہے۔

سنہ ۱۹۲۶ء میں اپنی رسم تاجپوشی کے بعد شاہ نے ملک کی معاشرتی اصلاحات کا ایک وسیع نظام العمل تیار کیا۔ اس سلسلہ میں ان کا پہلا نظریہ یہ تھا کہ مخالف ملاؤں کو جو سنگ راہ کی حیثیت رکھتے تھے اقتدار کی ٹھوکر سے ٹھکرا کر الگ کر دیا جائے۔

شاہ نے نہایت مآل بینی اور دور اندیشی سے انھیں ہموار کر کے ایسے تدابیر اختیار کئے کہ بظاہر تو ملاؤں سے انکا کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن حقیقت میں وہ کارگر تدبیریں ایسی کاری ضربیں تھیں جن سے اس جو فروش و گندم نما گروہ کی کمر ٹوٹ گئی۔

اٹھارھواں باب

ایران کے ملاؤں پر بیرونی اثرات

۱۹۰۶ء میں قیام حکومت دستوری کے وقت ملاؤں کا اقتدار بہت گھٹ چکا تھا، لیکن پھر بھی ان کے حقوق اور مراعات ابھی اتنے باقی تھے کہ بآسانی اُن سے انھیں محروم نہیں کیا جا سکتا تھا، جن خدمات پر وہ پشتہا پشت سے مامور چلے آتے تھے، ان سے ان کی فوری برطرفی معمولی بات نہ تھی، پیشۂ مدرسی اور محکمۂ قانون و عدالت پر انھی کا قبضہ تھا، کچھ ملا دیہات کے مدارس ابتدائی اور شہروں کی مساجد میں درس دیتے، اور کچھ پیش نمازی، روضہ خوانی یا موعظت کیا کرتے تھے، ان کے علاوہ دوسرے مختلف مدارج کے لحاظ سے ان سے بالاتر ہستیاں شارح و واضع قوانین معاہدہ کی حیثیت سے اپنے مکانوں پر اجلاس کر کے قرآن و احادیث سے مقدمات شرعی و دیوانی کے

تصنیفیں کیا کرتی تھیں، اور انہی میں سے جو اپنے علم و تقدس کی وجہ سے مدارج اعلیٰ پر پہنچ جاتیں، انھیں "حجۃ الاسلام" "صبغۃ الاسلام" "شیخ الاسلام" وغیرہ وغیرہ جیسے ممتاز خطابات دے کر مجتہد تسلیم کر لیا جاتا تھا، یعنی اسلامی معاملات میں انکی رائے حکم قطعی کا درجہ رکھتی تھی، ملاؤں کے نہایت ابتر اور ناکارہ مکتبوں کے سوا طرز جدید کی کوئی مقامی درسگاہ نہ تھی، متمول و دولت مند ان مکتبوں کو ناپسند کر کے اپنی اولاد کو تعلیم کے لیے یورپ بھیجتے تھے، ابتدا میں جن لوگوں نے مغربی ڈگریاں حاصل کیں اُن کے واسطے اپنے ملک میں ترقی کرنے کا بڑا پورا میدان تھا، لیکن ان کا یہ ایثار بھولنے کے قابل نہیں کہ انھوں نے اپنی ذاتی ترقیوں پر ملک کی معاشرتی اصلاح کی خدمت کو ترجیح دی، اس گروہ نے اُن قدامت پسند مخالفت پیشہ مُلاؤں کا مقابلہ کیا جو اصلاحِ ملک میں سدِ راہ ہو کر انھیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے رہتے تھے، جیسے ان معاشرتی رضاکاروں میں سے کئی کی زبانیں کاٹ لی گئیں، اور کتنوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا مگر یہ ہیبت سزائیں بھی اس جوش کو نہ دبا سکیں جو ملک میں پھیل چکا تھا، وہ افراد جو مُلاؤں کی دار و گیر سے بچ گئے نہایت استقلال سے وہ برابر مقابلہ کرتے رہے، انہی میں سے ایک کبیر السن بزرگ سید حسین عدالت نے دوران ملاقات میں اپنے صبر و تحمل اور اُن مصائب کی دردناک داستان مجھے سُنائی جو مُلاؤں سے آخر تک مقابلہ کرنے میں اُنھیں برداشت کرنا پڑے

سید حسین عدالت بیس سال کی عمر میں بغرض تعلیم روس گئے، لیکن اس وقت کوئی خاص مقصد پیش نظر نہ تھا، پانچ سال تک روسی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کی، اتفاقاً میونک میں سید جمال الدین افغانی مشہور علمبردار اسلام سے ملاقات ہوگئی، اُن کے اثر ہمنشینی سے خدمت مُلک کی انجام دہی کا تہیہ کر کے یہ وطن پلٹے، اور ملک میں مغربی آزاد خیالی، جمہوریت و اتحاد قومی کی داغ بیل ڈالنے کا عزم بالجزم کرلیا۔

روس میں جو منظر دیکھ آئے تھے اس کے برعکس تبریز کو دیکھ کر انھیں اپنا وطن جہنم معلوم ہونے لگا، خود کہتے تھے کہ میں نے جی میں ٹھان لی کہ یا اپنے ملک میں استعمار جدید قائم کر کے رہونگا اور یا پھر روس واپس جاکے وہیں رہ پڑوں گا، مجھکو ہر چیز سے نفرت معلوم ہوتی، خود میرا گھر مجھے کاٹے کھاتا تھا، اپنی والدہ بھائیوں اور بہنوں کو ایک آنکھ نہ دیکھ سکتا تھا، کیونکہ سب کے سب ایسی کاہلی کی پوٹ معلوم ہوتے تھے جن میں نہ کوئی مادۂ اختراع نہ حوصلہ مندی، اور نہ کچھ احساس عزت تھا، وہ سب راضی برضا ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھنے والے قطعاً اس سے لاعلم تھے کہ دُنیا میں کیا ہو رہا ہے، زندگی کی وقعت ان کی نظروں میں سرائے کے قیام سے زیادہ نہ تھی، یہ سب مُلاؤں کی پیدا کردہ بے حسی دور کرنے کے لیے سب سے پہلے اپنے گھر سے اسکی ابتدا کرنے کی ضرورت کا مجھے احساس ہوا۔

میں نے اپنے ہی مکان میں ایک چھوٹا سا مدرسہ کھولا، جس میں پہلے طلبا

میرے بھائی اور بہنیں تھیں، روس کے قومی ادب کی کتابوں میں سے کچھ جوشیلے اقتباسات میں نے منتخب کر کے سادہ ایرانی زبان میں اُن کا ترجمہ کیا اور اپنے شاگردوں کو پڑھ کر سنایا، جن میں زیادہ تر تعداد میرے جوان اعزا کی تھی، پانچ برس تک لگاتار تعلیم و تربیت سے جوان زن و مرد کی ایک ٹولی معاشرت کو سُدھارنے کے لیے تیار ہو گئی، سب کے سب میرے ہی نزدیک و دور کے رشتہ دار تھے، اور جن کے سینوں میں ملک کے بیدار کرنے کی آگ میں نے سُلگا دی تھی، ہمشیر نے لڑکیوں کی تعلیم کیلیے ایک مدرسہ قائم کیا اور میں نے لڑکوں کے لیے۔ میرے اکثر اعزا نے ان نئے مدرسوں کو شہرت دے کر لڑکوں اور لڑکیوں کو داخل ہونے کی ترغیب کا اہم کام خوش اسلوبی سے انجام دیا، جلسوں میں ہم پر طنز اور آوازے کسے جاتے تھے، ہمارے مدرسوں کا فرنیچر غائب کر دیا جاتا، اور یہاں کے لڑکے اور لڑکیوں کی راہ میں خوب دُرگت بنتی، اور مار پیٹ کی جاتی تھی، مگر ہم اپنی دُھن میں لگے رہے، مسلسل چار برس تک مُلاؤں اور متعصب عوام سے مقابلہ ہوتا رہا، آخر کار اپنے صبر و استقلال کا ہمیں پھل ملا، اور محبان وطن جیسے انقلابی اخبار "کاوا" کے ایڈیٹر تقی زادہ جن کی اہلیہ طہران کے زنانہ کلب کی صدر رہیں، اور سید محمد ابو ضیا اخبار "ایران" کے سب سے پہلے ایڈیٹر نے اپنا دست اعانت و امداد ہماری طرف بڑھایا۔

یہ جہاندیدہ افراد جو نئے اصلاحات آزادی کے مؤید تھے ان کی شرکت

بہت مفید ثابت ہوئی، ان کے علاوہ چند اور نوخیز بھی جو طہران کے امریکن کالج سے گریجویٹ ہو کر نکلے تھے ہمارے شریک کار ہو گئے، اب ہمارا جتھا پُر قوت ہو گیا اور ہم نے اپنے کام کا ایک وسیع پروگرام تیار کرلیا، میرے مدرسہ میں طلبا کی تعداد سات سو تک پہونچ گئی اور ہمشیرہ کے زنانے مدرسہ میں دو سو تک، میں نے مدرسہ کا کام اپنے احباب کے سپرد کرکے خود "حدید" اخبار جاری کر دیا، جس میں میری جانب سے مقامی حکام پر نکتہ چینیاں ہونے لگیں، اور اسی وجہ سے اخبار "حدید" حکماً بند کر دیا گیا، پھر حکمت عملی سے کام لے کر میں نے ایک دوسرا اخبار "صحبت" نکالا، جس کا نصب العین ہدایت مستورات تھا، مدرسہ کے ہر طالب علم کو اس اخبار کی ایک کاپی مفت اسلیے دیجاتی تھی کہ وہ اپنے گھر کی عورتوں کو پڑھ کر سنائے اسی اخبار کی ایک اشاعت میں میں نے لکھا "چونکہ جناب حوّا حضرت آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھیں، اور وہ اُن سے شریک زندگی کی حیثیت سے بہت محبّت کرتے اور ہمیشہ دونوں یکجا رہتے تھے، لیکن ہمیں اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ہماری بیویاں کیا ہماری بہتر شریک زندگی ہیں، اسی وجہ سے دوسری قومیں ہم کو حقارت سے دیکھتی ہیں، اہل یورپ کی انگشت نمائی اور تضحیک سے بچنے کے لیے یا تو ترقی معکوس کرکے انھیں ہماری طرح مسخ ہو جانا چاہیئے اور یا پھر ہم کو ترقی کرکے ان کی مماثلت اختیار کرنا لازم ہے، اسکے یہی معنی تھے کہ میں پردے کا کھلّم کھلا مخالف تھا، اسلیے ملاؤں نے مجھے زندہ جلا ڈالنے کی کوشش کی لیکن رفقاء

کی تعداد کافی ہونے سے وہ میرا بال بیکا نہ کر سکے، اُنھوں نے میری تخریب کے درپے ہو کر گورنر سے ایسی لگائی بجھائی کی کہ اُن کا دل ٹھنڈا کرنے کے لیے گورنر نے مجھے چھ سال قید با مشقت کی سزا دے دی، چونکہ اب ملک بیدار ہو کر ترقی کر چکا تھا، گورنر کے اس حکم سے نہ صرف ایران میں بلکہ ایران سے باہر ایرانی باشندوں میں بھی ایک ہیجان پیدا ہو گیا، مثلاً "میثاق" ایک ایرانی اخبار جو تفلس سے نکلتا تھا اُسکے مُدیر نے لکھا:-

"ہمارے دستور العمل کی تشکیل کے اہم نقائص میں سے ایک وہ دفعہ ہے جس کی رو سے شریعت یا بالفاظ دیگر قانون اسلام کے خلاف کچھ نہیں لکھا جا سکتا کیونکہ قانون اسلام کو مُلّاؤں نے ایسا کھیلا بنا لیا ہے کہ جدھر چاہیں پھیر دیں، ان جاہل مُلّاؤں کے ہاتھ میں یہ ایک بڑا خطرناک آلہ ہے، ہمارے دستور العمل کی یہ دفعہ سب سے زیادہ تباہ کن ہے، جس مقصد کے حاصل کرنے کے لیئے مُدّتوں سے ہم سر کھپا رہے ہیں، دستور العمل کی یہ دفعہ اُسے پنپنے نہیں دیتی، اس دفعہ کے نافذ رہنے تک کسی طرح بھی ہماری پیشقدمی ممکن نہیں، سید حسین مُدیر اخبار "صحبت" پر خلاف ورزی قانون کا مقدمہ دائر کیا گیا، اور چھ سال قید کی سزا دے کے ان کی ملکی خدمات کو بالکل نظر انداز کر دیا، ان کا سارا جوش و سرگرمی جو اپنے مُلک کی فلاح و بہبود کیلیے تھی، جُرم قرار دے دی گئی، اُنھوں نے اہل مُلک کی اس جانچ کے واسطے کہ وہ اصلاحات جدید قبول کرنے کے لیے کس حد تک آمادہ ہیں، ایک مضمون حقوقِ

نسواں پر لکھا، مگر یہ پورا منصوبہ خاک میں ملا دیا گیا' قوم کو ان کی سزا یابی کا بڑا صدمہ ہے، ملاؤں کا گروہ ابھی تک ہماری ترقی میں برابر رکاوٹیں پیدا کر رہا ہے، ہمیں اُمید تھی کہ اس دستورالعمل سے تقریر و تحریر کی آزادی مل جائے گی، لیکن ہماری اصولی اور علمی آزادی میں صریحاً بیجا مداخلت کی گئی "۔

مُلک کے گوشہ گوشہ سے ایسی صدائے احتجاج بلند ہوئی کہ مرکزی حکومت کو اس معاملہ میں دخل دینا پڑا، اور مُدّتِ سزا کے ابھی صرف تین ہی مہینے گزرے تھے کہ مجھے رہا کر کے طہران میں محکمۂ تعلیم کا ایک افسر بنا دیا گیا، اس اثنا میں اصلاح کارانِ معاشرت کی ملک میں تعداد بڑھنے سے ہر جگہ ایک پُرجوش کیفیت پیدا ہو گئی۔

مریم خانم ایک کردی خاتون اور نورالدجیٰ دخترِ امام الحکما جو غالباً ہندی نژاد تھیں یہ دونوں امریکن زنانہ کالج طہران سے گریجوٹ ہو کر نکلیں اور معاشرتِ نسواں کی تنظیمِ جدید میں بڑی سرگرمی سے مصروف ہوئیں، ایک اور خاتون طوبیٰ خانم جنھوں نے اپنے مکان ہی پر اعلیٰ تعلیم پائی تھی، اُنھوں نے بھی لڑکیوں کے لیے ایک ماڈل اسکول کھول دیا، طوبیٰ خانم نے اپنی انتظامی قابلیت سے پرخلوص کارکنوں کی ایک ایسی جماعت فراہم کر لی تھی، جس نے ان کے مدرسہ کو ترقی دے کر ایک اوّل درجہ کا ادارہ بنا دیا، آئندہ جب محکمۂ تعلیم کی طرف سے متعدد مدارسِ نسواں کھولے گئے تو صرف طوبیٰ خانم ہی کا ایک ایسا اسکول تھا، جو متعلمین کی روز افزوں ضرورت کو پورا کر سکا۔

میرا تبادلہ طہران سے گیلان ہوا، اور وہاں سے پھر طہران واپس کیا گیا جہاں محکمہ تعلیم کے چند ممتاز عہدوں پر فائز رہا، تقریباً آٹھ سال وظیفہ حسن خدمت حاصل کرکے اب مدارس کے نصاب کے لیے درسی کتب کی تیاری میں مصروف ہوں، جن لوگوں نے اصلاح و ترقی کا بیڑا اٹھایا ان میں سے سید حسین کے علاوہ ایک اور مشہور وطن پرست حاجی مرزا یحییٰ تھے، جن کی خدمات فراموش نہیں کی جا سکتیں، وہ قابل و روشن خیال مجتہدین دولت آباد کے خاندان سے تھے، کہا جاتا ہے کہ پہلے پہل انہی ہی کی سعی و کوشش نے ملک میں تحریک اصلاح معاشرت کی ابتدا کی، انھوں نے طہران میں ایک ماڈل اسکول قائم کرکے لڑکوں کے لیے دیسی زبان میں ایسی درسی کتابیں تصنیف کیں جو حب الوطنی اور تمدن جدید سے اُنس پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ تھیں، ان کا ایک چھوٹا سا رسالہ موسوم بہ "علی" تمدن جدید پر کامیاب و مفید کتاب ہے، اس کا وہ حصہ نہایت ہی دلچسپ اور بیساختہ ہے، جس میں ایک مدرسے کے طالب علم علی کا اپنی بہنوں سکینہ اور رقیہ سے مکالمہ لکھا گیا ہے، لڑکیاں کسی اسکول میں داخلے کی خواہش کرتی ہیں، اور جب ان کا بھائی کہتا ہے کہ لڑکیوں کے لیے کوئی مدرسہ ہی نہیں تو وہ آبدیدہ ہو کر اس دن کی تمنا کرتی ہیں، جب ملک میں ان کے لیے بھی کوئی درس گاہ ہو۔

اس کتاب نے تمام ملک میں مقبول ہو کر قیام مدارس نسواں کے مسئلہ میں کافی اہمیت پیدا کر دی، یہ دیکھنا تھا کہ اڑا کو ملاؤں کی برہمی نے اس فتوے سے کتاب کو

ممنوع الاشاعت قرار دیا کہ یہ محض تعلیم نسواں کی ترغیب کا ایک پروپگنڈا ہے، جس سے ان کی تفسیر قرآن اور احکام اسلام کی سخت خلاف ورزی متصور ہے۔ ملاؤں نے جوش غضب میں مصنف کتاب کے ہاتھ کاٹنے کا حکم بھی دے دیا، اُن کی خوش قسمتی سے وزیر اعظم اصلاحی خیالات کے مؤید تھے اسلیے انہی کی کوشش سے یہ فتوے منسوخ ہوا۔

اس واقعہ کے چند ہی سال بعد ان کے بھائی حاجی مرزا علی بھی ان کے شریک کار ہو گئے، دونوں بھائیوں نے ملکر مضامین و مواعظ کے ذریعہ سے اہل ملک کو معاشرت جدید کی طرف متوجہ کرنے میں بڑی کوشش کی، مرزا محمد یحییٰ نے معاشرتی صلاحات پر متعدد کتابیں لکھیں، انکی بہترین کتابوں میں سے چند یہ ہیں:-

(۱) "شاہراہ" لڑکیوں کے طریق تعلیم پر ایک رسالہ۔

(۲) "ارمغان یحییٰ" بچوں کی پرورش و تربیت پر رسالہ۔

(۳) "تعصب اطفال" میں ایسی شادیوں کی روک تھام کیلیے صدائے احتجاج بلند کی گئی ہے، جنھیں صرف والدین ہی اپنے طور پر طے کرنے کے عادی ہیں

قیام حکومت دستوری کے تین برس بعد ملک کی اس وقت کی حالت کے لحاظ سے ان دونوں بھائیوں کی انقلابی سرگرمیاں اتنی بڑھیں کہ دونوں کو جلاوطن کر دیا گیا، وہ بلجیم پہونچے اور وہیں سے اپنے ہموطنوں کے احساس قومی کو بیدار کرنے کے لیے اُنھوں نے ایران میں اخباروں اور رسالوں کی ڈاک بٹھا دی، پھر

ایران میں انقلابی گروہ نے ایسی طاقت حاصل کرلی کہ مرزا محمد علی کو اپنی کوشش بارآور کرنے کے لیے ملک میں واپس بُلالیا، وہ ایوان حکومت کے ایک مستعد اور جوشیلے رکن ہوگئے، لیکن عمر نے وفا نہ کی، پارلیمنٹ میں دو سال کی محنت شاقّہ برداشت کرنے کے بعد اُن کا انتقال ہوگیا۔

حاجی محمد یحییٰ ان کے بھائی بلجیم ہی میں رہے اور یہیں سے بیٹھے بیٹھے کسی رکاوٹ کے بغیر اپنے ملک کی ایسی خدمت کرتے رہے جو ایران میں رہ کر ممکن نہ تھی۔ اگرچہ ان کی عمر اسّی سال بیان کی جاتی ہے، لیکن وہ اب بھی اپنے ادبی مشاغل میں بدستور منہمک ہیں، ان کی تمام زندگی بیرونی ممالک میں گزری، مگر اپنے اُس وطن کے مہر محبت کی ضوفشانیوں سے ان کی دُنیائے ضمیر کا چپّہ چپّہ منور و تابناک ہے، جسے یہ ہمیشہ کیلیے خیرباد کہہ چکے، اُنھوں نے اپنی صاحبزادیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی، جن میں سے ایک بڑی ماہر فن موسیقی ہیں اور دوسری نے تعلیم المعلمات کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی ہے، وہ خود تو وطن واپس جانا نہیں چاہتے لیکن اپنی دونوں تعلیم یافتہ صاحبزادیوں کو مادر وطن کی خدمت گزاری کے لیے بھیجدیا ہے، ان کی ہمشیر خانم دولت آبادی کا کارنامۂ ملازمت اور بھی قابل ستائش ہے یہ آجکل طہران میں انسپکٹرس مدارس نسواں ہیں، ایران کی ترقی مستورات کے سلسلے میں مجھے پھر ان کا ذکر کرنا پڑا، یہ باکمال خاتون مردم خیز خطۂ دولت آباد کے مشہور خاندانِ علم وفضل کی یادگار، اُن ممتاز وسربرآوردہ خواتین میں سے ہیں جن کی

لگاتار دوڑ دھوپ نے مُلک کی معاشرتی و تمدنی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

میر جہانگیر خاں اخبار" صور اسرافیل" کے مدیر اس زمانے کے ایک اور قابل ذکر محبِ وطن ہیں جنھوں نے لوگوں میں کافی جوش پیدا کر دیا، بعض اوقات چھوٹی بحروں میں اُن کے پُر مغز اشعار ناظرین کو مسحور کر دیتے تھے، ان کے چھوٹے چھوٹے ترانے راستوں پر اکثر لڑکوں اور لڑکیوں کے گاتے پھرنے سے سماں بندھ جاتا، اور خوش گلوئی کے اثر سے لبریز ترانے سُن کر کوئی ایسا نہ تھا جو متاثر نہ ہوتا ہو جن کا مفہوم درج ذیل ہے:۔

" خدایا سترھویں صدی گئی، اٹھارھویں گزری، اُنیسویں بھی ختم ہوئی اور بیسویں صدی جاری ہے، مگر ابھی تک کسی کو ہم پر ترس نہیں آتا "

ان کے ترقی پذیر اخبار نے ایران کے جسد بیجان میں جان ڈال دی، لیکن مخالف ملاؤں کا اقتدار اعلیٰ انکی انقلابی سرگرمیاں برداشت نہ کر سکا، اور اسلام کے لیے اِسے اندیشہ ناک قرار دے کے پہلے ان کے ہاتھ کاٹے اور پھر پھانسی دیدی گئی، وہ ایک متمول شخص تھے، لیکن اپنی ساری جائداد مُلک پر نچھاور کر چکنے کے بعد انتقال کے وقت ان کے پاس پانچ تومان کی جائداد بھی باقی نہ تھی، گو اب وہ زندہ نہیں، لیکن ان کی روح ملک میں بدستور کارفرما ہے، ان کے جذبۂ حریت و وطن پرستی اور سلسلۂ مضمون نگاری کا نقش دوام جریدۂ مُلک پر ثبت ہو چکا۔

اس زمانہ کے ایک اور وطن دوست یعنی تقی زادہ کی سیاسی زندگی ایک

امتیازی کارنامہ اور دلچسپ داستان ہے، ان کا مشہور عالم اخبار "کاوا" جو برلن سے شایع ہوتا تھا اس نے اپنے قارئین کی طبیعتوں پر غیر معمولی انقلاب پیدا کر دیا، اب ان کا سن ساٹھ سے متجاوز ہے اور وہ سیاسی معاملات سے کنارہ کش ہو کر آجکل لندن میں ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ایران میں تقی زادہ یا میر جہانگیر جیسے سیکڑوں پُرجوش کام کرنے والے پیدا ہو گئے جن میں سے ہر ایک نے بجائے خود اپنے ملک کی خدمت انجام دی، یہاں میں نے صرف چند کا حوالہ اسلیے دیدیا کہ ناظرین سمجھ سکیں کہ ایران کی موجودہ ترقی دفعتاً وجود میں نہیں آئی، اور یہ محض کرشمہ قسمت نہ تھا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے بلکہ کافی سوچے سمجھے ہوئے نظام العمل کی ایسی تکمیل تھی جس کے وجود میں لانے کے لیے مختلف اوقات میں مختلف ذرائع استعمال کرنا پڑے، سنہ ۱۹۰۸ع سے ابتک ملک میں برابر مغربی رجحان کی تحریک جاری ہے، سنہ ۱۹۲۵ع تک وقتاً فوقتاً رکاوٹیں پیش آنے کی وجہ سے اس تحریک کی رفتار ترقی کسی قدر سست رہی لیکن سنہ ۱۹۲۶ع سے رضا شاہ پہلوی کے تخت نشین ہوتے ہی ملک میں ترقی کی رفتار بسرعت بڑھنے لگی، گو بیرونی دُنیا کو اسکی پوری خبر تک نہیں۔

ہندوستان واپس آنے کے بعد اک دوست نے مجھسے کہا کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایران کی غیر معمولی ترقی سے بیرونی دُنیا کیسے بیخبر رہی، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس سُرعت سے یہ تغیرات ہوے اُسکا علم دنیا کو نہ ہوا ہو، دُنیا میں ایران

کی طرح کسی مُلک کو ترقی کرتے ہوئے نہ سُنا اور نہ دیکھا۔ دُنیا بھر میں فطرت انسانی کی یکسانی مسلّمہ حیثیت رکھتی ہے، ایرانی بھی انسان ہی ہیں، جن و ملک نہیں، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ان سے ایسے کام کس طرح انجام پائے جو دُنیا میں کسی سے نہ ہو سکے ایران جدید کا ہمیں تھوڑا بہت جو علم بھی ہے وہ ایک رازِ سربستہ اور ایران کا دفعتاً مغرب کے مماثل ہو جانا ایک معجزہ سا معلوم ہوتا ہے، اگرچہ میں معجزات کا زیادہ معتقد نہیں۔

اپنے کرم فرما کی اس گفتگو پر مجھے کچھ بھی تعجب نہ ہوا، ذاتی معلومات کے موجب اُن کا یہ کہنا صحیح تھا، ہندوستان واپس آکر ہر جگہ میں نے اسی قسم کی باتیں سُنیں، وہ اجنبی جو ایران کی تاریخ سے واقف نہ ہو اُس سے اسی قسم کی باتیں بنانے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

طہران میں ایک تعلیم یافتہ لکھنوی مسلمان سے یہ سُن کر میں دم بخود ہو گیا کہ وہ ہندوستان سے یہ خبر زادِ راہ کی طرح ساتھ لائے تھے کہ ایران میں مُلّاؤں کو توپ سے اُڑا دیا گیا، اور مسلمان پردہ نشین مستورات کو زبردستی مکانوں سے نکال کر بازاروں میں تشہیر کیا گیا، ایران میں مجھ سے ایک امریکن اخبار نویس نے کہا کہ تمام مُلک کی سیاحت کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ ایران میں جدید انقلاب کی تحریک، بلندی سے پستی کی جانب ہوئی نہ کہ پستی سے بلندی کی طرف جیسا اور ممالک میں ہو چکا ہے میں اپنی حدِ علم تک کہہ سکتا ہوں کہ وہ صرف ایک ہفتہ طہران، چند روز شیراز اور کچھ دن

اصفہان میں ٹھہرے، اس حساب سے اُن کا قیام ایران چند ہفتوں سے زیادہ نہیں رہا، لیکن اس جسارت کا کیا ٹھکانا ہے کہ اسی ڈھائی دن کے قیام کو وہ سارے ملک کی سیاحت سے تعبیر کرنے لگے، میں نہ سمجھ سکا کہ وہ کون سے ذرائع معلومات تھے جن سے وہ اس نتیجے پر پہونچے، اسکے علاوہ وہ فارسی کے ایک لفظ سے بھی واقف نہ تھے کوئی شخص کسی غیر ملک میں اُس وقت تک کوئی معلومات حاصل نہیں کر سکتا جبتک وہاں کی زبان اور تاریخ سے بخوبی واقف نہ ہو، ایرانیوں کی تاریخ بجائے خود ایک سلسلۂ تحیر و استعجاب ہے۔

عربوں کے تسلّط کے وقت سے تقریباً تین سو برس بعد تک ایرانی زبان میں نہ کسی نے ایک لفظ لکھا اور نہ بولا، حالت یہ تھی کہ کسی ایرانی کی زبان سے فارسی لفظ نکلتے ہی زبان کاٹ لی جاتی تھی، لیکن جونہی عربوں کی مرکزی حکومت متزلزل ہوئی، ایرانیوں نے اپنی مادری زبان کو از سر نو پھر زندہ کرلیا، ایران کی تاریخ ادبیات میں اس زمانہ کی کتابیں ہر لحاظ سے بہترین سمجھی جاتی ہیں، اگر یہ استعجاب آور نہیں تو پھر حیرت آفریں کسے کہا جاسکتا ہے۔

نادر شاہ کون تھا؟ ایک گڈریہ اس نے فنون جنگ کی تعلیم کہاں حاصل کی تھی؟ اپنے قبیلے کے ایک بے دریچہ گھر میں، تاریخ بتاتی ہے کہ اسی ان پڑھ گڈریہ نے ایک طرف تو افغانوں کو شکست فاش دی اور دوسری طرف ترکوں کو، پھر شمال میں روسیوں کی پیشقدمی کو بھی روک دیا، اپنے سلسلۂ فتوحات کو ہندوستان

تک بڑھا کے یہاں سے وہ تخت طاؤس ساتھ لے گیا جو آج ایران کے مایۂ فخر نوادرات سلطنت میں اپنا نظیر نہیں رکھتا، کیا یہ حیرت انگیز امر نہیں؟ دُنیا کی تاریخ بھلا ایسی کتنی مثالیں پیش کر سکتی ہے

۱۹۰۶ء کے دستور جدید کا کیا ٹھکانا اور کیا پوچھنا ہے، یہ بات کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی کہ ایران سا پست خیال و جمود پسند مُلک صدیوں کی حکومت شخصی کے خیالات کا شیرازہ توڑ تاڑ کے کبھی حکومت دستوری قائم کر سکے گا خود حکومت پہلوی کا ظہور پذیر ہونا ہی کیسا حیرتناک واقعہ ہے، رضا شاہ کون تھے؟ ایک معمولی سپاہی! انھوں نے کہاں تعلیم پائی؟ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کہیں نہیں، ایک معمولی ناخواندہ سپاہی جس کو وراثتہً تخت شاہی سے کوئی تعلق ہی نہ تھا، محض خدا داد ذہانت و قابلیت، جفاکشی و مآل اندیشی کی بدولت دولت ایران کے دیہیم و سریر کی زیب و زینت بن گیا، آج اس سپاہی کے حیرت آفریں اوصاف جمیلہ نے دُنیا کو نظر انتخاب سے دیکھنے پر مجبور کر دیا، کہ بیدار مغزی و نبرد آزمائی اور عسکری رہنمائی میں وہ اس کا کسی کو ہم پلہ نہیں سمجھتی، اب رہ گیا یہ سوال کہ ایران کی دوازدہ سالہ جدوجہد دنیا کی نظروں سے کیسے پوشیدہ رہی؟ اس کا جواب کچھ دشوار نہیں۔ چالیس برس ادھر تک ایران نہایت تباہ حال و پامال ملک تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کی منزلت دیرینہ افسانہ بن چکی تھی جنگ عظیم کے زمانہ میں گو اس نے جنگ میں خود کوئی حصّہ نہیں لیا۔ مگر وہ متحارب

اقوام کا جولانگاہ بنا رہا۔ روسی۔ ترکی اور برطانوی یہ سب کے سب بے روک ٹوک ایران میں گھس آئے۔ کیونکہ ملک میں مدافعت کی سکت ہی نہ تھی۔ اسوقت کوئی یہ خیال بھی نہ کرسکتا تھا کہ ایسا روندا ہوا ملک چند سال کے عرصہ میں اپنی کھوئی ہوئی سطوت کو حاصل کرکے عرصۂ دنیا میں پھر شہرت کا جھنڈا گاڑ دے گا بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ باہر والے ان تغیّرات سے واقف ہی نہ تھے جو بارہ سال سے ملک میں جڑ پکڑ رہے تھے۔

اِسکے علاوہ ایرانیوں کو نمائش اور ظاہرداری نہیں آتی۔ وہ باتیں کم اور کام بہت کرتے ہیں۔ انھیں "عادت ہے برسنے کی گرجنے کی نہیں" تو یہ سنجیدگی و آہستگی کے ساتھ اپنے نصب العین کے لحاظ سے چپ چاپ کام میں لگے رہے۔ غیر ملک کے سفارت خانوں کے ممبر تک رضا خاں کو جانتے بھی نہ تھے کہ یہ ہیں کس کھیت کی مُولی۔ لیکن ۱۹۲۱ء کی ایک صبح کو اچانک وہ تمام دفاتر سرکاری پر قبضہ کرکے فوجی آمر بنگئے۔

انیسواں باب

ملاؤں کے اقتدار کا خاتمہ

سنہ ۱۹۲۵ء کے اختتام تک اگرچہ ملک ایران ایک مرکز پر آگیا تھا لیکن پھر بھی کچھ خامیاں رہ گئی تھیں۔ ملک کی مرکزی ترقی کیلئے چند معاشرتی اور سیاسی قسم کی اصلاحات کا جاری ہونا نہایت ضروری تھا جو اس سے بہت قبل ہو جانا چاہیئے تھا۔

عدالتوں کی مسندیں ملاؤں کے زیر زانو تھیں۔ اور بیرونی لوگوں کو ان پر مطلق اعتماد نہ تھا۔ ناصر الدین شاہ کے دور حکومت میں دُول یورپ نے ملک میں مزید مراعات حاصل کر کے اپنے اپنے سفارت خانوں میں عدالتیں قائم کر لی تھیں۔ اگر کسی ایرانی، روسی، فرانسیسی یا برطانوی شخص کے درمیان کوئی تصفیہ پیش آتا تو بجائے ایرانی عدالت کے بیرونی عدالت متعلقہ سے اس کا تصفیہ کیا جاتا تھا۔

ایرانی ان عدالتوں کو خوف کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اِن کے یہاں کوئی

ایسا مجموعۂ قوانین نہ تھا جو بیرونی افراد کیلئے قابل قبول ہوتا۔ ۱۹۱۱ء میں فرانسیسی ضابطہ کے طرز پر ایک ضابطۂ دیوانی وضع کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر ملاؤں نے شرع اسلام کی توہین و تذلیل کی آڑ پکڑ کے اس تجویز کو ابھرنے نہ دیا۔ ۱۹۲۲ء میں ایک جدید تجارتی ضابطۂ قانون جاری کرنے کی سعی کی گئی مگر ملاؤں نے پھر مخالفت کی اور انہی کے اشارے سے ایسی شورش ہوئی کہ وہ تحریک ہی ملتوی ہو کر رہ گئی۔

لیکن جب اعلیحضرت رضا شاہ تخت نشین ہوئے تو حالات بالکل بدل گئے۔ ان کی بات قانون کا سا اثر رکھتی تھی۔ جب لوگوں کو معلوم ہو جاتا تھا کہ رضا شاہ اس معاملہ میں خاص دلچسپی لے رہے ہیں تو پھر کسی کو مجال مخالفت نہ رہتی تھی بلکہ فوراً اسکی تعمیل ہوتی تھی۔ ایران کو ایک ایسے ہی قوی بازو ناخدا کی ضرورت تھی جو اس کی قسمت کا جہاز بحر عالم میں بخوبی چلا سکے۔

۱۹۲۶ء میں ایک جدید ضابطہ تجارت اور ایک ضابطۂ تعزیرات یہ دونوں نافذ کئے گئے۔ اس سے سزاؤں کے قدیم طریقے بالکل منسوخ ہو گئے۔ یعنی خونبہا کا طریقہ یکلخت مسدود ہو گیا۔ یہ روش ملاؤں کے ساتھ گویا کھلّم کھلا جنگ کے مرادف تھی۔

یہ لوگ بجائے خود خیال کر رہے تھے کہ قرآن و احادیث نبوی کی رو سے حرمت قانون اسلام کی تضییع کے ساتھ ہمارے دست اختیار و اقتدار سے بہت کچھ چھن چکا اور جو کچھ رہ گیا ہے وہ بھی باقی نہیں رہ سکتا لیکن شاہراہ ترقی پر ملک کی تیز گامی سے شکایت کا بھی کوئی موقع نہ تھا۔ اور جلد یا بدیر اس کی وقوع پذیری لازمی تھی۔ اگر سلسلۂ اصلاحات ملاؤں کیلئے

ضرر رساں تھا تو اس کا کوئی علاج ہی نہ تھا۔

اُسی سال مُلّاؤں کو مستثنیٰ کرکے جبریہ فوجی بھرتی کے احکام نافذ ہوئے لیکن فوجی بھرتی سے استثنا کیلیے ایک امتحان میں کامیابی کی شرط تھی جو سرکاری ادارہ امتحان کے سامنے ہوتا تھا، یہ پہلا وار تھا، جس سے مُلّاؤں کی آئندہ پیداوار پر سرکاری طور سے کاری ضرب لگی، اب وہ نئے کارخانہ میں آگئے اور اُن کا طرزِ زندگی ایک دوسرے سانچے میں ڈھالا جانے لگا، یہ دیکھ کر مُلّا خاموش نہ رہ سکے اور انھوں نے تمام دُکانداروں کو ہڑتال کرنے کے لیے ورغلایا، اور بمقام "قم" اسکے متعلق جلسے منعقد کئے، اُن کی یہ خفگی ایک مناسب طریقے پر دور کردی گئی، اور سرکاری تجاویز حسبِ دستور بحال رہیں۔

۱۹۲۷ء میں مولویوں کی خانگی عدالتیں برخاست کرکے تمام عدالتیں نئے طریقہ پر قائم کی گئیں، قانون شریعت کے مطابق ایک ضابطۂ دیوانی وضع کیا گیا اور فرانسیسی آئین کے موافق مجموعہ تعزیرات اور ضابطہ فوجداری اور جدید قواعد متعلقہ عدالت مرتب کرکے ایک جدید محکمۂ عدالت قائم کیا گیا، اور بیش قرار مواجب پر خدمات قبول کرنے کیلئے مُلّاؤں کو بلایا، جن میں سے اکثر بطیبِ خاطر صدائے دعوت پر لبیک کہکے مامور بکار ہوگئے، قواعد خدمات سرکاری نے عام جلسوں میں شرکت اور معاشرتی و سیاسی معاملات ملکی میں حصہ لینے کی سخت ممانعت کردی، یہاں تک کہ مذہبی معاملات میں بھی بحیثیت ایک مولوی کے انھیں

اظہار رائے کی اجازت نہ تھی، اِس طریقہ سے جو قابل اور با اثر مولوی تھے وہ سب سرکاری سلک ملازمت میں منسلک ہو گئے اور جو نااہل تھے وہ اپنے حال پر چھوڑ دیے گئے۔

۱۹۲۸ء میں دول غیر کی عدالتیں ڈاکخانے اور تار گھر وغیرہ اسلیے برخاست کر دیے گئے کہ جدید عدالتیں جو فرانسیسی اصول پر قائم کی گئی تھیں اُن سے بیرونی لوگوں کے حقوق کی پوری محافظت ہوتی تھی، ایرانیوں کے لیے یہ طرز عمل اطمینان بخش تھا، محکمۂ عدالت کی اصلاح کرنے میں پارلیمنٹ کے حق بجانب ہونے کو اب مُلا بھی مان گئے،

اسی سال از روے قانون مولویوں کو چھوڑ کر کُل ایرانیوں کے لیے یورپین لباس کا استعمال ضروری و لازمی قرار دیا گیا، لیکن اس امر کی شناخت کیلیے کہ وہ ملاؤں کے طبقے سے ہیں، ایک سرکاری ادارہ سے مقررہ امتحان پاس کر کے سرٹیفکیٹ یا لائسنس حاصل کرنا اُن کے واسطے لازمی ہو گیا، تاکہ وہ جبّہ و دستار پہننے کے مجاز ہو سکیں، جبّہ و دستار اسلامی مجتہد کے لیے زمانۂ قدیم سے ایک خاص علامت چلی آتی تھی، یہ طرز ملاؤں کے اقتدار پر بھرپور وار سے کم نہ تھا، لیکن اس سے مفر ممکن نہ تھی، اسلیے کہ زمانہ بدل چکا تھا، اور مُلک ترقی کی دُھن میں تھا مُلاؤں کے لیے بجز اسکے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ:۔

"چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی"

چنانچہ ایک رُکن پارلیمنٹ نے صاف صاف کہدیا کہ ہم مُلاؤں کو میدان میں لانا چاہتے ہیں تاکہ اُن میں سے جو گرگ، لباسِ زہد واتقا میں چھپے ہوئے ہیں وہ باقی نہ رہیں اور ہم اپنی قوم میں اتحاد پھیلا کے مختلف قسم کے رائج شدہ لباسوں کو یک قلم موقوف کر دیں، ابتک تو لباس سے وطن کی شناخت ہوتی تھی کہ فلاں شخص تبریزی ہے، یا مشہدی نہ یہ کہ وہ ایرانی ہے، ۱۹۲۹ء میں بغیر کسی رکاوٹ کے قانون کا نفاذ ہوگیا اور ملاؤں کے سوا کہیں گانوں، قصبوں یا شہروں میں کوئی متنفس نظر نہ آسکتا تھا جو یورپین لباس پہنے نہ ہو، چنانچہ کوٹ ویسکوٹ اور پتلون نے جُبّہ وعمامہ کی جگہ لے لی، اور پہلوی ٹوپی نے کلاہ، دستار اور دوسری قسم کے سرپوشوں کا خاتمہ کر دیا، اب تقریباً پانچ فی صدی مُلّا تو سرکاری ملازمتوں میں جذب ہوگئے اور پچپن فی صدی کو حکومت نے نااہل ٹھہرا کر مولویانہ لباس کا استعمال اُن کے لیے ممنوع قرار دے دیا، اسی سال محکمۂ رجسٹری قائم ہوا اور دستاویزات وغیرہ کی توثیق جو ابتداءً بالکل مُلّاؤں کے ہاتھ میں تھی وزارت عدالت میں منتقل ہوگئی، اس نئے محکمہ میں تقرر طلب خدمات جدیدہ پر ملاؤں کو مامور کیا گیا اور اس طرح اُن کی تعداد میں اور کمی ہوگئی۔

۱۹۲۹ء میں تقریباً پینتیس فیصدی مُلّا بیکار ہو کر صرف نکاح وطلاق، توثیق حلف اور وصیت ناموں کی رجسٹری وغیرہ جیسے کاموں کے رہ گئے تھے اس کے بعد ان معاملات میں بھی حکم شاہی نے ان کے فرائض میں کمی کر دی۔

اور ۱۹۳۱ء تک کوئی جدید اصلاح عمل میں نہیں آئی، ملک کو انقلاب آور اصلاحاتِ جدیدہ پر عمل پیرا ہونے کا عادی بنانے اور اصلاحوں کے نفاذ میں پختگی اور استواری پیدا کرنے کے خیال سے شاہ نے دو برس کا وقفہ دیا، بخلاف مصطفےٰ کمال کے رضا شاہ پہلوی نے دور اندیش و مآل بیں مدبر کی طرح نفاذ اصلاحات میں نہایت مآل اندیشی اور مستقل مزاجی سے کام لیا، جو دشواریاں افغانستان میں امان اللہ خاں کی اصلاحات نے پیدا کر دی تھیں، وہ اُن سے ناواقف نہ تھے، گو ایران میں اس طرح کی بغاوت کا اندیشہ نہ تھا تاہم اُنھوں نے لوگوں کے میلان و رجحان کے معائنے اور مناسب موقع کے انتظار کو مناسب خیال کیا۔

۱۹۳۱ء میں اعلیٰحضرت نے اصلاحات کی طرف توجہ کی اور ملاؤں کے اختیارات جو نکاح اور طلاق تک محدود رہ گئے تھے اُن پر بھی ہاتھ ڈال دیا جو معاہدات شادی اور طلاق کے متعلق ہوا کرتے تھے محکمہ رجسٹری میں اب ان سب کی توثیق لازمی قرار دے کر مُلّاؤں کے کل اختیارات سلب کر لیے، مولویوں کے رہے سہے نہال کی اب جڑ ایسی کٹی کہ پھر سرسبزی اور بار آوری کی کوئی اُمید باقی نہ رہی، ان کے دست اختیار سے مذہبی ہتھیار چھین گئے، اور اب حقیقی طور پر اسلام کی پیروی کے لیے میدان صاف ہوتے ہی اہم اصلاحات کی وسیع راہ کھُل گئی، مُلّاؤں کے خود ساختہ قوانین نے اناث کا سنِ بلوغ نو سال اور ذکور کا پندرہ سال قرار دیا تھا، بچپن کی شادیوں کے رواج سے ملک میں کمزوری اور لاغری ترقی پذیر تھی، اولادیں

ایسی نحیف اور کمزور ہوتی تھیں جن کی عمر دو تین سال سے زیادہ نہ ہوتی تھی، اکثر ایسے واقعات پیش آئے کہ پندرہ برس کی شادی شدہ زندگی میں دس بچے پیدا ہوئے اور سب ضایع ہو گئے، تمام ملک اس وحشیانہ رواج کو ناپسندیدہ سمجھ رہا تھا، بچپن کی شادیاں بالکل موقوف کر دی گئیں، اور شادی کی کم سے کم عمر اناث کیلیے پندرہ اور ذکور کے لیے اٹھارہ سال قرار پائی، علاوہ ازیں اس وقت تک کوئی لڑکا یا لڑکی شادی نہ کر سکتے تھے جب تک اُن کے قویٰ اس قابل نہ ہوں، یہ مُلّاؤں کے اُس قانون کی صریحاً تنسیخ تھی جو ایران میں صدیوں سے جاری تھا، چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ تو ان اصلاحوں کی طرف عوام الناس کے میلان و رجحان نے اور باقی آئینی گرفتوں نے ملاؤں کے رہے سہے اختیارات کو نیست و نابود کر دیا، ہندوستان کے مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ ایران میں تمام مُلّا یا قتل ہوے یا خارج البلد کر دیے گئے، حالانکہ اُن کے ساتھ کسی قسم کی سختی یا تعدی نہیں کی گئی، وہ سب زندہ ہیں، جو کچھ ہوا وہ اس سے زیادہ نہیں کہ اُن کا طرز معاشرت بدل کر پیشۂ مُلّاگری بند کر دیا گیا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھیں مُلّاگری کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کے جدید شعبہائے زندگی اختیار کرنا پڑے، چونکہ مُلک کے ہر محکمہ میں ملازمین کی ضرورت تھی، اسلیے ایسے نااہل مُلّا جو مُلّا بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے حصول معاش کے واسطے اُنھیں دوسرے پیشے اختیار کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی، یہ طریقہ عوام اور اعلیٰ طبقہ کے ملاؤں کے لیے خوش آئند تھا، عوام کو تو ان خون چوسنے والی جونکوں سے نجات ملی

اور علمار اس بات سے خوش ہوے کہ اُن کے زُمرے سے جو فروش و گندم نما افراد نکال دیے گئے، پچاس فی صدی قابل ملاؤں میں سے تقریباً بیس فیصدی عدالتوں اور رجسٹری میں معقول تنخواہوں پر ملازم ہو گئے، عدالت العالیہ اور عدالت مرافعہ کے جج بیشتر یہی مولوی معین ہوئے، جنھیں ماہانہ تنخواہیں دو سو سے ایکہزار تومان تک دی جاتی ہیں، مُلک میں ایسے مُلّاؤں کی مجموعی تعداد اب چالیس فیصدی رہ گئی، اور اس تعداد کو گھٹانے اور ان کے اقتدار کو معدوم کرنے کا ایک یہ اور طریقہ نکالا۔

پہلے نجفِ اشرف کی تعلیم گاہوں کی سندیں مستند سمجھی جاتی تھیں، لیکن ایرانی ممتحنین کے سرکاری بورڈ کے امتحان میں شریک ہو کر کامیابی کی سند حاصل کرنا قانوناً مُلّاؤں کے لیے لازم کر دیا گیا، اور یہ سند ہر دوسرے برس قابل تجدید قرار دی گئی لائسنس کی مدت گزرنے کے بعد ان میں سے اکثر کو نااہلی، بد دیانتی یا امور مملکت کی بیجا دخل دہی پر تجدید اسناد سے انکار کر دیا جاتا تھا، اس طرح پر ان کی تعداد بتدریج کم ہوتی گئی، یہانتک کہ ۱۹۳۶ء میں اصفہان میں نو ہزار سے گھٹ کر نو رہ گئی اور پائے تخت طہران میں ایک درجن سے زیادہ مُلّا نظر نہ آتے تھے، اس میں شک نہیں کہ چند علما، جو مُلک میں باقی رہ گئے ہیں وہ منتخب روزگار اور بڑے روشن خیال مانے جاتے ہیں۔ مجکو ان مقدس حضرات میں سے چند سے سعادت ملاقات کا موقع ملا، اور ان کی علمی صحبت میرے لیے نہایت پُر لطف و پُر کیف تھی، ایک آغا شریعت سنگلاچی اُن چند ممتاز علمار میں سے ہیں جنھیں عام جلسوں میں وعظ

کی اجازت ہے، وہ ایک عالم متبحر ہیں، اور تاریخ و فلسفۂ اسلام میں انکی دستگاہ قابلِ استفادہ ہے، یہ اپنے مکان کے متصل ہی ایک مسجد میں ہر پنجشنبہ کو شب میں ٹھیک (۷) بجے وعظ شروع کرکے (۸) بجے ختم کردیتے ہیں، میں نے اپنے دورانِ قیام طہران میں ان کا کوئی وعظ ناغہ نہیں کیا اور ہر دفعہ کچھ نہ کچھ نئی معلومات حاصل کرکے آیا، وہ پکے مسلمان اور حقیقی درویش ہیں، وہ پُرشکوہ لفاظی کو ناپسند کرکے حقیقت اسلام پر موعظت کے دلدادہ ہیں، ان کا وعظ مدلل ہوتا ہے، اور بخلاف عام مُلّاؤں کے وہ قرآن شریف کی کوئی آیت یا حدیث رسول اکرم بغیر اُن مطالب و معانی کو واضح کئے ہوئے نہیں پیش کرتے جو اُس سے مستنبط ہوتے ہیں۔

ان کی تقریروں کا خلاصہ اخبار "قانون شرایع" میں شایع ہوکر عام مقبولیت حاصل کرچکا ہے، وہ ایسی بارعب شکل و شمائل اور بلند و بالا قد و قامت کے بزرگ ہیں جن کی جانب عقیدت و احترام کی نگاہیں اُٹھتی ہیں، طہران کے کالج دینیات میں کئی مرتبہ تین سو تومان ماہوار کی پروفیسری پیش کی گئی، لیکن اُنھوں نے یہ کہہ کر قطعاً انکار کردیا کہ میں ابھی خود طالب علم ہوں، اور اپنے اوقات درس میں سے اِس خدمت کیلیے وقت نہیں نکال سکتا، وہ ایک قدیم خاندانِ اجتہاد کے رُکن ہیں اور ان کے بھائی جو علم و فضل میں انہی کے مثل ہیں کالج دینیات میں خدمت پروفیسری پر مامور ہیں۔

اِسی سلسلہ میں ایک دوسرے قابل ذکر روشن خیال عالم شیخ ابوطالب تبریزی

فوجی واعظ ہیں، وہ اپنے گھر میں ہر شب شنبہ مجلس روضہ خوانی منعقد کرتے ہیں، مجالس عزا کے انعقاد کی ممانعت نہیں ہے، میں ایسی مجالس میں متواتر شریک ہوا، جہاں حاضرین کی تعداد عموماً چالیس پچاس ہو جاتی تھی، مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ یہ مجالس تعلیمی حیثیت رکھتی تھیں، حاضرین میں ایک چوتھائی تعداد اُن علمار کی ہوتی تھی جنھوں نے اپنا طرز زندگی بدل ڈالا، اور باقی معمولی لکھے پڑھے ہوتے تھے، لیکن سب کے سب کافی معلومات مذہبی رکھتے تھے، چائے اور میوہ جات کی تقسیم بافراط ہوتی تھی، اور جلسہ میں چند حقّے بھی گردش کرتے رہتے تھے، آپس کی گفتگو میں مذہب اسلام کا کوئی پیچیدہ مسئلہ معرض بحث میں آ جاتا تھا، مثلاً قرآن کی کوئی مشکل آیت یا کوئی ایسی حدیث جو معیار معقولی پر صحیح نہیں اُترتی، شیخ ابوطالب اور انہی کے ہم پایہ دیگر علمار اپنے اپنے مطالب باخوذہ بیان کرتے تھے، اظہار خیالات نہایت دلچسپ طریقہ پر ہوتا تھا اور اُس مرغوں کی پالی کا واہمہ بھی نہ ہوتا تھا جو اس سے پہلے زمانہ میں مسلمان مولویوں کے نہج بحث کا طرۂ امتیاز تھا۔ مباحث کے اختتام پر تمام مجلس ساکت و سنجیدہ طور پر بیٹھ جاتی تھی اور شیخ ابوطالب یا ان کے کوئی دوسرے ساتھی بیان کرنے کیلئے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے، موضوع بیان عموماً مصائب ائمہ طاہرین علیہم السلام ہوتا تھا، جسے سنکر اہل مجلس رونے لگتے تھے۔

ایسی مجالس اب بھی ہر جگہ منعقد ہوتی ہیں، ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کے مصائب پر اظہار غم والم کا یہ بہت معقول اور بہتر طریقہ ہے، بہ نسبت اسکے کہ شاہراہ عام پر

جلوس نکالے جائیں، اور سینہ کوبی کی جائے، ان مجالس کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ خلفائے ثلاثہ کے خلاف شان کوئی کلمہ نہ کہا جاتا تھا، جیسا کہ پہلے یہ عام دستور تھا شاہ پہلوی ایسی مجالس کے خلاف نہیں ہیں، ایک پُر خلوص مسلمان کی حیثیت سے آپکی یہ دلی خواہش ہے کہ حقیقی معنوں میں اسلام کی اشاعت ہو۔

فوج میں وعظ و پند کے لیے واعظوں کے تقررات ان کا ذاتی اختراع ہے شاہ نے طہران میں دینیات کا ایک کالج قائم کیا ہے جہاں قاہرہ کے جامعۂ ازہر کے طرز پر تعلیم دی جاتی ہے، بنظر ترغیب اس کالج کے طلبا کو اعانت قیام خورد و نوش کے علاوہ وظائف بھی دیے جاتے ہیں۔

شاہ نے سفر زیارت و حج کو بالفعل روک دیا ہے، اسی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ صریحاً مذہب کی طرف سے بے پروائی یا اسکی مخالفت ہے، حالانکہ یہ حکم امتناعی حقیقتاً اقتصادی بہبود پر مبنی ہے، بعض لوگوں کے نزدیک یہ منافی احکام شرع ہے مانا کہ وہ لوگ اپنے نقطۂ نظر کو صحیح سمجھتے ہوں، لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں، اسلیے کہ اسکی وجہ صرف یہی ہے کہ ایران کا روپیہ بیرونی ممالک میں نہ جانے پائے۔ یہ ایک عارضی رُکاوٹ مُلک کی اقتصادی حالت کے مدّ نظر لازمی چیز تھی، مُلک میں صنعت و حرفت کی روز افزوں ترقی ہے۔ ہر سال لاکھوں روپے کی قیمتی کلیں باہر سے لائی جا رہی ہیں، نقل و حمل کی سہولتوں سے بیرونی ممالک سے بسوں اور موٹروں کا تانتا بندھ گیا ہے۔

ایران اپنے ذرائع آمدنی میں حیرت انگیز عت کے ساتھ اضافہ کرتا چلا جارہا ہے
ہر لحاظ سے ترقی کے باوجود بھی ایران ابھی اس درجہ پر نہ پہنچ سکا کہ اسکی برآمد درآمد کے برابر ہو۔
اگرچہ اہل حل و عقد انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ خرید و فروخت تبادلہ کے طریقہ کا اتباع
اور فضول سامان تعیش کی درآمد پر بھاری محصول عائد کرکے ملک کی تجارت کا توازن قائم
کر دیا جائے۔ پھر بھی ہر سال برآمد پر درآمد کا اضافہ بہت زیادہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ملک دول غیر
کا مقروض ہونا بھی نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس معاملہ میں گزشتہ تلخ تجربہ اسے بھولا نہیں۔
اقتصادی توازن کو قائم رکھنے کا صرف ایک یہی طریقہ ہے کہ ملک کی دولت کا
سکّہ کی شکل میں غیر ضروری طور پر دوسرے ممالک کے ہاتھ میں جانے کا سدّباب کیا جائے۔
شاہ سفر حج و زیارات کے مخالف نہیں ہیں۔ اگر حجاج و زائرین مقامات مقدسہ
کو لیجانے کا اس طرح انتظام کر سکیں کہ بجائے روپیہ کے ایران کا سامان لیجاکر ان ممالک میں
فروخت کریں تو ان کے جانے میں کوئی رکاوٹ یا اعتراض نہیں ہے اور اب حقیقتاً یہی عمل
جاری بھی ہے۔ جوشیلے مذہبی لوگ عراق کو اپنے ہمراہ قالین لے جاتے ہیں زیادہ سے زیادہ
جو قیمت مل سکے فروخت کرکے زیارت کربلائے معلّیٰ کے اخراجات پورے کرتے ہیں
یہی وجہ ہے کہ بہ نسبت ایران کے یہاں کے قالین عراق میں زیادہ ارزاں ہیں۔
ایران میں یہ طریقہ کوئی نئی چیز نہیں۔ سلاطین صفویہ نے بھی ایسے وقت میں
یہی طرز عمل جاری رکھا کہ زمانہ اور ماحول اسکے لئے بمشکل مساعد خیال کیے جا سکتے
تھے۔ مسٹر مرکھم اپنی تاریخ ایران کے صفحہ ۲۰۰ میں لکھتے ہیں :-

"شاہ عباس اعظم کے سب سے بڑھ کر دانشمندانہ کارناموں میں سے ایک یہ تھا کہ زائرین مکہ و کربلا کے توجہ کا رُخ مشہد کی طرف پھیر دیا جس کو اس نے خراسان کا دارالخلافہ بنا کر حقیقی قومی مرکز زیارت قرار دیا۔ زیارت روضۂ جناب امام رضا علیہ السلام کو فروغ دیکر شاہ تمام اس دولت کو اپنے ہی ملک کے اندر رکھنے میں کامیاب ہوا کہ جو جوش مذہب میں صرف کی جاتی تھی۔

وسط ایران میں قم ایک دوسرا مقدس شہر ہے۔ وہاں ایک روضہ ہے جس کے اندر جنابہ فاطمہ معصومہ خواہر جناب امام رضا علیہ السلام کا مزار مقدس ہے جس کی زیارت کے لئے بیشمار زائرین آتے ہیں۔ شاہ عباس صفوی کی اس حکمت عملی سے تمام وہ دولت جو جوشیلے زائرین کے ہمراہ شام و عرب چلی جاتی تھی وہ ایران ہی میں رک کر مشہد اور قم میں صرف ہونے لگی"۔

غرضکہ شاہ نے کوئی ایسی بات نہیں کی کہ جو خلاف اسلام ہو۔ بلکہ اسلام کی اس طرح بڑی خدمت کی کہ سیدھے سادے عقائد اسلام کو ملاؤں کی جدت طرازیوں اور تاویل آفرینیوں سے پاک کر دیا جنھوں نے اصلی عقیدۂ توحید کو پیچیدہ بنا کر اپنے حسب منشا کر لیا تھا۔

شاہ نے اپنے ملک کے متعصب مُلّاؤں کو روشن دماغ اور آزاد خیال بنا دیا کہ وہ اپنے اصول مذہب کے بہت پابند ہیں لیکن اب ان کا مذہب بہت صاف اور سادہ ہو گیا ہے۔ اسلام نام ہے اصول دین و فروع دین کے مجموعے کا۔ توحید

عدل، نبوت، امامت اور معاد۔ یہی اصول خمسہ اصول دین کہلاتے ہیں۔ اور فروع عبارت ہے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس، جہاد، ان ہی فروعات ستّہ سے۔

بیسواں باب

ایران جدید میں طبقۂ اناث کا درجہ

جب ملاؤں کی اصلاحی مہم سر ہو چکی تو شاہ نے ایران میں صنف نازک کی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ اب سے چالیس برس پہلے ایران میں حالتِ اناث ناگفتہ بہ تھی۔ یوم پیدائش ہی سے یہ صنف ایک قابل نفرت مخلوق اور بلائے آسمانی سمجھی جاتی تھی۔ اس کی پیدائش کو مشیتِ ایزدی سمجھکر مجبوراً راضی برضا رہتے تھے۔ اس کی پرورش نہایت بے اعتنائی کے ساتھ کی جاتی۔ کیونکہ اولاد ذکور کے برخلاف وہ اپنے والدین کے عالم ضعیفی میں ان کی کوئی خدمت نہ کر سکتی تھی۔ اسے تعلیم دینا تو گناہ کبیرہ کے مثل تھا۔ والدین اِس بارگراں سے سبکدوشی کیلئے آٹھ نو برس کی عمر ہی میں بیاہ دینے کا موقع ڈھونڈھتے رہتے تھے۔

یہ صنف اپنی مرضی کی مالک نہ تھی۔ یہاں تک کہ اٹھارہ یا بیس سال میں شادی کے وقت بھی اس کی رضامندی وغیرہ قابل اعتنا نہ تھی۔ اِس کا کام بجز اسکے اور کچھ

نہ تھا کہ شوہر کی خدمت کرے جس کے اختیارات اتنے زیادہ وسیع تھے کہ جب چاہے اس بیچاری کو زدوکوب کرے۔ اور جب چاہے اِس کو طلاق دیدے۔ زوجہ کو مارنا پیٹنا کوئی جرم نہ تھا۔ سزا دینے کی چھڑی جنت سے اتری ہوئی خیال کی جاتی تھی۔ اور بیوی بچوں اور غلاموں کو زدوکوب اسکا بہترین مصرف سمجھا جاتا تھا۔ شوہر کے نزدیک زوجہ ہرگز قابل اعتماد نہ تھی۔ عورت کے مقابلے میں ایک کتّا زیادہ وفادار سمجھا جاتا تھا۔ اس کو کچھ خبر نہ تھی کہ اسلام نے اِسے کیا حقوق عطا کئے ہیں۔ اور یہ بیچاری اپنی قسمت پر شاکر تھی۔

اِس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایران میں بعض قبائل بہترین زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ملک کی عام معاشرتی حالت بہت ابتر تھی۔

دستوری حکومت کے زمانہ میں حالات بدلنے لگے اور ملک میں یہ عام خواہش پیدا ہوئی کہ لڑکوں کے اسکولوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے بھی اسکول کھولے جائیں۔ سب سے پہلے امریکن مشن نے اِس ضرورت کو پورا کیا اور طہران میں ایک مدرسۂ نسواں کھولا جو پورے ملک میں اپنی نوعیت کا پہلا مدرسہ تھا۔ جب ایران کے ساتھ دیگر بیرونی ممالک کے سیاسی تعلقات قائم ہوئے تو مغرب سے بہت سے سیاست داں، تجار اور سیّاح وارد ایران ہوئے۔ انھوں نے تمام ملک میں مغربی تہذیب پھیلا دی۔ وہ وطن کے فدائی جو ملک کی حکومت خاندان قاجار سے چھین کر دستوری حکومت قائم کرنے کے ذمّہ دار تھے

یہی تمام ملک میں ہیجان پیدا کر رہے تھے۔ ملک میں بیچینی بڑھتی جا رہی تھی، اور یہ سب معاشرتی انقلاب کی تکمیل کا پیش خیمہ تھا، شعرا اور اُدبا نے طرز تحریر بدل کر گل وبلبل رخ و کاکل پر غزل سرائی اور تفریح طبع قصص و حکایات کے بجائے تعلیم نسواں کی اہمیت پر نظمیں اور ڈرامے لکھے۔

اشرف نے اپنی تصنیف "باغ بہشت" کی دو جلدوں میں جستہ جستہ ہجو ملیح کے طور پر ایران کی مستورات کی زبوں حالی کا پورا خاکہ کھینچ کے رکھ دیا۔ اس موضوع پر یہ کتاب بہت دلچسپ ہے۔ دیکھیے درج ذیل عبارت میں مسلمانوں کی کسطرح خبر لی ہے:۔

"بظاہر ہم مسلمان نظر آتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت کافر ہیں۔ ہمارے اسلام میں بجز کثرت ازدواج اور کیا دھرا ہے۔ ایک باپ اپنے بیٹے سے مدرسہ نہ جانے پر بازپرس کرتا ہے۔ اور بیٹا اس بات پر معترض ہے کہ ابا جان چوتھی دُلھن کے جوان دولھا بننے کیلئے ڈاڑھی میں خضاب لگا رہے ہیں۔"

اسی زمانہ کے انقلاب پسند شاعر عشقی جنھوں نے اپنے والد کو اپنی والدہ کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آنے پر خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے لکھتے ہیں:۔

اے عشقی! دیکھو تو لڑکیوں نے اپنے چہروں پر نقابیں کیوں ڈالی ہیں؟ اگرچہ اُن کے جسموں پر نقاب ہے۔ لیکن ان کی آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں۔ اس نقاب کی آڑ میں بے شمار عیوب پوشیدہ ہیں یہ نقاب ہی ہے جس نے ہماری مستورات کے اخلاق کو پست کر دیا ہے۔ اپنے آقا کے ساتھ ایک غلام تو باہر

چل پھر سکتا ہے۔ لیکن ایک بیوی اپنے شوہر کے ہمراہ جو حقیقتاً اس کی شریک زندگی ہے۔ باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔ اس نے کونسا جرم کیا ہے کہ وہ سوسائٹی میں اپنے شوہر کو بھی منہ دکھانے سے شرماتی ہے؟ اس کی چادر یا اس کی نقاب کیا معنی رکھتی ہے؟ کیا یہ اسکا کفن ہے؟ اور جو نہیں تو پھر اور کیا ہے؟ جو اپنی بیویوں کو زندہ درگور کرتے ہیں۔ ان کو خود بھی مرجانا چاہیئے۔ اگر میری طرح کچھ اور اشخاص ایسی ہی صدائے احتجاج بلند کریں تو اس معاملہ کا مجلس میں زیر بحث آجانا یقینی ہے۔ اگر عورتیں نقاب کو علامت حیا قرار دیکر اپنے چہروں کو یونہی چھپائے رہیں تو ہماری سوشل (معاشرتی) زندگی کی مسرت کا آدھا حصہ بالکل تاریک ہوجاتا ہے۔ کفنوں میں ملبوس عورتوں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ گویا ہماری نصف قوم مردہ ہے۔"

ایرج مرزا اسی زمانہ کے ایک اور مشہور شاعر کا انداز تحریر دیکھئے :-

" خدایا ہماری قوم کب تک سوتی رہے گی؟ ہم لوگ اپنی مستورات کو کب تک محبوس رکھینگے؟ بارخدایا تو کب انسان کو توفیق عطا فرمائے گا کہ وہ اپنی جہالت کو محسوس کرے؟ کیا عورت نسل انسان سے نہیں ہے؟ کیا وہ امتیاز نیکی و بدی سے قاصر ہے؟ عورت کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ تحفظ عفت و عصمت ہے نہ کہ چادر اور نقاب کا بناوٹی پردہ۔ تم غلطی پر ہو جو یہ سمجھتے ہو کہ چادر اس کے لئے مانع کجروی ہے۔ اگر وہ کجروی پر تل جائے تو

آہنی صندوق میں مقفل رکھنے پر بھی شوخ چشمی سے باز نہ آے گی۔ پس جب وہ نقاب پوشی کے باوجود بھی بدچلنی اختیار کرسکتی ہے تو پھر نقاب کیوں نہ ہٹادیا جائے کہ وہ سوسائٹی میں شامل ہوکر خصائل پسندیدہ اختیار کرے اچھی تعلیم ہی اسکو اسکی خواہشات بیجا سے بچانے کی ذمّہ دار ہوسکتی ہے، ہم سے کہا جاتا ہے کہ جنت میں حوریں ہونگی۔ وہ نقاب پوش تو نہ ہونگی پھر ہماری دنیاوی حوروں کی نقاب پوشی کس لئے۔ مرد کیلئے عورت کے بغیر دنیا سے معاشرت تیرہ و تار ہے جو نور محبت سے محروم ہوکر گویا ایک بے حقیقت شے ہوجاتی ہے۔ عورت صفت پروردگار عالم کی آئینہ دار ہے۔ لیکن تم نے اس کو لوازم مطبخ میں سے صرف پیاز یا شلجم سمجھ لیا ہے۔ نقاب میں وہ ایسی کریہ المنظر معلوم ہوتی ہے۔ جسکی شکل کو انسانی شکل سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ قرآن شریف میں عورتوں کو بدہیئت و بدنما بنانے کا حکم کہیں بھی نہیں ہے۔ کیا کوئی آیت قرآن مجید یا حدیث دکھائی جاسکتی ہے۔ جس کی رو سے سوسائٹی کا دروازہ عورتوں کے منھ پر بند کردینا لازمی ہو۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ استعمال نقاب تعلیم قرآن کے خلاف ہے۔ اور اسکا عفت و عصمت سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

قبائل کی عورتیں مدتوں سے بے نقاب ہیں لیکن ان کے معیار اخلاق کو ہماری شہری نقاب پوش مستورات کے اخلاق کے معیار پر بڑا تفوق حاصل ہے آخر یہ کیا ہے کہ ان میں عفت و عصمت کی ذرا بھی کمی نہیں ہے؟ کیا صرف

نظارۂ بلبل ہی نکہت و رنگ و گلاب کا رہزن ہے۔ آلٰہی میں کیسے خاموش رہ سکتا ہوں؟ تو نے ان اخوندوں اور ملاؤں کو دنیا میں کیوں پیدا کیا؟ گلستانوں میں زہریلے سانپوں کو پیدا کرنے میں تیری کیا مصلحت ہے؟ تو نے صرف مسلمانوں ہی کو کیوں موردِ الزامات و بلا بنا دیا ہے؟

عارف قزوینی لکھتے ہیں:۔

"اے ماہ رخ دوشیزہ! اب نقاب کو خیرباد کہدے۔ اُن ملاؤں کے کہنے کی کچھ پروانہ کر جن سے حُسنِ قبول اور شہرت منہ پھیر چکی۔ نقاب اتار اور اپنے حُسنِ ضیابار سے عالم کو منور و پرضیا کر میں ضامن ہوتا ہوں کہ برافگندہ نقابی بُرے نتائج پیدا نہیں کرسکتی۔ نقاب عورت کے واسطے دروازہ علم مسدود کردیتی ہے کہاں ہے وہی طاقت کا وہ ہاتھ جو اس بند دروازہ کو کھول دے۔"

مسٹر مہدی حجازی قلزم نے ستر چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھیں۔ جن کے مجموعہ کے نام کا ترجمہ "ترقی پذیر تخیل کی ستر موجیں" ہے ان میں سے ایک میں لکھا ہے کہ:۔

"اے لڑکیو! اے آیندہ نسلوں کی مادرو، تمھیں پر ہماری آیندہ کی تمام امیدوں کا مدار ہے، ماضی سے سبق لیکر مستقبل کو شاندار بناؤ۔ اسلحہ علم سے اپنی ذات کو آراستہ کرو۔ تاکہ ہر شخص تم سے مرعوب ہوکر نگاہ عزت و وقعت سے تمھیں دیکھے۔ خدا وہ دن دکھائے کہ تم گلستان علم کے گلہائے خوش رنگ بنو اور لڑکے اسی گلزار کے بلبل خوش نوا۔ تم اپنے اطوار پسندیدہ سے دنیا بھر کو مسخر کرو۔

نقاب اُلٹ دو تاکہ نیّرِ عقل و فراست مشرق سے طلوع ہو کر ضو فشاں ہو۔

نقاب جہالت کو اتار پھینکو اور آنکھیں کھولو۔ اے خواتین ایران اقتضائے وقت کی مخالفت کسی طرح زیبا نہیں۔ چہروں کو چھپانے کے بجائے کانوں کو بند کر لو تاکہ شیخ صاحب کے مواعظ ناروا نہ سُن سکو۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ آج کل کے شیخ صاحب وہ نہیں ہیں جو زمانۂ ماضی کے تھے۔"

ان کے علاوہ اور شعرا نے بھی اسی طرز میں آزادی نسواں پر بہت کچھ لکھا ہے۔ قلت گنجائش کے سبب سے سب کی تحریریں درج نہیں کی جا سکتیں۔ اِس زمانہ کے ادبی نمونے اپنے ناظرین کو دکھانے کیلئے میں نے صرف چند تحریروں کو منتخب کر لیا ہے۔ اِس زمانے کے نہج شاعری نے غزل سرائی افسانہ نگاری و پند آموزی ترک کر کے صرف معاشرتی یا سیاسی اصلاحات کو اپنا موضوع قرار دیا تھا۔

دستوری حکومت قائم ہونے کے بعد پریس کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ اس نے ایران میں صنف نازک کے ساتھ بدسلوکیوں پر سخت احتجاج کر کے ملّاؤں کو خوب لتاڑا۔ اس نے پورے ملک میں وہ جوش پیدا کر دیا کہ تعلیم نسواں اِس زمانہ کی صحافت کا خاص موضوع بن گیا۔

صوراسرافیل کی یہ عبارت دیکھنے کی ہے :۔

ملک سے رشوت ستانی کی وبا کب جائیگی۔ اور ان نام نہاد ملاؤں کو کب ہوش آئے گا؟ ایران میں قانون و عدل کب قائم ہوگا؟ لڑکوں اور

لڑکیوں کی تعلیم کے لئے سہولتیں کب مہیا ہونگی؟ پیشہ ورنجموں اور مذہبی رہنماؤں کے مہلک جراثیم سے اسلام کب پاک صاف ہوگا۔

اڈیٹر حدید کی درج ذیل تحریر بھی قابل دید ہے:۔

حضرت حوا کی تخلیق چونکہ حضرت آدم کی پسلی سے ہوئی۔ اس لئے انکے ساتھ آپ اپنے جزو بدن کی طرح برتاؤ کرتے تھے۔ ہم نے اس جزو سے غفلت برتی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم مفلوج ہو کر رہ گئے۔"

ستارۂ جہاں کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

"میں ایک موضع میں پہونچا۔ جہاں معلوم ہوا کہ یہاں سیکڑوں اصول پرورش سے ناواقف والدین اپنی بیس سالہ متاہلانہ زندگی میں درجنوں بچوں کو قبر میں سلا چکے ہیں۔ ہمارے ملک کی آبادی کی قلت کی خاص وجہ عورتوں کی جہالت ہے۔"

اسی اخبار کی یہ سطریں بھی لائق مطالعہ ہیں:۔

" ازمنۂ ماضیہ میں اطفال اپنے والدین سے متعلق سمجھے جاتے تھے۔ وہ بچوں کے ساتھ من مانا سلوک کرتے تھے۔ اب ہمیں اس کا کافی احساس ہوگیا ہے کہ اسپر حقوق پرورش ملک اور حکومت کے ہیں۔ لڑکے یا لڑکی کی اچھی یا بری نشوونما اجتماعی حیثیت سے تمام ملک کے تہذیب و تمدن پر اثر انداز ہوتی ہے، حالات حاضرہ کے مدنظر یہ ہماری سنجیدہ توجہ کا سخت محتاج ہے۔"

اس زمانہ کے اخبارات و رسائل کا عام طور پر یہی انداز تھا۔ تمام ملک میں جوش و ولولہ رونما تھا۔ لوگوں کے دلوں میں اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلانے کے اشتیاق کی گویا آگ سی بھڑک رہی تھی۔ سیاسی ترقی قدرتاً اس امر کی متقاضی تھی کہ ملک کے گوشہ گوشہ سے معاشرتی ترقی کی صدائیں بلند ہوں لیکن قدامت پسند ملاؤں کے خلاف کوئی اقدامی شکل اختیار نہیں کی جاسکتی تھی۔ اسی لئے ایران میں ابتک کوئی قانون جاری نہ ہو سکا۔ بلکہ تمام معاملات شرع کے مطابق طے ہوتے تھے۔

مذہبی مقتداؤں کے صدہا سالہ اقتدار پر فوری حملہ آور ہونے کا اسلئے موقع نہ تھا کہ اندرون و بیرون مجلس ابھی ان کا اقتدار باقی تھا۔ لیکن چونکہ ملک میں آذربائجان کے خیابانی اور کرنل محمد تقی کے سے سیکڑوں قوم پرست اور جاں نثار پیدا ہو چکے تھے۔ جو ملک پر اپنی جانیں فدا کرنے کو تیار تھے طبقۂ اناث کی گلوخلاصی کی خاصی امید انہی سے وابستہ تھی۔

سنہ ۱۹۰۶ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک ملک میں امن مفقود تھا۔ معاشرتی رضاکاروں نے تہیہ کرلیا تھا کہ چاہے جو کچھ ہو اصلاحات جاری کرا کر رہیں گے۔ انھوں نے ملاؤں کے خلاف ایڑی چوٹی کا پورا زور لگا دیا۔ اور سیکڑوں نے مخالف طاقتوں سے خطرناک مقابلہ میں اپنی عزیز جانیں تک نثار کردیں۔ مگر ملاؤں ہی کی فتح رہی، یہ دیکھکر ان قومی رضاکاروں نے اپنا طرز بدل دیا۔ اور مقابلہ کو اس طرح جاری رکھا کہ اپنے اپنے گھروں میں اپنی بیویوں اور لڑکیوں کو تعلیم دیتے رہے۔ اور ایران میں

اپنے طبقہ کے مستقبل کی درستی کے لئے تیار کیا۔ قوم ایران کی خداداد ذہانت و ذکاوت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ چند ہی سال کی جدوجہد نے طہران میں تین سو سے زیادہ خواتین کو زیور تعلیم سے ایسا آراستہ کر دیا جو سب کی سب تعمیر قومی میں منہمک ہو گئیں۔ چونکہ سیاسیات اور معاشرتی ترقی یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اسلئے انھوں نے نہ صرف اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کی انتھک کوشش کی بلکہ ملک کے سیاسی معاملات میں بھی گہری دلچسپی لی۔ وہ ایک دوسرے کے مکانوں میں جلسے منعقد کرتیں اور سیاسیات ایران کی خفیہ بحثیں ہوا کرتی تھیں۔

۱۹۱۱ء کے بعد سے تعلیم یافتہ خواتین کے گروہ نے ایران کو تمدن جدید کی شاہراہ پر لانے میں غیر معمولی حصہ لیا۔ چنانچہ مسٹر شستر نے اپنی مشہور کتاب "اسٹرینگنگ آف ایران" میں اِس مجلس خواتین کے افراد کی سرگرمیوں کا حال اِس طرح سپرد قلم کیا ہے :-

"طہران میں یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ ایرانی خواتین کی کم و بیش بکثرت خفیہ جماعتیں ایک مرکزی نظام کے تحت منظم تھیں۔ اس گروہ کے کسی قائد کی نہ میں صورت سے واقف ہوں اور نہ نام سے۔ لیکن وقتاً فوقتاً مختلف طریقوں سے معلوم ہوتا رہا کہ صنف نازک میں سے ہزاروں کا جوش حب الوطنی میرا اور میرے کام کا ممد و معاون رہا۔ اس واقعے کے ثبوت میں چند مثالیں کافی ہونگی:-

ایک روز میں اپنے دفتر ہی میں تھا کہ اطلاع ملی۔ ایک ایرانی کلرک کسی اہم معاملہ سے متعلق مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ یہ نوجوان شخص جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اپنی والدہ کا فرستادہ میرے پاس یہ کہنے آیا کہ میری بیوی کو ایک ایرانی رئیس کی بیگم سے ملنے کے لئے نہیں جانا چاہیئے کیونکہ وہ نواب صاحب دستوری حکومت کے مخالف تھے۔ اور اگر وہ ملنے کے لئے گئیں تو میں ایرانیوں کی نظروں میں مشتبہ ہو جاؤنگا۔ اس پر میں نے پوچھا کہ میری بیوی کے خانگی ارادے سے تمھاری والدہ کیسے مطلع ہوئیں۔ اسنے جواب دیا کہ خواتین کی مجلس راز میں جس کی میری والدہ ایک رکن تھیں۔ اِس معاملہ پر بحث ہو چکی ہے۔ طہران میں یہ ایک عام مقولہ ہے۔ ایوان حکومت کے خلاف شورش میں جب خواتین ایران حصہ لیتی ہیں تو صورت حال نازک ہو جاتی ہے"

"جب شعاع السلطنت کی املاک وجاگیر کی ضبطی ہوئی تو حکومت روس نے رخنہ اندازی سے طور پر یہ مطالبہ کیا کہ شعاع السلطنت کا طہران والا پارک روسی بنک کے قرضے کے عوض رہن ہے۔ ہر شخص واقف تھا کہ یہ مطالبہ بالکل غلط تھا لیکن روسی بنک کے تمام کتابی اندراجات اور دیگر پیش کردہ ثبوتوں کی طرف مطلق توجہ نہ کی گئی اسی سلسلے میں مجھے ایک ایرانی خاتون کے جوش حب الوطنی اور انکی عملی امداد اور ہمت کا حیران کن ثبوت ملا۔ یہ ایک شاہزادہ کی اہلیہ تھیں۔ جنھوں نے اپنے بھائی کے ہاتھ ایک ایسی دستاویز میرے پاس بھیجی جو تمام املاک و مقبوضات اور پورے قرضوں کی ایک مکمل فہرست تھی۔ مگر روسی بنک کے

قرضوں کا اس میں کہیں حوالہ نہ تھا۔ انھوں نے اِس یقین کے ساتھ یہ کارروائی کی کہ گویا اپنا وہ فرض ادا کر رہی ہیں۔ جو ملک کی جانب سے انپر عائد ہے۔ اِس کے باوجود بھی یہ افواہ پھیلی کہ نمایندگان حکومت نے روسی بنک کے مطالبہ کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کر لیا لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور دارالسلطنت کے تمام بازاروں میں سناٹا چھا گیا۔ اپنے نمایندوں کو اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی پر برقرار رکھنے کے لئے بیچارے قوم پرست کیا کر سکتے تھے؟ ایران کی خواتین ہی تھیں جنھوں نے اِس سوال کا دنداں شکن جواب دیا۔

تین سو خواتین سیاہ لباس پہنے اپنے اپنے بیٹی کوٹوں یا آستینوں کی تہوں میں پستول چھپائے ہوئے اپنی اپنی محلسراؤں سے نکل کر منظم طریقے پر روانہ ہوئیں جن کے چہروں سے غیر فانی قوت ارادی کی تمتماہٹ ہویدا تھی۔ وہ سیدھی ایوان مجلس حکومت پہونچیں اور صدر مجلس سے خواہش کی کہ ان سب کو اندر آنے کی اجازت دی جائے۔ صدر کی اجازت پر وہ سب کی سب بڑی دلیری سے صدر نشین کے سامنے آئیں اور آتے ہی اپنی نقابیں الٹ دیں اور پستول دکھا کر کہا کہ اِس پارلیمنٹ میں ہمارے شوہر۔ ہمارے لڑکے۔ ہمارے بھائی جو بھی اس وقت موجود ہیں اگر انھوں نے روسی الٹیمیٹم منظور کرنے کا ذرا بھی خیال ظاہر کیا تو ان سب کو اسی وقت مار ڈالنے کا تصفیہ کر کے ہم یہاں آئے ہیں۔ بڑے افسوس اور نہایت شرم کی بات ہے کہ تم لوگ مرد ہو کر اپنا فرض ادا نہیں کرتے اور ملک کی حرّیت و وقعت کو یوں کھو دینا چاہتے ہو۔

تم سب کے مارنے کے بعد ہم اپنے تئیں بھی ہلاک کر ڈالینگے۔ اور ہماری لاشیں تمھاری لاشوں کے ساتھ مل جائیں گی۔

گو دو ایک ہفتہ کے بعد روسیوں کے ساز باز سے پارلیمنٹ تو برباد ہو گئی۔ مگر اس کا دامن وطن فروشی کے داغ اور دھبے سے پاک و صاف رہا۔ یہ مہم محض ایرانی نقاب پوش عورتوں کی اولوالعزمی سے سر ہوئی۔ جن عورتوں کی پوری عمر بلند چار دیواری کے اندر مردوں کی اطاعت اور ہر طرح کے ظلم و تعدی میں گزری ہو۔ اور جنھیں زمانۂ حال کی تعلیم کا کوئی موقع ہی نہ ملا ہو۔ ان سے ایسی دلیری ظاہر ہونا حیرت انگیز بات تھی۔ اس میں شک نہیں کہ حبس دوام نے انھیں آزادی کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اور وہ دن رات اپنے ملک کیلئے دعائیں مانگتی تھیں۔ اور ملک کے ہوا خواہوں کے کارناموں کو ایسی نظر سے دیکھتی تھیں جیسے ماں اپنے بچے کو اور ایسے دہشت خیز وقت میں جب مردوں کے دل بندوق کی گولی۔ پھانسی کے پھندے اور قید کی صعوبتوں کے ڈر سے بیٹھے جاتے تھے انھوں نے یہ مردانگی دکھائی۔

یہ بیان تو صرف ایک ضمنی مظاہرہ سے زیادہ نہیں۔ ان ہوشمند خواتین کا اصلی میدان جد و جہد کا ارتقاے معاشرت کو سمجھنا چاہیئے جس میں انھوں نے حیرتناک کام انجام دیے۔ ایرانی خواتین کی خفیہ سوسائٹی یا سوسائٹیوں کی ہر ایک رکن خاتون اپنے اپنے حلقہ میں اور دوسری خواتین سے ملتی اور اپنے اثر آفریں اظہار خیال سے تعلیم نسواں اور اپنی بلندی معاشرت کے صائب تدابیر

کی موافقت میں راے عامہ کا اضافہ کرنے کی دوڑ دھوپ میں لگی رہتی۔ انھوں نے جاہل عورتوں سے ارتباط پیدا کرکے دوستانہ ملاقاتوں کے سلسلہ میں رفتہ رفتہ ان پڑھ عورتوں کو بھی اپنا ہم خیال و ہمنوا بنالیا، وہ ایران میں عورتوں کا درجہ بلند کرنے کی تدابیر پر بحث و مباحثہ کیلیے ہفتہ وار جلسے منعقد کرتی تھیں۔

اسی طرح کے ایک جلسے میں ایک خاتون نے کہا "ہمارے مرد احساس عزّت و حیا کھو بیٹھے، ہمارے حقوق کو پامال کرڈالا، اور ہماری تعلیم کی طرف سے قطعی بے پروائی برتی جارہی ہے، ہمارے ساتھ کنیزوں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے ان میں معدودے چند ہی ایسے ہیں جنھیں ان بدسلوکیوں کا احساس ہو چلا ہے جو ہمارے ساتھ روا رکھی گئی ہیں، لیکن ان میں اس صاف دلی کا فقدان ہے جس کے ساتھ اُن کو اس معاملہ میں اپنے جرم کا اقرار کرنا چاہیے اور نہ اُن میں یہ ہمت ہے کہ عورتوں کے درجۂ معاشرت کو بلند کرنے میں پیشقدمی کرسکیں، وہ اوصاف مردانگی کھو چکے ہیں، آؤ اب ہم تہذیب و آداب معاشرت کے انھیں سبق پڑھائیں، اور اپنے مستقبل کو خود اپنے طریقہ پر درست کریں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسنر پریم ایک آرمینین خاتون جن کے شوہر محمد علی شاہ کے زمانہ میں فوجی کمیشنڈ افسر تھے، مجالس خواتین کی یہی بانی تھیں، بعض کہتے ہیں کہ مستورۂ خانم افشار نے ان مجالس کی ابتدا کی، کچھ لوگ اور دوسری خواتین کے

نام بتاتے ہیں، مقامی لوگوں کے مختلف بیانات میں سے کسی ایک کے متعلق صحیح رائے قائم کرنا مشکل ہے، جس حد تک میری معلومات کا تعلق ہے یہ امر یقینی ہے کہ مستورہ خانم افشار نہایت دلیرانہ ہمت اور غیر معمولی قابلیتِ تنظیم کی مالک ہیں، مجھے اس سے بحث نہیں کہ وہ سوسائٹیوں کی بانی ہیں یا نہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کی تعلیم یافتہ خاتونوں کو ایک جماعت کی صورت میں منظم کرنے میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے، جنھوں نے رضاکارانہ طریقہ پر اپنے ملک کو قدیم روایات کی جکڑ بندیوں سے چھڑا لیا۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک دوسری ایرانی خاتون نے طہران میں سب سے الگ اپنا میدانِ عمل تیار کیا، ان کے خیال میں کارکن خواتین کے محض ہفتہ واری جلسے زبانی جمع خرچ سے آگے نہ تھے، کام کے وقت فقط باتوں سے کام نہیں چلتا، اس کے لیے فوری عملی صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہے، ان کا نام نامی طوبیٰ خانم ناموس اور یہ مرزا حسین خاں سرتیپ کی دختر بلند اختر تھیں، جن سے انھوں نے خانگی طور پر ایرانی اور فرانسیسی زبان کی تعلیم حاصل کی تھی، چودہ برس کی عمر میں ان کی شادی مرزا عبدالحسین خاں کے ساتھ ہوئی جو تعلیمِ نسواں کے بڑے حامی اور اپنا وقت تفریح اپنی اہلیہ کو تعلیم دینے میں صرف کیا کرتے تھے جس کی بِنا اُن کے والد نے قائم کی تھی، اس دُور اندیش خاتون کے ساتھ پندرہ سالہ متاہلانہ زندگی گزارنے کے بعد مرزا عبدالحسین خاں

کا بعارضۂ صرع انتقال ہوا، اس کے بعد طوبیٰ خانم کے پاس شادی کے کئی پیام آئے، لیکن انھوں نے کسی کو بھی منظور نہیں کیا، اور اپنی بقیہ زندگی ملک کی خدمت گزاری کے لیے وقف کردی۔

انھوں نے طہران میں ایک مدرسۂ نسواں کھولا، جو پورے ملک میں پہلا مدرسہ تھا، بغور دیکھا جائے تو امریکن گرلس سکول کو ایران میں اپنی قسم کا پہلا ادارہ ماننا پڑتا ہے، اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ طوبیٰ خانم کے اسکول سے بہت پہلے امریکن گرلس اسکول کے علاوہ ایک ایران فیرنیکو گرلس اسکول بھی تھا، جسے ایک فرانسیسی نومسلم مسٹر اثیار خاں نے جاری کیا تھا، اور جنھوں نے ایک ایرانی خاتون کے ساتھ شادی کرلی تھی، یہ سب سہی لیکن یہ دونوں ادارے بیرونی انتظامات کے تحت تھے، حقیقت یہ ہے کہ پہلا ایرانی مدرسہ ایرانی انتظامات کے ساتھ کھولنے کا سہرا طوبیٰ خانم ہی کے سر ہے۔

ملّاؤں نے ان کی نسبت کفر کا فتوےٰ دیدیا، انھیں دق کرنے، ستانے، دکھ دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی گئی، ان کے اسکول کی کرسیاں میزیں اُٹھوالی جاتی تھیں، اسکول آتے جاتے اُن کی طالبات کو زدوکوب کی جاتی، کپڑے پھاڑ ڈالے جاتے اور کتابیں تک چھین لی جاتی تھیں، خود انھیں بھی طرح طرح کی تکلیف و اذیت دی گئی، لیکن وہ نہایت مستقل مزاج اور باہمت خاتون تھیں، انھوں نے ان باتوں کی کچھ پروا نہ کی،

اور اپنے اسکول کو ترقی دے کر اوّل درجہ کا ادارہ بنانے کا تہیّہ کر کے ارباب حکومت سے استعانت کی درخواست کی، خوش قسمتی سے اُس وقت کیبنٹ میں روشن خیال لوگ موجود تھے، ان کی استدعا پر اسکول کی آمد و رفت کے وقت طالبات کی محافظت کے لیے پولیس متعین کر دی گئی۔

۱۹۱۲ء میں مریم خانم ایک کُردی خاتون اور نورالدجیٰ خانم اور بدرالدجیٰ خانم مہرتاج دختران امام الحکما جنھیں عام طور پر ہندوستانی سمجھا جاتا تھا یا یہ کہ اُن کے والد ایرانی اور والدہ ہندوستانی تھیں، امریکن مدرسے کی پہلی گریجویٹ خاتون ہیں، مقدم الذکر دو خواتین تو طوبیٰ خانم کے مدرسہ کی دیکھ بھال میں شریک ہو گئیں اور بدرالدجیٰ مہرتاج نے رفاہ معاشرت خواتین کا ایک ادارہ قائم کیا، مدرسہ میں نئی اعلیٰ جماعتوں کا اضافہ کیا گیا، یہاں تک کہ ۱۹۱۳ء میں وہ ایک اوّل درجہ کا ادارہ ہو گیا اور اُس کی اسناد کو حکومت ایران نے بھی تسلیم کر لیا، مریم خانم بانقاب باہر نکلتی تھیں، لیکن یہ دونوں دخترانِ ہند ہیٹ پہنے انگریزی لباس میں مردوں کی طرح آزادی سے چلتی پھرتی تھیں، کہا یہ جاتا تھا کہ ان دونوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا ہے، اور اِسی وجہ سے وہ جُہّال اور مُلّاؤں کے دست تعدی سے محفوظ رہیں۔

طوبیٰ خانم تو گویا پڑھانے ہی کے لیے پیدا ہوئی تھیں، ان کا اپنی

طالبات کے ساتھ مادرانہ شفقت سے پیش آنا یہ وہ برتاؤ تھا جس کے اثر نے ہر ایک دل میں گھر کر لیا تھا، چنانچہ اُن کے مدرسہ کی فارغ التحصیل لڑکیاں خدمت مُلک کو اپنا اصلی نصب العین سمجھ کر یا اُسی اسکول میں ملازمت اختیار کر لیتیں، یا نئے مدارس قائم کرتیں اور یا تحریک آزادی نسواں کے کامیاب بنانے میں مصروف ہو جاتی تھیں۔

لیڈیز کلب کے ہفتہ وار جلسوں میں شرکت کے لیے طوبیٰ خانم کے پاس وقت نہ تھا لیکن اُن کا مدرسہ کلب میں کام کرنے والی خواتین کو بکثرت فراہم کرتا تھا، بڑھتے بڑھتے ۱۹۱۴ء میں کارکن خواتین کی تعداد پانچسو سے زیادہ ہو گئی، ان کی مجلس عاملہ میں یہ خواتین شریک تھیں محترم خانم اسکندری، دُرۃ الملیح خانم، فرخ لقا خانم، مہرتاج رخشاں دختر امام الحکما، فخر النسا جو اب فخر عادل کے نام سے مشہور ہیں اور خانم دولت آبادی، انھوں نے تمام ایران کو اپنے دائرہ عمل میں لے لیا، بالطبع تمام مُلک بہتر زندگی بسر کرنے کا خواہشمند تھا اور ہر مشہور شہر میں طوبیٰ خانم سی تعلیم یافتہ خواتین ترقی نسواں کے راستے کی رہنمائی کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں،

مریم خانم ازدلان طہران کے امریکین گرلس اسکول کی پہلی ایرانی گریجوٹ نے ابتداءً شہر تبریز میں ایک چھوٹا سا مدرسہ کھولا اُس میں کثرت سے

لڑکیاں بہ طیب خاطر داخل ہوئیں، جن میں اکثر خود اُن کی عزیز تھیں، جب اُن کے مدرسہ کی ترقی کے آثار نمایاں ہوئے تو اُن کے شوہر کا ایرانی قونصل خانہ سے ٹرکی تبادلہ ہوگیا، اُنھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ جانے سے انکار کردیا، اور تبریز ہی میں رہ کر ملک کی خدمت گزاری کو ٹرکی جانے پر ترجیح دی،

تقریباً چھ سال تک وہ اپنے شوہر سے علیحدہ رہیں اور باوجود اس کے کہ پبلک کی جانب سے اُن کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی، مگر وہ انتہائی کوشش و انہماک سے اپنے اسکول کو ترقی دیتی رہیں، ۱۹۲۰ء میں کچھ اور خواتین اُن کی امداد کیلیے آگئیں اور اُن کا اسکول طرز جدید کا ایک بڑا ادارہ ہوگیا، طوبیٰ خانم کے اسکول کی طرح اُن کے اسکول کی کامیاب شدہ لڑکیوں کا بھی وہی طریقہ رہا کہ تکمیل تعلیم کے بعد یا تو اپنی خدمات اُسی اسکول کے نذر کردیں اور یا تبلیغ کا کام شروع کردیا، ایرانی عورتیں بالطبع نہایت مستعد و جفاکش ہوتی ہیں، اور اُن میں صلاحیت کار بدرجہ اتم ہوا کرتی ہے، جب وہ کسی کام کے کرنے کا بیڑا اُٹھا لیتی ہیں تو کبھی اُسے ادھورا نہیں چھوڑتیں، ۱۹۲۱ء میں اُنھوں نے اپنا اسکول اپنی ایک عزیزہ کے سپرد کردیا اور خود کار تبلیغ میں مصروف ہوگئیں آجکل وہ طہران میں مہتمم مدارس نسواں کے عہدہ پر فائز ہیں۔

اُس زمانہ کی کارکن خواتین میں ایک دوسری درخشاں ہستی خانم دولت آبادی کی ہے، مرزا ہادی دولت آبادی ایک روشن خیال مجتہد ہیں، جنھیں اصفہان والے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، یہ ان ہی کی پارۂ جگر ہیں، موصوف نے اپنے گھر میں اپنے والد ہی سے تعلیم حاصل کی ۱۹۱۱ء میں ایک مدرسۂ نسواں اصفہان میں قائم کیا، مقامی ملاؤں کے ہاتھوں انھیں بھی بہت تکلیفیں پہونچیں، ان کے بھائی جو ترقی پسند اور وسیع النظر مجتہد تھے اگر وہ حمایت نہ کرتے تو یہ زندہ جلا دی جاتیں،

تنگ نظر ملاؤں اور جاہل عوام کے ہاتھوں ان کے تلخ اور صبرآزما تجربات کسی طرح طوبیٰ خانم کے تجربوں سے کم نہ تھے، ان مزاحمتوں کے اختتام تک برابر ان کا مقابلہ جاری رہا، یہاں تک کہ اپنے ادارہ کو استوار بنیاد پر قائم کر کے دم لیا، آزادیٔ نسواں کی پُرزور تحریک کے لیے انھوں نے "زبان زنان" کے نام سے ایک ایسا اخبار جاری کیا جو اپنی نوعیت کا پہلا اخبار تھا، اور تمام ملک میں اسکی بہت اشاعت تھی، یہ اخبار بہت کامیاب ثابت ہوتا لیکن اسکی مدیر خانم دولت آبادی اتفاقی طور پر سیاسیات میں بھی حصہ لینے لگیں، ارباب حکومت کے طرز عمل پر ان کی نکتہ چینیوں نے مقتدر افراد کو ایسا برہم کر دیا کہ اُن کا اخبار حکماً بند کر دیا گیا،

سنہ ۱۹۲۰ء میں اپنا ادارۂ تعلیم اصفہان میں بدرالدجیٰ خانم کے سپرد کرکے یہ خود طہران آگئیں، انجمن خواتین نے ان کا خیر مقدم کیا اور انھوں نے اس انجمن کی جانب سے نہایت انہماک سے مؤثر طریقہ پر آزادی نسواں کی تبلیغی خدمت انجام دی، اسی سلسلے میں اپنی اور مصروفیتوں کے علاوہ اُنھوں نے معاشرتی، اقتصادی اور ادبی مضامین کا ایک رسالہ بھی نکالا۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں یہ اپنی تمام جائداد غیر منقولہ جو انھیں وراثتاً ملی تھی فروخت کرکے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلیے فرانس چلی گئیں۔

سنہ ۱۹۲۸ء میں فرانس سے واپس آنے پر وہ مُلک میں بے نقاب ہوگئیں اور ایرانی خواتین کو بے نقاب کرنے میں اُنھوں نے بڑا حصہ لیا، وہ آجکل خانم مریم اردلان کی طرح طہران میں گرلس اسکول کی انسپکٹرس ہیں۔

فخر عادل اس زمانہ کی ایک اور ایسی ممتاز خاتون ہیں جن کا کارنامہ زندگی اپنی صنف کی ترقی میں نمایاں اہمیت رکھتا ہے، وہ ایک روشن خیال فوجی افسر کرنل مرتضیٰ علی خاں کی دختر نیک اختر اور طوبیٰ خانم کی شاگردوں کی جماعت اولین میں سے ہیں، طوبیٰ خانم کے اسکول سے تعلیم کا ڈپلوما حاصل کرنے کے علاوہ ان کے والد نے خانگی طور پر انھیں انگریزی اور فرانسیسی کی بھی تعلیم دلوائی، بیس برس کی عمر میں انھوں نے جوان عورتوں کی مفت تعلیم کیلیے ایک مدرسہ کھولا، ایران میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا مدرسہ

تھا، آٹھ برس تک یہ مدرسہ ترقی کرتا رہا، لیکن پھر کچھ ناموافق حالات کی وجہ سے مجبوراً یہ درسگاہ بند کر کے وزارت معارف میں انھیں ملازمت اختیار کرنا پڑی، وہ ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں اور اُن کی نظمیں جو کبھی کبھی اخبارات میں شائع ہوئیں نہایت دلچسپ ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک دوسری قابل ذکر خاتون خانم پروین اعتصام الملک کی صاحبزادی ہیں، ان کے والد پارلیمنٹ ہاؤس کی لائبریری کے لائبریرین ہیں اور یہ خود بھی دانش سرائے عالی کی لائبریرین ہیں، مجھے ان سے اور ان کے والد ماجد سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، یہ امریکن کالج کی گریجویٹ، انگریزی اور فرنچ سے بخوبی واقف ایک بلند پایہ ادیب اور ایران کے اہل قلم میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں، ان کے ادبی کارنامے ملک بھر میں مشہور ہیں۔

علوم مشرقیہ کے مغربی فضلا نے ان کے علم و فضل کی تعریف کی ہے، تصوّف میں وہ تمام ایران میں مُستند مانی جاتی ہیں، ان کا ۲۱۳ صفحوں کا دیوان بمقام طہران حال ہی میں طبع ہو کر حُسن قبول حاصل کر چکا ہے، فطرتاً وہ نہایت سنجیدہ ہیں اور مزاج میں تصنع کا پتہ نہیں، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند نظموں کے سوا جو انھوں نے کبھی کبھی آزادی نسواں پر لکھیں ملک کی اس تحریک میں ان کا

کوئی نمایاں حصہ نہیں، یہ صحیح ہے کہ انھوں نے براہ راست تو کچھ زیادہ کام نہیں کیا لیکن اپنی سنجیدگی و شائستگی، نکوکاری و خدا ترسی کے پر تو سے ہمعصر خواتین کے دلوں کو منوّر کردیا۔

یہ ہستیاں اُن ممتاز خواتین میں سے صرف چند ہیں جنھوں نے زمانۂ انقلاب میں آزادیِ نسواں کی حمایت کیلیے بڑی جانبازی سے کام لیا، حتی الامکان میں نے مؤثق ذرائع معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر پھر بھی ممکن ہے کہ بعض ایسی ہستیاں پردۂ فروگزاشت میں مخفی رہ گئی ہوں، جنھوں نے ملک کو تمدن و معاشرت جدیدہ کی شاہراہ پر لانے کی اہم ذمہ داری زیادہ تر اپنے ذمہ لی ہو، اگر واقعی ایسی بھول چوک ہوگئی ہے تو اسکے متعلق ہرگز یہ خیال نہ کیا جائے کہ اِن کے اعزاز کو گھٹانے کے لیے قصداً ایسا کیا گیا ہے۔

ایران کی موجودہ ترقی کے تذکرے سے انقلابی زمانہ کے سربرآوردہ ذکور و اُناث کی سوانح حیات لکھنا میرا مقصد نہیں بلکہ صرف یہ واضح کرنا ہے کہ جدید معاشرت اور اصلاحات ملک کی مرضی کے خلاف اس کے سر نہیں منڈھے گئے، میں نے اس زمانہ کی چند ممتاز کارکن خواتین کا انتخاب یہ دکھانے کے لیے کیا کہ ۱۹۱۰ء سے ملک ہی بسرعت و تعجیل اپنے اصلی نصب العین کی سمت یعنی مغربیت

کی طرف بڑھ رہا ہے اس لیے اس سلسلے میں کسی ایک کا ذکر کرنے اور دوسرے کو نظر انداز کردینے کا الزام مجھ پر عائد نہیں ہوسکتا ،

علاوہ ازیں بظاہر ترقی ایران پر اب تک کوئی مستند کتاب نہیں لکھی گئی اسی لیے مقامی لوگوں کی اطلاعات ہی پر اعتماد کرنا پڑا ، اور یہ ظاہر ہے کہ ان میں تضاد پائے جانے کی صورت میں درجۂ وثوق تک پہونچنا ایک مؤرخ کیلیے آسان کام نہیں ہے ، "بیداری ایران" ایک چھوٹی سی کتاب ضرور ہے لیکن وہ بھی تاریخی واقعات حاضرہ سے مُعرّا ، اور چند در چند وجوہ کی بنا پر قابل اعتماد نہیں ، فارسی میں رضا شاہ پہلوی کی تخت نشینی تک زمانۂ انقلاب ایران کی بہترین تاریخ لکھنے والے کیلیے وزارت تعلیم ایران نے پانچسو تومان انعام دینے کا اعلان کیا ہے ، اس انعام پانے کے آرزومند وقائع نگار اپنی اپنی جگہ تاریخ زیر تذکرہ کی تدوین میں ہمہ تن مصروف ہیں اور جب تک اس مقابلہ کے نتیجہ کا اعلان نہ ہو اپنے اپنے ذاتی ذخیرۂ معلومات کو منظر عام پر لانا گوارا نہیں کرتے ، نتیجۂ مقابلہ جلد ظاہر ہونے والا ہے اور انعامی نسخۂ کتاب وزارت تعلیمات ہی کی جانب سے شایع کیا جائے گا ۔

اب پھر موضوع ترقیِ نسواں کی طرف توجہ فرمائیے ، ۱۹۲۰ء میں

طہران میں امریکن گرلس اسکول کی نصابی کمیٹی نے ایک مشہور رسالہ موسوم بہ "عالم نسواں" جاری کیا، اس کمیٹی کو امریکن مشن کی ایک رکن مسز اے۔ سی بوائس کا تعاون اور قیادت حاصل تھی، خواتین ایران کو حالات حاضرہ سے واقف کرنا اور اُن میں کام کرنے کی صلاحیت پیدا کر دینا اس رسالہ کا مقصد تھا، مستورات سے متعلق ہر قسم کے موضوعات پر اس میں بحث ہوتی تھی اور حفظان صحت امور خانہ داری اور پرورش و تربیتِ اطفال کے متعلق خاص طور پر توجہ دلائی جاتی تھی، اور دوسرے ممالک کی عورتوں کے حالات سے بھی آگاہ کیا جاتا تھا اس کے ہر پرچہ کی اشاعت بارہ ہزار سے زائد تھی اور اس نے ایران کے اسّی شہروں میں رسائی حاصل کرلی تھی، تقریباً بارہ سال تک اس رسالہ کی اشاعت تمام مرد و زن پر بڑا اثر ڈالتی رہی اور ترقی نسواں میں بھی اس نے کچھ کم حصہ نہیں لیا

۱۹۲۱ء میں جب اعلیحضرت مُلک کی اندرونی اصلاحات و ترقیات کی طرف متوجہ ہوئے تو قدامت پسند ملاؤں کے سوا پورا ملک نفاذِ اصلاحات کیلئے تیار تھا، تمام فہیم و خردمند مرد و زن ایک بہتر طریقۂ زندگی حاصل کرنے کے متمنی تھے، دونوں صنفوں کے مسئلہ تعلیم کے متعلق ملک میں کافی احساس پیدا ہو چکا تھا، لیکن صرف مُلّا مخالف تھے اور ایک بڑی دشواری یہ بھی تھی کہ حکومت کی جانب سے کوئی ہمت افزا تعاون حاصل نہیں تھا، ایران میں متواتر تبادلوں کی وجہ سے یہ مشکل پیش آگئی تھی کہ مرکزی حکومت اپنا کوئی

مستقل اور مناسب لائحہ عمل نہیں بنا سکتی تھی، سیاسی مُدبّرین زبانی وعدے بہت کچھ کرتے تھے لیکن عملاً اس کی حد صفر کے مساوی تھی، ایسے حالات کے مدنظر اس زمانہ کی محب وطن خواتین نے اپنی صنف کی ترقی و بہبود کیلیے جو کچھ بھی کیا وہ بہادری و مردانگی کا نمایاں ثبوت ہے۔

اعلیحضرت دائم الحبس مستورات کو حریّت و آزادی کی وسیع فضا میں لے آنا اپنا فرض اوّلیں سمجھتے تھے انھیں یقین تھا کہ دُنیا میں کوئی مُلک اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا، جب تک اُسکے مردوں کو اُسکی عورتوں کا تعاون حاصل نہ ہو، لیکن شاہ نے اس کام میں بے انتہا احتیاط برتی، حقیقت حال کو بخوبی سمجھ کر وہ بڑی دلچسپی سے تحریک نسواں کا معائنہ کر رہے تھے اور معاملات کو اُنھیں کے حال پر یونہی چھوڑ دیا تھا،

سنہ ۱۹۲۱ء سے وہ نہایت معنی خیز سکوت کے ساتھ انھیں تدابیر میں مصروف رہے، یہاں تک کہ سنہ ۱۹۲۵ء میں جب مُلاؤں کا زور توڑنے کے لیے اُن کی مجوزہ تدابیر مکمل ہو گئیں تو اُنھوں نے آہستہ آہستہ لیکن مسلسل ضربوں سے اپنی اقتدار نمائی کا آغاز کیا، آخر کار ملاؤں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، مجتہدین پر اُن کی کاری ضربیں معاشرتی اصلاح کیلیے راستہ صاف کرتی ہوئی ملک کے تمدن جدید کی رفتار میں تیزی و سُرعت پیدا کرتی چلی گئیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء کے آغاز تک نئے ضوابط دیوانی و فوجداری مرتب ہو گئے

نئی عدالتیں قائم ہوئیں، جبریہ فوجی ملازمت اور بہت سی چھوٹی بڑی اصلاحات عمل میں آئیں جن سے مُلّاؤں کے اقتدار کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔

اِسی سال مُلّاؤں نے ملکۂ ایران کو ناخوش کرکے اپنے پاؤں میں آپ کلھاڑی ماری، واقعہ یہ ہوا کہ ملکہ، والدۂ ولیعہد رسوم نوروز ادا کرنے کیلئے قم تشریف لے گئیں، حضرتِ معصومہ ہمشیرۂ جناب امام رضاؑ علیہ السلام کے مزار پر اتفاقاً اثنائے ادائے رسوم میں کہیں اُن کے چہرے سے نقاب ہٹ گئی، بس پھر کیا تھا جو مُلّا صاحب زیارت پڑھا رہے تھے، یہ دیکھ کر برس پڑے اور اِس زمانہ کی مستورات کے دین اسلام کے مروجہ رسوم سے انحراف کے رجحانات پر بے طرح اظہارِ نفرت کیا، اِس نازیبا حرکت سے تمام مجمع نے مشتعل ہوکر اپنی ناراضی کا مظاہرہ کیا۔

ملکہ نے فوراً ٹیلیفون پر اس واقعہ کی شاہ کو اطلاع دی، یہ خبر دم بھر میں آندھی کی طرح چاروں طرف پھیل گئی اور تمام ملک مُلّاؤں کی مخالفت پر آمادہ ہوگیا، اب نہ صرف اقتدار شاہی ملک میں روز افزوں تھا بلکہ ذاتِ خسروی کو پبلک میں بے انتہا ہر دلعزیزی حاصل ہوچکی تھی، مُہذب دُنیا میں احترام مستورات گویا ایک قانون بن چکا تھا، منظرِ عام پر کسی عورت کی توہین و تحقیر ایک وحشیانہ فعل

سمجھا جاتا تھا، ملکہ کی منزلت کو نظر انداز کر دینا گویا ملک و مالک کی علانیہ توہین تھی، اسی بنا پر شاہ نے تہیہ کر لیا کہ اس موقع پر ملاؤں کے اچھی طرح کان کھول دیے جائیں، دو مسلح موٹروں اور ایک فوجی دستہ کے ساتھ شاہ خود قم آئے، روضۂ مقدس میں داخل ہوتے ہی سیکڑوں مجتہدوں اور ہزاروں زائرین کے سامنے خطا وار ملا کی کوڑے سے خوب خبر لی، کہا جاتا ہے کہ صرف ایک یہی واقعہ ہے جس میں شاہ نے ملاؤں کو جسمانی سزا دی، اور اس میں شک نہیں کہ وہ اسی کے مستحق تھے، اس واقعہ کا پبلک پر ایسا اثر ہوا کہ وقار ملائیت ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گیا.

۱۹۲۸ء میں اس تاریخ سے یکے بادیگرے اصلاحات جاری ہوتی رہیں اور ملاؤں کی مخالفت کی مطلق پروا نہیں کی گئی.

اس واقعہ کے بعد حکومت کو اجرائے احکام کیلئے پوری آزادی حاصل ہو گئی، وزارت معارف نے محکموں کو جدید اصولوں پر از سر نو منظم کیا، لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے سیکڑوں نئے مدرسے بڑے بڑے شہروں ہی میں نہیں بلکہ جا بجا قصبوں اور گاؤں میں بھی کھول دیئے، اور پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کیلئے فرانسیسی طرز پر کودکستان (کنڈر گارٹن) میڈیکل کالج، لا اسکول، انجینیرنگ کالج، انڈسٹریل اسکول، اگریکلچر کالج، آرٹس کالج اور اعلے تعلیم کیلئے اسی قسم کے اور ادارے قائم کر دیے

ابتدائی تعلیم سے اعلےٰ اداروں تک میں لڑکوں اور لڑکیوں کی یکجا تعلیم تمام ملک میں جاری ہو گئی، اور کسی طرف سے اس طرزِ تعلیم پر اعتراض نہیں ہوا۔

اِسی سال کے آخر تک مسلمان مستورات کو سنیما، قہوہ خانوں اور عام تفریح گاہوں میں آمد و رفت اور سڑکوں پر مردوں سے ہمکلام ہونے اور اُن کے ساتھ کھلی سواریوں میں نکلنے کی بھی اجازت مل گئی، پولیس کو اس امر کی نگرانی کی ہدایات کر دی گئیں کہ جو خواتین ان رعایات سے استفادہ کرنا چاہتی ہیں اُن کی ایسی نگرانی کی جائے کہ انھیں کوئی نہ ستا سکے۔

چند ہی ماہ بعد ایک اور اہم تر اقدام یہ ہوا کہ جو خواتین بغیر نقاب باہر نکلنا چاہتی تھیں حکومت نے اُن کی محافظت پولیس پر لازمی قرار دیدی روشن خیال خواتین ان رعایتوں سے کما حقہ مستفید ہوئیں، اور اِس نئی تحریک کو عام طور پر پھیلانے کیلیے اپنے ملک کی قدامت پسند خواتین کو قہوہ خانوں جانے اور سنیما دیکھنے کی ترغیب دیکرا پنا ہم خیال بنالیا۔

خانم دولت آبادی جو فرانس یونیورسٹی کی اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں چھ سال سے زاید فرانس رہ کر ابھی آئی تھیں پولیس کی محافظت میں باہر نکلنے لگیں، مجھے اُن کے یہاں تقریباً دو ہفتے بطور مہمان قیام کرنے کی مسرت حاصل ہوئی، شب کو کھانے کے بعد ان کی گفتگو بہت دلچسپ ہوتی تھی، جس کا موضوع عموماً خود اُن کے دورِ حاضرہ کے تجربوں کا ذکر ہوتا تھا۔

موصوف نے ایک دن یہ پُرلطف واقعہ بیان کیا کہ جب وہ ایک مرتبہ شمران سے موٹر بس میں آرہی تھیں تو شیخ تقی اصفہان کے ایک مشہور و معروف مجتہد کو اتفاق سے ان ہی کے برابر جگہ ملی، شیخ نے اپنے ایک ہمسفر سے جگہ بدلنے کیلیے اس وجہ سے کہا کہ کسی نامحرم عورت کے چہرے پر نظر پڑنا اُن کے خیال میں ایک بڑا گناہ تھا، یہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں اور مجتہد صاحب کے برابر بیٹھے ہوئے مسافر سے جگہ بدلنے کی خواہش کی، جگہ خالی ہوتے ہی وہ پھر اُنھیں کے برابر جا بیٹھیں اور قبلہ و کعبہ سے کہنے لگیں میں چاہتی ہوں کہ آپ کے روئے مقدس کی زیارت کرتی رہوں، آپ کا دیدار فیض آثار میرے لیے بڑی مسرت کا باعث ہے، آپ مجھے اس سے روک نہیں سکتے، اگر آپ میری صورت دیکھنا نہیں چاہتے تو نہ سہی، منہ پر نقاب ڈال لیجئے، اپنی عبا کے دامن سے بہ آسانی آپ یہ کام لے سکتے ہیں۔"

موٹر بس کے تمام مسافر ہنسنے لگے اور مجتہد صاحب بہت خفیف ہوئے، انھوں نے زبان سے تو کچھ نہ کہا، لیکن اپنا چہرہ رومال سے چھپا لیا، اسلیے کہ وہ اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے کیوں کہ اُن کی محافظت کیلیے پولس کا جوان موٹر بس میں موجود تھا مجلس کے ایک رُکن نے مجھ سے بیان کیا کہ اب سے بیس برس پہلے جب کہ مُلاؤں کا دور دورہ تھا یہی مجتہد صاحب اسقدر با اختیار تھے کہ اگر ایسا ہی واقعہ اُس زمانہ میں پیش آتا تو نہ جانے یہ کیا قیامت ڈھاتے۔

انھیں بزرگ کے بارے میں ایک اور دلچسپ روایت یہ بیان کی گئی کہ اتفاقاً

یہ حضرت اصفہان میں بیمار پڑے اور علاج کیلئے ہسپتال سے ایک عیسائی ڈاکٹر بلایا گیا ڈاکٹر کے رخصت ہوتے ہی آپ نے حکم دیا کہ جس کرسی پر ڈاکٹر کی نشست رہی ہے اُسے فوراً جلا ڈالا جائے اور جس کمرہ میں وہ کرسی تھی اُس کے تمام بیش قیمت قالین نکال کے دھونے اور طاہر کرنے کیلئے فوراً بھیجدیے جائیں، اُس کرسی کو معاً جلا دیا گیا اور دو گھنٹے کے اندر قالین ملازمین ایک گدھے پر لاد کر تالاب پر لے گئے، اور جب قالینوں کو دھو دھلا کر سوکھنے کے بعد لائے تو قبلہ و کعبہ نے چلّا کر پوچھا " کیا تم قالین طاہر کر لائے " ؟ ملازمین نے جواب دیا " جی ہاں " مجتہد صاحب نے پھر ڈانٹ کر پوچھا " اور گدھے کو " ؟ " ارے تم نے اُس پر دوبارہ قالین لادنے سے پہلے کمبخت گدھے کو بھی طاہر کیا یا نہیں ؟ " ملازمین نے جواب دیا " جی اُس کو تو غسل نہیں دیا " پھر کیا تھا قبلۂ دین آپے سے باہر ہو گئے اور فرمانے لگے کہ " عیسائی ڈاکٹر نے میرے قالینوں کو نجس کر دیا، جب تم نے اُن کو گدھے پر لادا تو بوجھ کی وجہ سے جانور کو یقیناً پسینہ آیا ہوگا، اور قالینوں کی نجاست پسینے میں مخلوط ہو کر جانور کو بھی نجس کر چکی ہوگی، تو طاہر قالین نجس جانور پر لادے جانے کی وجہ سے پھر نجس ہو گئے، انھیں فوراً واپس لے جاؤ، قالینوں کو از سرِ نو طاہر کرو، گدھے کو غسل دو، پھر اُس پر قالین رکھ کر لاؤ۔

اس قسم کے مذہبی جنون نے جس سے بڑھ کر کوئی حماقت نہیں ہو سکتی ان کی منزلت کو خاص و عام کی نظروں میں بجائے گرا دینے کے قابلِ رشک بنا دیا تھا اور وہ گویا مجسم طہارت و تقویٰ سمجھے جاتے تھے۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں افغانستان میں ایک ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا، شاہ امان اللہ خاں کی اصلاحات کے تعجیل نفاذ نے تمام افغانوں کو برافروختہ کر دیا، جو بلحاظ تمدن و معاشرت رفتارِ زمانہ پانچ صدی پیچھے تھے، وہاں قدامت پسند مُلّاؤں نے جاہل عوام کی آتشِ غیظ و غضب کو خوب بھڑکایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امان اللہ خاں کو تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔

ایران میں ایسا جھگڑا اُٹھنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا کیونکہ مُلک میں تمام اصلاحات بسرعت ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ بڑی احتیاط سے یکے بادیگرے جاری کیے گئے۔ پھر بھی صورت حال پیچیدگیوں سے بالکل آزاد نہ تھی، شاہ ایران اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کہ افغانی ایرانیوں کے قریب ترین ہمسایہ تھے، گویا ایران دو متضاد کیفیات کے زیرِ اثر تھا ایک طرف تو ٹرکی کا ترقی یافتہ اثرِ مغربیت، اور دوسری طرف تاریک خیال افغانوں کا مذہبی جنوں۔ اِسی بنا پر بلحاظ مآل اندیشی شاہ نے مزید اصلاحات کو بالفعل ملتوی کر دیا اور مُلک کو نافذ شدہ اصلاحات کا عادی ہونے کیلیے دو سال کا وقفہ دیا۔

مُلک ایران اب بہت کچھ ترقی کر چکا تھا، کوئی مخالف طاقت اُسکے تمدنِ جدید کی رفتار کو روک نہیں سکتی تھی، مشہد میں کچھ شورش ہوئی تھی لیکن وہ فوراً دبا دی گئی، دو سال کے وقفے نے لوگوں کو بے چین کر دیا، ایک طرف تو اخبارات آزادیِ نسواں کیلیے شور مچا رہے تھے، دوسری طرف سارے مُلک میں جا بجا جلسے

منعقد ہو رہے تھے، جن میں شاہ کا شکریہ ادا کر کے استدعا کی جاتی تھی کہ رسم نقاب کو بھی اُٹھا دیا جائے، جا بجا نقاب پوشی کا مضحکہ اُڑانے کیلیے تماشے دکھائے جاتے تھے، مشہور خوش بیانوں کی تقریریں ترک نقاب کے خلاف گراموفون ریکارڈوں میں محفوظ کر کے ہر گھر میں یہ ریکارڈ سُنائے جاتے تھے۔

اس زمانے کے چند جدید اخبارات کے اہم مضامین کا اقتباس درج ذیل ہے، مدیر اخبار "ستارۂ جہاں" نے اس تحریک کو فروغ دینے میں بڑا حصّہ لیا، انھوں نے اپنے اخبار کا نصف حصہ محض مسئلہ نقاب کے متعلق رائے عامہ کے اندراج کے لیے مخصوص کر دیا، ۱۳ر دسمبر ۱۹۳۱ء کے پرچے میں انھوں نے لکھا:۔

"معلوم نہیں کہ ایران میں نقاب کا رواج کب اور کیسے ہوا، ہم نہیں کہہ سکتے کہ اسلام اس رواج کا ذمہ دار ہے اسلیے کہ احکام قرآنی اس مسئلہ میں واضح اور بیّن نہیں ہیں، قرآن شریف میں سورۂ نور کی چوبیسویں آیت کا تو یہ مفہوم ہے کہ عورتیں اپنے سروں، گردنوں اور سینوں کو چھپائیں، اُن کو چاہیے کہ بجز اپنے شوہروں، خسروں، بیٹوں، بھائیوں، بھتیجوں، غلاموں اور اولاد کے اور کسی کے سامنے اپنا بناؤ سنگار ظاہر نہ کریں۔

اس آیت میں کہیں اس کا ذکر نہیں کہ وہ اپنا منہ اور ہاتھ پاؤں بھی چھپائیں، اسکے علاوہ ہم اور دلائل سے بھی ثابت کر سکتے ہیں کہ

نقاب کا استعمال لازمی نہیں، اس باب میں مجتہدین بھی متفق الرائے نہیں ہیں، ان میں سے بعض اسکے مؤید ہیں اور بعض مخالف، جو نقاب کی تائید میں ہیں وہ بھی اپنی رائے کے اثبات میں کوئی معقول دلیل نہیں رکھتے۔

کتاب جواہر الکلام میں درج ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت رسولؐ اکرم سے کسی نے سوال کیا کہ کیا کوئی اجنبی کسی عورت کی طرف دیکھ سکتا ہے؟ آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں وہ اُسکے چہرے ہاتھ اور پاؤں پر نظر ڈال سکتا ہے، اگر استعمال نقاب عورت کی حفاظت کیلئے ہے تو آج بے نقاب عورتیں بمقابلہ نقاب پوش کے زیادہ محفوظ ہیں۔"

اخبار آئندہ ایران نے ۲۱ فروری ۱۹۳۲ء کے پرچہ میں یہ مضمون شایع کیا :-

"قبل اسکے کہ ہم اپنی عورتوں کو بے نقاب کریں اول انھیں زیور تعلیم سے آراستہ کرنا لازم ہے، بغیر تعلیم کے وہ سوسائٹی میں مل جل نہیں سکتیں ہم کو مخالفین نقاب کے بے معنی شور وغوغا کی اُس وقت تک کچھ پروا نہ کرنی چاہیے جب تک پچاس فی صدی عورتوں کو تعلیم یافتہ نہ بنالیں۔"

۱۶ راپریل ۱۹۳۴ء میں مدیر اخبار دعوت اسلام نے یہ لکھا کہ :-

" ہماری عورتیں بے نقابی کیلیے کیوں جلدی کر رہی ہیں؟ نقاب کے خلاف آجکل جگہ جگہ شور و شر برپا ہے، عام طور پر جو جو وجوہ پیش کیے جاتے ہیں، وہ یہی ہیں کہ نقاب مانع ترقی ہے زیر نقاب رہ کر عورتیں سوسائٹی کے لیے بکار آمد نہیں ہوسکتیں۔ جب مردوں ہی کیلیے کام نہیں تو پھر عورتوں کے واسطے کام کہاں سے آئے، اب تو وہ دس سے پچاس تومان تک اپنے چادر بیچوں کی تیاری میں صرف کر دیتی ہیں، بے نقابی کے بعد نہ معلوم ٹوپیوں، پاتابوں اور پوڈر کے استعمال کیلیے کتنا روپیہ درکار ہوگا، لہذا ہمیں چاہیے کہ اسوقت تک انتظار کریں جب تک کہ وہ تعلیم یافتہ ہوکر امور خانہ داری اور کفایت شعاری سے اچھی طرح واقف ہو جائیں"۔

۳۰ر اپریل ۱۹۳۲ء کو فخر عادل نے اخبار آئندہ ایران میں یہ مضمون لکھا:۔

" یورپ میں عورتیں اپنے امور خانہ داری کے علاوہ جس کو وہ نہایت توجہ کے ساتھ انجام دیتی ہیں اپنے شوہروں کا بھی اُن کے کام میں ہاتھ بٹاتی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ہمارے یہاں کی عورتیں فرائض خانہ داری بھی اچھی طرح انجام نہیں دے سکتیں، ہم اُمید کرتے ہیں کہ وہ جلد اس قابل ہو جائیں گی کہ اپنے فرائض زندگی کو خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرسکیں"۔

اُس زمانہ کے اخبارات کا یہی انداز تھا، ملک عورتوں کو پوری آزادی دینے کیلئے بیچین تھا، مُلّاؤں کا میدان عمل سے باقاعدہ اخراج ہو چکا تھا، ملک میں کوئی قدامت پسند جماعت باقی نہ تھی، تاہم راہ ترقی میں شاہ پھونک پھونک کے قدم رکھتے تھے چنانچہ عورتوں کی بے نقابی کا مسئلہ ابھی اپنی حالت پر چھوڑ دیا گیا تھا، ۱۵ر اگست ۱۹۳۱ء کو شادی کے متعلق اہم اصلاحات نافذ ہوئے، ان اصلاحات کے ضروری نکات یہ تھے:۔

(۱) شادی اور طلاق کے متعلق تمام معاہدوں کی رجسٹری قانوناً عدالت مجاز میں لازمی ہے۔

(۲) شادی کیلئے کم سے کم لڑکی کی عمر ۱۶ اور لڑکے کی ۱۸ سال ضروری ہے۔

(۳) جو لوگ اپنی جسمانی حالت کو شادی کے اہل ثابت نہ کر سکیں اُنکی آپس کی شادیاں ممنوع ہیں۔

(۴) زوجہ اپنی ذاتی جائداد کو حسب مرضی خرچ کرنے کی مجاز ہے۔

(۵) کسی شخص کو ایک زوجہ کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے کا استحقاق نہیں جب تک کہ پہلی زوجہ سے دوسری شادی کی رضامندی نہ حاصل کرلے، اس عمل سے تعدد ازدواج کی بڑی روک تھام ہوگئی، کیونکہ پہلی زوجہ کی رضامندی حاصل کرنا آسان بات نہیں۔

(۶) نااتفاقی کی صورت میں زوجہ شوہر سے طلاق لینے کی مختار ہے۔

⑦ لڑکے اور لڑکیاں قبل اسکے کہ وہ آپس میں شادی کرسکیں انھیں باجازت والدین دو سال تک باہم ملنے جلنے کا موقع دینا لازمی ہے۔

⑧ بغیر اجازت حکومت کوئی غیر ایرانی کسی ایرانی لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرسکتا، مگر اس شرط سے اجازت دی جاسکتی ہے کہ یہ ثابت کرسکے کہ وہ ایرانی لڑکی کی حیثیت عرفی کے موافق نان و نفقہ کا کفیل ہوسکتا ہے۔

۱۹۲۳ء میں بیروت سے مسلم لیڈیز اور نیشنل کانفرنس کا ایک وفد جس میں بارہ مستورات تھیں ایران آیا، صدر وفد میڈم نور حمیدہ اور ان کے ساتھ ایک فرنچ لیڈی میڈم حسنین بھی تھیں، میڈم نور حمیدہ نے تحریک آزادی اناث کی کامیابی کا بیڑا اٹھایا تھا، ان کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ خواتین ایران میں سے نمائندے منتخب کریں۔

ایرانیوں نے بڑی گرم جوشی سے ان کا خیر مقدم کیا، وہ ایرانی عورتوں کو تعلیم یافتہ ذکی الطبع اور محب وطن پاکر بہت خوش ہوئیں، خود ایران میں ترقی نسواں کی ایک ایسی انجمن موجود تھی جو بیس سال میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دے چکی تھی ناصر الدین شاہ قاچار کے آخر عہد حکومت میں ایک ایرانی خاتون زینب نامی شہر تبریز میں بڑی اولوالعزم ہوئیں جنھیں خدا نے غیر معمولی قوت تنظیم عطا کی تھی، ایک دفعہ اسی شہر میں قحط پڑا، ملک کے متمول تجار نے غلہ مہنگا بیچنے کے لالچ میں اپنے اناج کے بڑے بڑے کھتوں کو بند کر دیا، زینب نے رضا کار مستورات کی ایک جماعت منظم کرکے اُسے ہتھیاروں سے مسلح کر دیا اور اس فوج کو ساتھ لے کر گورنر کے پاس پہونچیں اور دھمکی دی

کہ اگر عام طور پر غلہ فروخت کرنے کیلئے غلّے کے گودام نہ کھلوائے گئے۔ تو اُن پر حملہ کر دیا جائے گا۔ گورنر نے خائف ہو کر اناج کے کھتّے کھولنے کا فوراً حکم دیدیا۔ یہ کام امیسویں صدی کی ایک نقاب پوش خاتون نے کیا۔

حال میں کردی خاتون مشرف خانم کا اکہزار نظموں کا طبع شدہ کلیات جدید شاعری کا ایک اعلےٰ نمونہ خیال کیا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ مشرف خانم مشہور شاعر یغما کی ہمعصر تھیں جس کو خاندان قاچار کے آخر زمانے میں عروج ہوا۔ اگر کوشش کی جاتی تو اس زمانہ کی اور دوسری خواتین کے کلیات بھی دستیاب ہو جاتے۔ مجھے معلوم ہوا کہ اِس دور کی اور بھی قابل و لائق خواتین تھیں مگر ملاؤں کے ڈر سے وہ اپنی تصانیف شائع نہ کر سکیں۔ مشرف خانم کی سی لیاقت و قابلیت کی اور بہت سی خواتین ایران میں موجود تھیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے ایران کی عورتوں میں خاص قابلیت عطا کی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ بیرونی سیاحوں نے اپنی لاعلمی سے انھیں جاہل اور بیوقوف ظاہر کیا ہے۔

ایسے زمانے میں جب نہ کوئی باقاعدہ درسگاہ تھی اور نہ مستورات کی تعلیم کیلئے خانگی انتظامات تھے بلکہ ملاؤں کے خود ساختہ مذہب کی رو سے عورت کو پڑھانا بھی بڑی معصیت تھا ایران میں ایسی قابل عورتیں پیدا ہوئیں۔

اِسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اِس زمانہ میں جب ہر طرف علم کا چرچا اور اُن کی تعلیم کے لئے متعدد درسگاہیں کھلی ہوئی ہیں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ موجودہ زمانہ کی

خواتین ایران کو اپنی ہمعصر مشرقی بہنوں کے مقابلے میں کافی تفوّق و برتری حاصل ہے۔ چنانچہ اُن سے اسی کی توقع بھی تھی اِس لئے کہ وہ عرصے سے اپنے حقوق حاصل کرنے کیلئے لڑ رہی تھیں اور اُس قابلیت کا اظہار کرنا چاہتی تھیں جو قدرۃً اِن میں ودیعت ہے۔ اعلیحضرت رضا شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی انھوں نے دنیا پر ثابت کر دیا کہ وہ ہر طرح اپنی دوسری مشرقی بہنوں پر فضیلت رکھتی ہیں اور انھوں نے صرف چند ہی سال کی مدت میں کیا کچھ نہیں کر دکھایا۔

جس وقت بیروت کی خواتین کا وفد ایران آیا تو خود ایران میں سو سے زیادہ خانم دولت آبادی کی سی قابلیت و لیاقت کی مستورات موجود تھیں۔ جن میں بعض نے تو یورپین یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی اور بعض امریکن مشن اسکول سے گریجویٹ ہو کر نکلی تھیں چند ایسی بھی تھیں جنھوں نے خانگی طور پر اپنے والدین یا شوہروں سے اعلےٰ تعلیم حاصل کی تھی۔

بہر طور خواتین ایران ترقی کی دوڑ میں بہت آگے تھیں اور انھیں اپنی موجودہ گورنمنٹ سے تائید کی پوری توقع تھی اُن کی ساری کوشش یہی تھی کہ اپنی بہنوں کیلئے آزادی حاصل کریں۔ انھوں نے اپنے لئے یہ بات باعثِ سُبکی سمجھی۔ جب بیروت کے وفد نے طہران میں خواتین کی ایک کانفرنس منعقد کرنا چاہی۔

خانم دولت آبادی نے مجھ سے بیان کیا کہ ۱۹۲۸ء میں بحیثیت نمائندہ اپنے ملک کی طرف سے امریکن ورلڈ ڈیمن کانفرنس میں شرکت کے لئے مجھے

پیرس بھیجا گیا۔ فرانس سے واپس ہوتے وقت میں نے ٹرکی کے ایرانی قونصل خانہ میں چند ہفتے قیام کیا۔ وہاں اپنے چند روزہ قیام میں میں نے اُس ملک کی بے نقاب عورتوں کی کم تعداد کی بنا پر کوئی اچھی رائے قائم نہ کی کاروباری بازاروں مین عورتیں بیس فی صدی بھی نظر نہیں آتی تھیں۔ باوجود اِسکے کہ آزادی نسواں کے لحاظ سے ٹرکی ایران سے دس سال آگے ہے۔ خانم دولت آبادی نے نہایت وثوق سے اِس امر کا اظہار کیا کہ ایران کی وہ مستورات جو ابھی بے نقاب نہیں ہوئی تھیں ٹرکی کی بے نقاب بہنوں سے اُنھی نے زیادہ کام کیا۔

پھر کہنے لگیں کہ :۔ "ہماری ترکی بہنوں نے تو تحریک آزادی نسواں سنہ ۱۹۰۸ء میں شروع کی۔ مگر سنہ ۱۹۱۲ء تک صرف زبانی جمع خرچ رہا۔ ہاں سنہ ۱۹۱۳ء میں ترکی خواتین کی سوسائٹی نے پہلا مدرسۂ نسواں استنبول میں قائم کیا۔ ہمارے یہاں ہوائی قلعے تو بنائے ہی نہیں گئے بلکہ حقیقی کام سنہ ۱۹۱۰ء میں آغاز کردیا گیا۔ تین سال کی قلیل مُدّت میں ہم نے صرف طہران میں اتنے مدارس نسواں کھولدئے کہ جب ۱۹۱۳ء میں ہماری ترکی بہنوں کو اپنے اسی پہلے مدرسہ کیلئے اساتذہ کی ضرورت ہوئی تو ہمارے سامنے اپنے اداروں کی نگرانی کیلئے ایک انسپکٹرس کے تقرر کا مسئلہ درپیش تھا۔ میں خواتین بیروت کے ساتھ تعاون کرنے پر بدل رضامند نہیں تھی لیکن اپنے یہاں کے قدیم روایات مہمان نوازی کے احساس نے مجھے مجبور کردیا کہ اُن کی خاطر مدارات کی جائے اِس لئے کہ وہ ہماری مہمان تھیں۔

ایرانی خواتین نے بادل ناخواستہ اس کانفرنس میں شرکت کی جس کی صدر نورحامدہ منتخب ہوئیں۔ کانفرنس میں حسبِ ذیل رزولیشن پاس ہوئے:۔

(۱) "خواتین ایران بکثرت تعلیم یافتہ ہوتے ہی اپنی گورنمنٹ سے ووٹنگ کا حق حاصل کریں۔"

(۲) گورنمنٹ سے استدعا کی جائے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ابتدائی تعلیم جبری قرار دی جائے اور اعلےٰ تعلیم خود اختیاری۔"

(۳) "گورنمنٹ سے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے صنعتی مدارس کھولدینے کی استدعا کی جائے۔"

(۴) بیرونی ممالک کے کل مدارس جو ایران میں ہوں اُن میں مادری (فارسی) زبان لازمی قرار دی جائے۔

(۵) شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکی کا طبّی معائنہ لازمی ہے۔

(۶) شادی سے پہلے لڑکا اور لڑکی دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے کے مواقع دینے ضروری ہیں۔

(۷) تعدد ازدواج پر ناقابل عمل قیود عائد کرکے اس رسم کا استیصال کردیا جائے۔

(۸) مقامی صنعتی اشیاء کے استعمال کی ترغیب دی جائے۔

پرانے کاغذات سے اخذ کئے ہوئے یہ رزولیشن جب خانم دولت آبادی کو

سُنائے تو انھوں نے نہایت بے پروائی سے کہا کہ ایسے رزولیوشنوں کی ہمیں ضرورت ہی نہیں اِس لئے کہ ہماری موجودہ گورنمنٹ نے اُن پر عمل کرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ بلکہ اِن میں سے بعض کے متعلق تو احکام بھی جاری ہوچکے ہیں۔ اور یہ اجرائے احکام کانفرنس کے بحث و مباحثہ کی بنا پر نہیں ہوئے بلکہ ایمائے شاہی اس کا اصلی سبب ہے کیونکہ ہمارے جہاں پناہ صنف نازک کی بہتری و برتری کی جانب بہت متوجّہ ہیں۔

سنہ ۱۹۳۴ء میں ملکۂ ایران بے نقاب یورپ تشریف لے گئیں جب ملک جرمنی سے ہوکر گزرنے لگیں تو وہاں کے ایک اعلٰے افسر نے بنظر اعزاز و احترام ان کی خدمت میں ایک گلدستہ پیش کیا جسے شاہ کی اجازت سے بہت شکریہ کے ساتھ ملکہ نے قبول کیا۔ گویا یہ مزید آزادی خواتین کے لئے ایک نیک شگون تھا۔ جب ایران میں یہ خبر پہونچی تو بہت خوشیاں منائی گئیں اور معلّمات مدارس سے اشارۃً یہ کہا گیا کہ آیندہ اُن کے بغیر نقاب اسکول آنے جانے سے گورنمنٹ نہایت مسرور ہوگی۔ چند ماہ کے بعد باقاعدہ احکام جاری کئے گئے جن کی رُو سے معلّمات و متعلمات کو مدارس میں بے نقاب جانے کی ہدایت کی گئی۔ سمجھنے والے سمجھ گئے تھے کہ ہَوا کس رُخ چل رہی ہے۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں خواتین کا ایک ادبی ادارہ قائم ہوا اور بڑی شاہزادی اس کی صدر منتخب ہوئیں۔ اس ادارہ کے مقاصد حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مدارس طالبات میں اساتذہ اور شاگردوں کو تعلیم ورزش کی ترغیب دینا۔

(۲) ادارہ کے ارکین میں باہمی تعاون اور احساس ہمدردی کو ترقی پذیر کرنا۔

(۳) طریقۂ تعلیم میں اصلاح اور اخلاقی معیار کو ترقی دینے کے لئے بحث اور مباحثے۔

سنہ ۱۹۳۵ء کے آخر تک ملک کے ہر شعبہ میں خاطر خواہ ترقّی نمودار ہوئی۔ قدیم طرز معاشرت میں بتدریج نہایت واضح اور نمایاں تغیّرات رونما ہوئے۔ محکمجات تعلیمات۔ تعمیرات۔ حفظانِ صحت وصفائی۔ عدالت یہ سب کے سب بسرعت ترّقی کر کے کچھ سے کچھ ہو گئے۔ اس پر بھی شاہ مطمئن نہ تھے کیونکہ اپنے مطمح نظر کی تکمیل ان کے مدّ نظر تھی۔

۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۳۵ء کو جب اعلیٰحضرت نے دسواں افتتاح کیا تو اُس وقت ملک کی دہ سالہ ترقی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"ایران کے اندرونی حالات کے متعلق میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ زمانۂ ماضی میں ہماری قوم اس قدر غفلت اور افلاس کا شکار رہی ہے کہ ہم جتنا آگے بڑھتے ہیں ہمیں یہی محسوس ہوتا ہے کہ اور آگے بڑھنا چاہیئے۔ لہذا ہمارے حصول مقاصد کی ایک ہی راہ ہے کہ ہم سب جان توڑ

کوشش کریں۔ اب تک جو کچھ بھی کیا گیا ہے اس کا ذکر کم اور جو کچھ کرنا ہے اس کا تذکرہ زیادہ ہونا چاہئے۔ لہذا میری یہ ہدایت ہے کہ اس سیشن میں جو لائحہ عمل پیش نظر ہے اس کی جانب عملی پیش قدمی کی ضرورت ہے نہ کہ محض بحث و مباحثہ کی۔

اکیسواں باب

نقاب متروک

۱۹۳۶ء میں آزادی نسواں کے مسئلے نے انتہائی صورت اختیار کر لی۔ جنوری ۱۹۳۶ء کی آٹھویں سے ایران کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا اور حکومت کی طرف سے نقاب پوشی موقوف کر دی گئی۔ طہران کے مشہور اخبار "ایران" نے اس مہتم بالشان واقعہ کو اس طرح لکھا کہ :۔

معاشرتی زندگی میں کل ہماری مادر وطن نے ایک نئے دور کی ابتدا کی۔ یہ وہ تاریخی دن ہے جس میں سرکاری طور پر آزادی نسواں کے اعلان نے ہمارے ملک کی نصف آبادی کو حیاتِ نو عطا کی۔ حریت آزادی کی یہ نعمت غیر مترقبہ پہلوی عہد میمنت مہد کی بدولت نصیب ہوئی۔ اس مژدۂ جاں فزا سے سارا ملک بادۂ مسرت سے سرشار ہو گیا۔

ٹھیک تین بجے سہ پہر میں اعلیٰحضرت ملکہ و شاہزادی شاہ دخت کو ہمراہ لئے قصر شاہی سے برآمد ہوئے اور حشم و خدم کے ساتھ نو تعمیر نارمل اسکول روانہ ہوئے۔ شاہانہ سواری کی گذرگاہ پر دو رویہ مرد و زن اور بے نقاب عورتوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ خوش آمدید کے نعرے لگا رہے تھے۔ مدرسۂ طبیہ کی طالبات نے شاہی خیر مقدم کا فرض ادا کیا اور عظیم المرتبت مہمانوں کو اسکول کے بڑے ہال میں لے جاکر مراسم مہماں نوازی ادا کئے گئے۔"

وزیر اعظم مسٹر سمعی نے وزراء کی بیگمات کا شاہ، ملکہ اور شہزادی سے تعارف کرایا۔ اس کے بعد محبوب ملک تاجدار اور ملکۂ ذی وقار سے کامیاب طالبات کو اسناد و انعامات تقسیم کرنے کی استدعا کی۔ وزیر اعظم کی استدعا کے موافق شاہ نے لڑکوں اور ملکہ نے لڑکیوں کو اسناد عطا فرمائے۔ اختتام تقسیم پر زن و مرد کے اس مخلوط مجمع سے جس میں پانچسو سے زیادہ بے نقاب عورتیں موجود تھیں سر آرائے ایران نے اس طرح خطاب کیا کہ :-

"مجھے یہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہے کہ ہمارے ملک کی خواتین نے تعلیم سے بہرہ ور ہو کر اپنے مدارجِ حیات کو پہچان لیا اور اپنے اُن حقوق و مراعات کا مطالبہ کرنے کے لئے پیش قدمی کی جنھیں وہ بہت پہلے پانے کی مستحق تھیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ بچوں کی

پرورش، گھر کی چار دیواری میں مقید و محبوس رہنا، سوسائٹی میں آنے جانے اور ملنے جلنے کا بھولے سے بھی خیال نہ کرنا یہ اُن کے مخصوص فرائض تھے۔ لیکن اب وہ وقت ہے کہ علاوہ مادری فرائض کے وہ زندگی کے دوسرے کاروبار میں بھی حصّہ لے رہی ہیں۔

پہلے ہمارے ملک کی نصف آبادی گویا کسی شمار ہی میں نہ تھی بالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہماری آدھی قوّتِ کار بیکار پڑی ہوئی تھی۔ مردم شماری میں عورتوں کو کبھی شمار نہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسری نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔

آج کا دن بہت مبارک دن ہے اِس موقع سے جو تمھیں دیا گیا پورا فائدہ اٹھا کر ملک کی ترقّی کے لئے قدم بڑھانا چاہیئے۔ تمھارے ملک کو ایسے کارکنوں کی ضرورت ہے جس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہوں۔

اے میری لڑکیو! آج تم اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ سوسائٹی میں داخل ہوئی ہو۔ تم کو جاننا چاہیئے کہ آیندہ کس کام کی امید تم سے وابستہ ہے۔ ملک کا مستقبل تمھارے ہاتھوں میں ہے تمھیں آیندہ نسلوں کی رہبر و رہنما ہو۔ اپنی زندگی کو کامیاب یا ناکامیاب، ناکام بکارآمد یا بیکار، سودمند یا بےسود

بنانے کا انحصار تھیں پر ہے۔"

اِس تقریر شاہانہ پر بڑے جوش و خروش سے نعرہائے مسرت بلند ہوئے۔ اور انہی پُرمسرّت نعروں کی گونج میں مراجعت شاہانہ عمل میں آئی۔ یہ تاریخی دن روزِ عید اور اس کی رات شبِ برات سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اسی رات مجلس شوریٰ کی عمارت میں ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا جس میں ممبرانِ پارلیمنٹ، وزرائے کیبنٹ، مدیرانِ اخبار، اور دوسرے طبقے کے معززین اپنی مستورات کے ساتھ شریک جلسہ ہو کر ایک دوسرے سے تعارف کرانے میں مصروف ہوئے، ملک کے تمام اضلاع و صوبہ جات میں بھی اُسی دن یہ تقریب انجام پائی۔

دوسرے دن ملک کے تمام اطراف واکناف سے تاروں کی بھرمار شروع ہوئی جن میں شاہ اور ملکہ کا شکریہ ادا کر کے اِس امر کا اظہار کیا گیا تھا کہ التفات خسروانہ نے سوسائٹی میں ایک ایسے برمحل اور سودمند تغیر کی ابتدا کی جس کی ملک کو سخت ضرورت تھی۔

اِس اہم واقعہ کے مہینہ بھر بعد اخبار "اطلاعات" میں اس عنوان کے تحت کہ "حضرات علماء نے بھی نقاب ترک کرنے میں پیش قدمی اختیار کی" یہ لکھا کہ:-

"ہمارے پاس مختلف صوبوں سے موثق اطلاعیں وصول ہوئیں کہ مجتہدین اور ملاؤں کا طرزِ عمل نقاب کے بارے میں کیا رہا۔

ہمیں یہ سنکر بڑی خوشی ہوئی کہ بتدریج ہمارے علما بھی یورپین لباس اختیار کرکے اپنی مستورات کو بے نقاب باہر لا رہے ہیں۔ یہ امر نہایت تسلی بخش اور اطمینان آور ہے۔ کیونکہ ایران میں ہمارے علما اور ملاؤں کی بڑی تعداد حقیقت اسلام اور اسکے اوامر و نواہی کے تفصیلی احکام سے واقفیت تام رکھتی ہے۔ علمائے کرام اب اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ ان کی قابلیتِ امور مذہبی یا ان کا زہد و اتقا کسی خاص قسم کے استعمال لباس پر منحصر نہیں دکھاوا اور نمائش اور شے ہے اور اوصاف باطنی کچھ اور ہی منزلت رکھتے ہیں ؎

تن کو کیا دھوتا ہے دل کو پاک کر
اے نجس شیست و شو اچھی نہیں

نقاب کی تاریکی نے سالہا سال سے ہماری خواتین کو ایسے اندھیرے میں رکھا کہ وہ سوسائٹی کے مفید اجالے سے محروم رہیں۔ ہماری ترقی کے راستہ میں یہی ایک بڑی رکاوٹ اور سدِّ راہ تھی۔ مولوی ملّاؤں ہی نے اسے ایجاد کیا تھا۔ لیکن اب وہی اِس کے سخت مخالف ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ نقاب کا مطلب یہ نہیں کہ چار پنج مربع بالوں کی کوئی چیز اوپر ڈالدی جائے بلکہ اُس کے معنی کچھ اور ہی ہیں۔ آیات قرآنی جو نقاب کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں اُن کے

معانی بہت بلند اور دقیق ہیں۔

نقاب خود کوئی نصب العین نہیں بلکہ یہ ایک نصب العین تک پہونچنے کا ذریعہ و وسیلہ ہے اور اس کا مقصد تحفظ عصمت و عفت کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہمیں بخوبی معلوم ہوگیا کہ نقاب نہ صرف تکمیل مقصد میں ناکام رہی۔ بلکہ اس سے بالکل خلاف نتائج پیدا ہوئے اور قانون اسلام کے مقاصد کو سخت نقصان پہونچا۔

اس کے دو دن بعد اخبار " ایران " میں " علما اور نقاب" کے عنوان سے یہ مضمون شائع ہوا :۔

" مختلف مقامات سے یہ خبریں آرہی ہیں کہ ہمارے یہاں کے علما زندگی کے ہر ایک جدید شعبے اور طریقے سے مانوس ہوگئے ہیں نقاب اٹھانے کی رسم عملی طور سے اختیار کرکے وہ اپنی بے نقاب مستورات کے ساتھ شاہراہوں پر نظر آتے ہیں۔ اور نہایت گرمجوشی سے ترک نقاب کی نسبت ان کے وعظ و پند کا سلسلہ جاری ہے۔

مسئلۂ نقاب پوشی کی کافی چھان بین، تفصیلی مطالعہ اور پوری تحقیق کر چکنے پر اب وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ کلام مجید کی رو سے عورتیں اپنا منھ، ہاتھ اور پاؤں چھپانے پر مجبور نہیں ہیں"

اور براگندہ نقابی کسی طرح احکام اسلام کے خلاف نہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ کونسا مجتہد اِس بات کو تسلیم کریگا کہ سارے مصائب، قیود، اور پستی کی بیماری میں ہماری قوم کا نصف حصّہ مبتلا تھا۔ محض اِس وجہ سے کہ ہم اسلام کے مسلمہ اور سخت قوانین کے تابع رہے۔

ہمارے علما کے اِس معقول وپسندیدہ طرز عمل کا ملک پر بہت اچھا اثر مرتب ہوا۔

میں ہمدان میں بہت سے علماء سے ملا جو مغربی لباس میں بالکل یورپین جنٹلمین معلوم ہوتے تھے۔ ایک دن شیخ عمادزادے سے میرا تعارف کرایا گیا جو پہلے بڑے متعصب ملا تھے مگر اب بالکل بدل گئے ہیں، انھوں نے شب کے کھانے پر مجھے مدعو کیا اور اپنی شریک زندگی سے تعارف کرایا جو ایک خوبصورت اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ دورانِ طعام میں عورتوں کے تعین مراتب پر گفتگو ہوتی رہی۔ وہ اور ان کی اہلیہ دونوں آزادیٔ نسواں کے بڑے حامی اور اس معاملے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے۔

مجھ سے اُن کی اہل خانہ کہنے لگیں کہ ہندوستان میں علما کو یہ مشورہ کیوں نہیں دیا جاتا کہ معاشرتی اصلاح کی طرف مسلمان متوجّہ ہوں، میں نے کہا

کہ مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ہمارے ہندوستان میں زیادہ تر مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ بالشت بھر داڑھی بڑھانے اور ٹخنوں سے اونچا پائجامہ پہننے ہی پر جنّت یا دوزخ کے داخلے کا انحصار ہے۔

میرے اِس کہنے پر انھوں نے قہقہہ لگایا اور ان کے شوہر کہنے لگے کہ مجھے آپ پر بہت ترس آتا ہے آپ زمانے کے بہت پیچھے ہیں، آپ مجھے ہندوستان آنے کی دعوت کیوں نہیں دیتے؟ دیکھئے تو میں وہاں آکر کیا کرامات دکھاتا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ میں کوئی وجاہت ظاہری نہیں رکھتا اور ایسا اقدام میرے بس کی بات نہیں۔

غرضکہ ایران میں ترقّی نسواں کے مسئلہ نے کافی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ میں نے ملّاؤں کے تبدیل لباس وغیرہ اور طبقۂ اناث کی بتدریج ترقی کی نسبت تفصیلی طور پر جو اظہار خیال کیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایران کی موجودہ ترقی مستقل اور پائدار تبدیلی ہے نہ کہ سطحی اور نمائشی۔

یہ کوئی ایسا مرتب ڈرامہ نہیں ہے جس میں مختلف ایکٹرس منیجر کے اشارے پر ایکٹنگ کرتے ہوں جیسا کہ بعض امریکن سیّاحوں اور اخباروں کے نامہ نگاروں کا خیال ہے بلکہ ایران کی ترقی در اصل اہل ایران کی زندگی میں ایک مستقل و دائمی حیرتناک تغیّر کا واقعہ ہے۔

ایران کے معاشرتی میدان میں اصلاحات کی جو بلند عمارت

بنائی گئی ہے اس کی بنیاد فوری جذبات کی ریتلی زمین پر نہیں، بلکہ وہ ایسے مستحکم یقینیات کی سنگین چٹان پر قائم ہے جسے تعلیم عامّہ کے پشتے مضبوط و استوار بنائے ہوئے ہیں۔

بائیسواں باب

ایران میں تعلیم جدید کا دَور

پہلوی حکومت کے دس سال میں جتنے تغیّرات ہوئے اِن میں تعلیمی دلچسپی کا نمبر سب سے آگے رہا ہے۔ مظفرالدین شاہ قاچار کے ابتدائے عہدِ حکومت میں بجز ایک دارالفنون کے جو ناصرالدین شاہ کے زمانے میں طہران میں قائم ہوا تھا پورے ملک میں کوئی سرکاری یا امدادی ادارہ ایسا نہ تھا جسے آجکل کے لحاظ سے اسکول کے نام سے موسوم کیا جاسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ جابجا مدارس تھے مگر وہ سب کے سب امریکن فرنچ اور انگلش مشنریز کے قائم کئے ہوئے اور ملک کی اسلامی آبادی کیلئے یہ کچھ زیادہ بکار آمد نہ تھے۔

مدّتِ دراز سے عیسائی مشنریز کے خلاف مذہبی تعصب چلا آتا تھا۔ ان مدارس کے متعلق ملاؤں کا یہ اعتقاد تھا کہ یہاں کی تعلیم بچّوں کو کافر بناتی ہے۔

اسی وجہ سے مسلمان عموماً اِن مدرسوں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ امریکن عیسائی یا ایرانی یہودی یہی ان درسگاہوں سے زیادہ ترمستفید ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ اعلےٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال گھرانوں کے صرف گنتی کے چند مسلمان لڑکے اور لڑکیوں کو بھی ان مدارس سے استفادے کا موقع ملا مگر ادھورا۔ کیونکہ اِن جدید مدارس سے رائے عامّہ کی سخت نفرت اور پرزور مخالفت کی بنا پر یہاں یہ اپنی تعلیم کی تکمیل نہیں کر سکتے تھے۔

اِس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ مجھ سے بیان کیا گیا کہ ایک مشنری خاتون نے کسی ایرانی خاتون کو اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا۔ جب وہ تشریف لائیں تو انھیں ڈرائنگ روم میں جھولے کی کرسی پر بٹھایا۔ ایرانی خاتون اِس کرسی پر اپنا توازن قائم نہ رکھ سکیں اور پھسل کر نیچے گر پڑیں۔ گرتے ہی ایک چیخ ماری اور پھر اُٹھ کر کہنے لگیں کہ "واہ! تم نے مجھے عیسائی بنانے والی مشین میں بٹھا دیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں اس پر سے گر پڑی اور تمھارے منصوبے پر پانی پھر گیا۔ ورنہ تم نے تو مجھے عیسائی بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی" مشنری خاتون نے خیال کیا کہ وہ ہنسی سے کہہ رہی ہیں لیکن جب وہ چائے آنے سے پہلے ہی تیوری چڑھائے اپنے گھر سدھاریں تو اِس طرح اِن کے جانے پر اب میزبان کو یقین آیا کہ جو کچھ مہمان نے کہا تھا وہ مزاح اور مذاق نہیں بلکہ واقعہ تھا۔

ایران کے جاہل مردوں اور عورتوں کے دلوں میں متعصب ملّاؤں نے ایسے ڈراؤنے خیالات جما دئے تھے کہ وہ اِن جدید اداروں سے خاص دشمنی رکھتے تھے۔ اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مشنریوں کو اپنے مدارس قائم کرنے اور انھیں ترقّی دینے میں کیا کچھ دشواریاں نہ پیش آئی ہونگی۔ اِن ماہرین علم تعلیم نے باوجود اُن بیشمار دشواریوں اور بے انتہا رکاوٹوں کے جو قدم قدم پر انھیں روکتی اور ستاتی رہیں جس صبر و استقلال سے اپنی سعی و کوشش کو جاری رکھا وہ نہایت قابل تعریف اور بیحد لائق توصیف ہے۔ مسلمان لڑکوں کے لئے ملک میں اگر درسگاہیں تھیں بھی تو لے دے کے وہی ملّاؤں کے دقیانوسی مکتب۔ مشنریز کے مدارس میں لڑکے اور لڑکیوں کو اگر کافر بنایا جاتا تھا تو ملاؤں کے مکتبوں سے وہ احمق و بیوقوف بنکر نکلتے تھے۔ ایرانیوں کی یہ مثل بے معنی نہیں کہ "ایک خچر مکتب گیا اور وہاں سے گدھا بن کر لوٹا۔

دولتمند والدین اپنے لڑکوں کو یا تو مکان ہی پر تعلیم دلواتے اور یا حصول تعلیم کیلئے یورپ بھیجتے تھے۔ مگر غریب عوام بدستور جاہل کے جاہل رہتے تھے۔ امین الدولہ جو اس زمانے کے بڑے روشن خیال مُدبّر تھے انھوں نے یہ خرابی محسوس کی کہ ملک فقدان تعلیم کی وجہ سے بد سے بدتر ہو رہا ہے۔ اِس مسئلے پر کافی غور و خوض اور ملک میں طرز جدید کے مدارس

قائم کرنے کے تجاویز پیش کرنے کے لئے چند ذی اثر ایرانیوں کی ایک کمیٹی ترتیب دی۔ کمیٹی میں حسب ذیل اشخاص شریک تھے۔

(۱) مرزا محمود خاں مفتاح الملک۔

(۲) مخبر السلطنۃ۔

(۳) احتشام السلطنۃ۔

(۴) ممتحن السلطنۃ

(۵) حاجی مرزا یحییٰ دولت آبادی۔

(۶) مرزا غیاث السلطنۃ ادیب۔

(۷) مرزا عبدالرحمن۔

مفتاح الملک اِس کمیٹی کے صدر اور حاجی مرزا یحییٰ اِس کے معتمد قرار پائے۔

اُنھوں نے ایک روزانہ اخبار موسوم بہ "تعلیم" جاری کیا جسکی تقسیم ملک میں اِس غرض سے مفت کی جاتی تھی کہ عام خیالات و رجحانات کا اندازہ کر کے جدید طرزِ تعلیم کی طرف انھیں راغب کیا جائے۔ اِس اخبار میں عموماً تعلیم عامہ کا مسئلہ زیر بحث رہتا تھا اور حصول تعلیم کے جدید طریقوں کی اشاعت کی جاتی تھی لگاتار تین مہینے تک موصوف نے اِس بارے میں بڑی کوشش کی لیکن عوام کی طرف سے جواب سکوت پاکر اُنکی آس ٹوٹ گئی

مجبوراً انھوں نے اپنی سعی و کوشش سے باز آنے کا ارادہ کرلیا۔ لیکن مرزا یحییٰ جو بڑے جوشیلے کارکن تھے وہ اپنے ارادے سے نہ ہٹے اور اپنی مجوزہ اسکیم کو کامیاب بنانے کی دُھن میں لگے رہے۔ اِس مسئلہ پر اُن کے اور مخبر الدولہ کے درمیان خوب بحث رہی اور یہ باہمی مراسلت جو زیادہ تر نظم میں تھی مرزا یحییٰ کی خود نوشتہ سوانحمری "اردی بہشت" میں درج ہے۔

مرزا یحییٰ کی اِس استدعا پر کہ اُن کے اسکیم کی معاونت کی جائے مخبر السلطنۃ نے جواب دیا۔

"نہ حکومت کو ایسی جدید تعلیم کی ضرورت، اور نہ ملک کو اس کی نوعیت سے آگاہی و واقفیت۔ تو پھر ملک میں جدید طرز کے مدارس کھولے جانے کی تجویز کیسے لائق اعتنا قرار پاسکتی ہے۔ یہ مانا کہ تعلیمی معاملات میں میری رائے اہمیت رکھتی ہے لیکن جب لوگ چاہتے ہی نہیں تو پھر تنہا میری رائے کیا بکار آمد ہوسکے گی۔"

مرزا یحییٰ نے جواب دیا کہ :-

"مدارس کی تائید میں جو بات ہمارے منھ سے نکلتی ہے وہ قابل قدر ہے یہ ممکن ہے کہ ہماری سو باتوں میں سے ننانوے باتیں بیکار ہو جائیں مگر ایک تو کبھی نہ کبھی ضرور کارگر ہوگی۔ اس مایوسی کی حالت میں ہم کب تک رہ سکتے ہیں۔ ملک میں تعلیم ایسی ہونی چاہئیے کہ

ہر شخص بآسانی اِس سے مستفید ہوسکے۔ ہماری تجویز اس وقت کامیاب نہ ہو نہ سہی لیکن آیندہ چلکر یہ ضرور بارآور ہوگی۔ اگر ہمارا ملک اِس سے واقف ہو تا کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور حکومت ہماری توقعات کو پورا کرنے پر اپنی آمادگی ظاہر کرتی تو ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اسکی ضرورت ہی نہ پیش آتی۔ اب بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم مایوس ہوں۔

آپ کو یقین کرلینا چاہیئے کہ جلد یا بدیر آج نہیں تو کل ہمارا ملک دولت علم سے متموّل ہوکر عوام کو بھی دولتمند بنا دیگا۔ ہم کبتک چہ میگوئیاں کرتے رہینگے اپنے اور دوسروں کے متعلق نری باتوں سے کام نہیں چل سکتا تعلیم کو عام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرنا پڑے گی۔ موسم خزاں جاچکا اور اب آمد بہار ہے۔ میں اپنے سود مند اور امید افزا اسکیم کی اہمیت ہر طرح ثابت کرنے کے لئے تیار ہوں اگر آپکے پاس اسکے خلاف کچھ دلائل ہوں تو بسم اللہ پیش کیجیے۔

مرزا یحییٰ نے ایسے تحریصی و ترغیبی طریقوں سے کمیٹی میں نئی روح پھونکدی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے اپنے ذاتی مصارف سے لڑکوں کے لئے مختلف مقامات پر یہ چار مدرسے قائم کردیے۔ (۱) مظفریہ۔ (۲) علمیہ۔ (۳) افتتاحیہ (۴) رشدیہ۔

مدارس تو کھولدیے گئے لیکن اُن کے لئے ملک میں اچھے اساتذہ کا ملنا

دشوار تھا۔ مرزا یحییٰ اور اُن کے معاصرین نے چند ہونہار اور ذکی الطبع اساتذہ کا انتخاب کیا۔ چونکہ جدید نصاب تعلیم کے مطابق کتابیں موجود نہ تھیں۔ اس لئے انھوں نے طالب علموں کی دلچسپی کے مدنظر مختلف مضامین پر تدریجی ارتقا کے لحاظ سے نصاب کی کتابیں تیار کر کے پہلے اساتذہ کو خود پڑھائیں اور پھر اساتذہ یہی کورس مدارس میں لڑکوں کو پڑھانے لگے۔

دو سال کے بعد ایسا ہی ایک اور مدرسہ لڑکیوں کیلئے کھولنا چاہا لیکن اس بارے میں انھیں مایوسی ہوئی اس دفعہ ان کی تاب مقاومت سے ملاؤں کی مخالفت کا پلّہ بہت بھاری تھا۔ حسن اتفاق سے سیّد محمّد طباطبائی جو مسئلہ تعلیم میں بڑے وسیع النظر اور روشن خیال بزرگ تھے ان کی مدد کے لئے آمادہ ہوگئے اور ملاؤں کو ہموار کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ گو وہ انھیں ہموار نہ کرسکے مگر مرزا یحییٰ نے مدرسہ کھول ہی دیا اور اُن کی بڑی صاحبزادی قمر خانم اس مدرسہ کی صدر معلمہ ہوئیں حالانکہ ملاؤں نے بہت شور مچایا لیکن طباطبائی صاحب کے مقابلہ کی اُن میں ہمّت نہ تھی اس لئے کہ وہ اپنے علم و فضل زہد و تقویٰ کی وجہ سے عوام میں بڑی وقعت رکھتے تھے۔

خلاف امید ان مدارس میں طلبہ کی کافی تعداد ہو جانے سے کمیٹی کی اور ہمّت بڑھی ایک ایسا صنعتی مدرسہ بھی کھولدیا جس کے دارالاقامتہ میں ساٹھ لڑکوں کے مفت قیام و طعام کا انتظام تھا اب اس سلسلے کے لئے

ایسی مخیر ہستی کی سخت ضرورت محسوس ہوئی جس کا دست کرم اِسکے برقرار رکھنے اور ترقی دینے میں ممد ومعاون ہو۔ ایک متموّل ایرانی پرنس ارفع نے اِس مدرسہ کا بارمصارف اپنے ذمہ لیکر اِس مشکل کو بھی حل کر دیا۔ پہلے پہل یہ مدرسہ ایک کرائے کے مکان میں کھولا گیا تھا لیکن ایک ہی سال میں پرنس ارفع کے ایک دوست نے جو بڑے ہمدرد قوم تھے۔ مدرسے اور کمیٹی دونوں کے لئے اپنی دو وسیع عمارتیں عنایت فرمائیں۔ اور پرنس ارفع نے مستقل تعمیر مدرسہ کیلئے ایک قطعۂ زمین خریدا جس پر اس درسگاہ کی ایک پائدار عمارت بن کر تیار ہوگئی۔

پرنس ارفع کے تخلص پر مدرسہ کا نام ”دانش“ رکھا گیا تھوڑے ہی عرصہ میں اس درسگاہ نے ایسی ترقی کی کہ متعلمین کی تعداد تین سو تک پہنچ گئی۔ پندرہ برس تک پرنس تنہا اِس مدرسہ کے کفیل رہے۔ آخر میں وزارت تعلیمات کے تفویض کر دیا گیا۔ قدیم اداروں میں اپنی نوعیت کا یہی ایک ادارہ ہے جو ابتک بہت اچھی حالت میں ہے۔

اِس مدرسہ کے بانی پرنس ارفع ایران کے قدیم دولتمند طبقے کی یادگار ہیں اور مدبّرین ایران میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے ترقی تعلیم میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی اور اِس میدان میں بڑی دوڑ دھوپ کی جو لائق ستائش اور قابل آفرین ہے۔ یہ نہ کوئی شہزادے ہیں اور نہ کسی خانوادۂ شاہی سے تعلق رکھتے ہیں تو پھر یہ پرنس کیسے؟ ان کے پرنس بننے کا پرلطف واقعہ سننے کا ہے۔

طبقۂ تجار کے ایک معزز خاندان سے انھیں انتساب حاصل ہے۔ ان کے والد بڑے دولتمند تھے لیکن آخری عمر میں سب کچھ کھو کے مفلس ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے میراث میں تو کچھ نہ پایا البتہ جوہر شرافت ونجابت اور اوصاف پسندیدہ کا پورا سرمایہ ورثے میں ان کے ہاتھ آیا۔ معیشت کی دنیا میں ایک معمولی ملازم کی حیثیت سے انھوں نے ابتدا کی۔ لیکن پندرہ سال کے عرصہ میں اپنی لیاقت و کارکردگی کی بدولت دولتِ ایران کی طرف سے سفارت کی معزز خدمت پر مامور ہو کر روس بھیجے گئے۔

مظفرالدین شاہ قاچار کے ابتدائی دورِ حکومت میں اٹلی اور ایران میں ایک سیاسی کشمکش رونما ہوئی، شاہ نے اپنے تمام سفرا کو طلب کر کے ایک جلسہ منعقد کیا اور حکم دیا کہ اس گتھی کے سلجھانے کے لئے کوئی کارگر تدبیر اختیار کی جائے۔ آغا ارفع نے اس معاملہ کا تصفیہ تنہا اپنے ذمے لے کر والی سوئڈن کی مدد سے شاہ کے حسب دلخواہ اس معاملہ کو طے کرا دیا۔ جبھی سے یہ التفات شاہی کے مرکز بن گئے شاہ نے جوشِ مسرت و انبساط میں انھیں پرنس کے خطاب سے سرفراز کر کے اس خطاب کے شایانِ شان جملہ مراعات اور عطیات بھی عطا کر دئے۔ اُس زمانے سے اس وقت تک ایران کیا دنیا بھر میں وہ پرنس ارفع ہی کے نام سے معروف و مشہور ہیں۔

اگرچہ ملک کے خطاب یافتہ طبقہ کے سارے خطابات عہد پہلوی نے چھین لئے لیکن ایک یہی ستودہ صفات ہستی بدستور اپنے قدیم خطاب کے ساتھ مخاطب کی جاتی ہے

اب پرنس کا سن چھیانوے برس کا ہے اور عموماً اُن کی کبرسنی اور لیاقت کی قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ اِس بڑھاپے کے باوجود وہ قوی الجثّہ چست و تندرست نظر آتے ہیں۔ موصوف نے اپنی زندگی کا ایک نیا نظام العمل ترتیب دیا ہے۔ جس پر کاربند رہنے سے ایک سو پچیس برس تک زندہ رہنے کی انھیں توقّع ہے۔

تقریباً دس برس ہوئے کہ امریکن مشن نے اُن سے درخواست کی کہ وہ رقبۂ اراضی جو اسکول کے متصل آپ کی مملوکہ جائداد ہے وہ طالبات کے تعمیر دارالاقامہ کیلئے یا بصورت عطیہ مرحمت ہو اور یا بہ قیمت فروخت کردیا جائے۔ یہ جائداد جو اِس وقت تخمیناً تین لاکھ روپے سے کم کی نہیں پرنس نے امریکن مشن کے حسب خواہش برائے نام قیمت پر فروخت کر ڈالی۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی چنانچہ اِس ادارہ کی طالباۃ اب تک ہفتے میں ایک دفعہ بطور شکرگزاری اُن کی صحت و توانائی، خوشحالی و فارغ البالی کے لئے دعا مانگتی ہیں۔

پرنس ایک بلند پایہ ادیب، معاشیات، سیاسیات اور فلسفۂ جدید پر متعدد کتابوں کے مؤلف و مصنّف ہیں دو سو اشعار کی شایع شدہ ان کی ایک مثنوی جو ”طول عمر“ کے نام سے مشہور اور بہترین تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ ایران کے موجودہ مستند ادیبوں کی کثرت آرا سے وہ بجائے خود ایک ضخیم کتاب ہوگئی ہے

ایرانی فن ادب میں اپنی نوعیت کی یہ ایک ہی کتاب ہے جس کی شاعت

تمام مستشرقین میں ہونی چاہیئے۔ علاوہ اِسکے ادبی قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی اسکا مضمون ایسا ہے جس سے ساری دنیا دلچسپی رکھتی ہے۔ اِس مفروضہ کے ساتھ یہ مضمون شروع ہوتا ہے کہ جانور وغیرہ ادنیٰ مخلوق کی عمر طبعی اُس مُدّت کی پانچ گُنی ہوتی ہے جو اُن کی نشو ونما کی تکمیل کے لئے درکار ہے لہذا انسان بھی جو حیوان ناطق ہے اِسی اصول کا پابند ہے۔ مثلاً ایک گھوڑا پانچ برس میں جوان ہوتا ہے اور اس کی عمر طبعی ۲۵ سال معین کی گئی ہے یعنی جوانی تک پہنچنے کی پانچ گنی مُدّت۔ اِس طرح کی تمثیلوں کے بعد مصنف کتاب نے یہ نتیجہ نکالا کہ جس طرح انسان ۲۵ برس میں پوری جوانی کو پہونچتا ہے اِس حساب سے اُس کی عمر ایک سو پچیس برس ہونی چاہیئے بشرطیکہ وہ ضروری احتیاط کے ساتھ زندگی بسر کرے۔

سب سے پہلے بڑے بوڑھوں کے اِس خیال کو یک لخت دل سے نکال ڈالا جائے کہ انسان کی عمر طبعی ساٹھ سال ہوتی ہے اسے پورا یقین رکھنا چاہیئے کہ انسان کی عمر طبعی ایک سو پچیس ۱۲۵ برس سے کسی طرح کم نہیں ہوسکتی۔ قوت ارادی کو برابر تقویت دینا اِس کے لئے لازمی ہے۔ پینتالیس برس کی عمر میں بالوں کی سفیدی سے ڈرنا نہ چاہیئے اِس لئے کہ یہ جوانی کی علامت ہے نہ کہ بڑھاپے کی۔ دوسری بات یہ کہ جسم کی اندرونی و بیرونی حالت کو صاف و پاکیزہ رکھنے کا لحاظ رکھے تازہ ہوا کھائے۔ اور ورزش کرے۔ اس کی خاص غذا گیہوں کی

روٹی۔ نمک۔ دودھ۔ دہی اور انڈے ہونے چاہئیں۔ تیسرے ہر چیز میں اعتدال سے کام لے، خاصکر کھانا، پینا، اور مباشرت میں احتیاط لازمی ہے۔ چوتھے ایسا سلیم الطبع رہنا ضروری ہے کہ کسی حال میں بھی کبھی برہمی پاس نہ پھٹکنے پائے

ان بزرگوار سے مجھے ذاتی تعارف کا شرف حاصل ہوا اور میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ جب کبھی چند منٹ کیلئے بھی اِن سے گفتگو کا موقع ملا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں دس برس اور جوان ہوگیا ہوں۔ ایک دفعہ انھیں کی قیامگاہ پر جو ایک طرح کا ادبی کلب ہے۔ کسی دوست کے ساتھ اثنائے بحث میں مجھے غصہ آگیا۔ اِس میں شک نہیں کہ میری یہ حرکت اپنے میزبان کے یہاں نہایت نازیبا تھی۔ لیکن اس چھیانوے برس کے عجیب وغریب نوجوان نے نرمی و آشتی سے جب یہ کہا کہ شاید آپ نے میری کتاب طول عمر نہیں پڑھی۔ تو یہ سنتے ہی میں اپنی اصلی حالت میں آگیا اور جن صاحب سے مباحثہ کر رہا تھا، اب پرخلوص باتیں کرنے لگا۔ اِن بزرگ نے کہا کہ آپ یقین کیجئے کہ اپنی ساری عمر میں آج تک میں کبھی خفا نہیں ہوا اور یہی وجہ ہے کہ اِس چھیانوے سال کی عمر میں بھی جوان نظر آتا ہوں۔

حاصل یہ کہ اِس بزرگ کی عجیب وغریب ہستی لائق دید ہے۔ میں نے اپنی عمر میں کبھی کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا۔ فرانس میں اِن کی معقول جائداد ہے۔

اور زیادہ تر وہ وہیں رہتے ہیں۔ سال میں صرف ایک دفعہ اپنی اولاد سے ملنے اور اہل ادب کو معاشرتی مضامین پر کتابیں لکھنے کی ترغیب دینے ایران بھی چلے آتے ہیں۔ ہر سال بعض نہایت دلچسپ کتابیں اپنے پاس سے چھپوا کر مُلک میں مفت تقسیم کرنا اُن کا معمول ہے۔ سال گزشتہ آزادی نسواں پر جدید ادبی مضامین کی دو دو سو صفحوں کی کتابیں تقریباً دس ہزار چھپوا کر مُفت بٹوا دیں۔

ابھی حال ہی میں طہران سے اُن کی ایک مختصر سوانحعمری شایع ہوئی ہے اس میں موصوف کے سرسری حالاتِ حیات کے ساتھ اُن کی بعض حالیہ نظموں پر ملک کے نقّاد ادیبوں کی ناقدانہ رائیں بھی درج ہیں۔ اُن کے بعض قدر دان احباب نے اِس کتاب کو مختصر خیال کر کے پانچ سو صفحہ کی ایک اور کتاب بطور ضمیمہ شایع کی۔ ایران سے میری روانگی کے وقت یہ کتاب زیرِ طبع تھی۔

اَب پھر ایران کے جدید طرز تعلیم کی طرف آئیے امین الدولہ کمیٹی کے طہران میں قائم کئے ہوئے پانچ مدرسے جن میں صرف ایک لڑکیوں کا اور چار لڑکوں کے تھے یہ سب بعض اراکین کمیٹی کی توقع کے بالکل خلاف نہایت کامیاب ثابت ہوئے۔ یہ کامیابی معاشرتی اصلاحات کے کارکنوں کے لئے جنکی اب ملک میں کمی نہ تھی نہایت حوصلہ افزا ہوئی۔ چنانچہ اب ملک ایران کے

تمام بڑے بڑے شہروں میں اس طرح کی منظّم کمیٹیاں بن گئیں۔ اور باوجود اِسکے کہ امداد حکومت والتفات عوام اِن دونوں میں سے کسی نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا۔ چند ہی سال کی مدت میں انھیں کمیٹیوں نے سارے ملک میں مدارس کا ایک جال پھیلا دیا۔

کمیٹیوں کے ممبروں کو ایک اور بڑی دشواری یہ پیش آئی کہ مدارس کیلئے اساتذہ نہیں ملتے تھے چنانچہ انھوں نے اساتذہ کے لئے مدارس شبینہ اور طلبہ کیلئے روزینہ مدارس قائم کرکے اِس کمی کی تلافی کردی۔ مجھے یہ معلوم کرکے بڑا تعجب ہوا کہ باوجود اِن تمام غیر معمولی دشواریوں کے ان کارکنوں نے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۵ء تک پندرہ سال کے عرصہ میں محض اپنی ذاتی جد و جہد سے ملک میں چھ سو بارہ مدارس کھول دیئے۔ لیکن یہ مدارس کم و بیش ابتدائی حیثیت رکھتے تھے۔ اور مدارس وسطانیہ کا تو کہیں پتہ ہی نہ تھا۔ امریکن مشن اسکول تھا۔ لیکن وہ غیر ملک سے تعلق رکھتا تھا۔ ابھی تک ملک میں بہت سی باتوں کی ضرورت تھی۔ ایران کا محکمۂ تعلیمات اور محکموں کی طرح ازسرِ نو محتاجِ اصلاح و تنظیم تھا۔

۱۹۲۵ء میں جب رضا شاہ تخت نشین ہوئے تو محکمۂ تعلیمات کی ازسرِ نو جدید طرز پر تنظیم کی گئی۔ ایک وزیر تعلیم مقرر ہوا جسے بہت کچھ اختیارات دیے گئے۔ گویا اپنی نوعیت کا یہ پہلا تقرر تھا۔

نصابِ تعلیم معیّن کرکے ایک کمیٹی قدیم نصابِ تعلیم میں ضروری ترمیمات پیش کرنے کیلئے مقرر کی گئی۔ تمام مدارس کا خود اختیاری اصول پر آغاز ہوا جسنے ابتدائی تعلیم میں ایسی دلچسپی پیدا کردی کہ پانچ سال سے بارہ برس کی عمر تک کے لڑکے ان میں شریک ہونے کے متمنی نظر آتے تھے۔ روز بروز ان مدرسوں کی جانب ملک کا رجحان اتنا بڑھا کہ چھ سو بارہ (۶۱۲) مدارس جو اس وقت ملک میں موجود تھے اُن کے علاوہ اور صدہا مدرسے محکمہ تعلیمات کی طرف سے ہر سال کھلنے لگے یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء میں ابتدائی مدارس کی تعداد پانچہزار تین سو انتالیس (۵۳۳۹) تک پہونچ گئی۔ محکمہ تعلیمات کی سال گذشتہ کی رپورٹ کا مندرجہ ذیل اقتباس ناظرین پر یہ امر واضح کردے گا کہ اس محکمہ نے اشاعت تعلیم کے معاملہ میں کیا کیا:۔

"وزارت معارف کی حالیہ کامیابیاں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۷ء تک

(۱) دارالسلطنت کے لئے جدید تجاویز۔ ابتدائی مدارس میں اڑتالیس نئی جماعتیں بڑھائی گئیں۔ گیارہ جدید ابتدائی مدرسہ کھولے گئے۔ نئے مڈل اسکول کی جماعتوں میں نو (۹) کا اضافہ ہوا۔ ایک ٹریننگ اسکول قائم کیا گیا اور پانچ موسیقی کی جماعتیں۔

(۲) صوبہ جات میں جدید ادارے! ابتدائی مدارس میں ۲۷۰ کلاسوں کا اضافہ، کنڈرگارٹن ایک سو اٹھارہ (۱۱۸)، پرائمری اسکول، نئے مڈل اور

فوقانیہ ۳۴، جونیر نارمل اسکول ۵ نرسنگ اسکول ۲ لبراٹری ۸

کتب خانہ ۲

(۳) سن رسیدہ متعلمین کے لئے طہران میں ۹۱ جماعتیں اور صوبہ جات

میں ۶۵۹

(۴) سارے ملک میں ابتدائی مدارس

پرائمری اسکول ۷۶۹ گرلز اسکول ۱۴۲ لڑکوں کے مڈل اسکول ۴۶

لڑکیوں کے ۱۸

(۵) سنہ ۱۹۳۶ء میں متعلمین مدارس کی تعداد :۔

ابتدائی متعلمین ۸۵۲۱۵

لڑکیاں ۳۲۳۲۴

مڈل اسکول متعلمین ۶۷۷۸

لڑکیاں " ۱۰۰۱

محکمہ تعلیمات کی ان غیر معمولی کوششوں پر بیرونی اداروں کی نمایاں ترقیاں اور مستزاد ہیں۔ اسی سال امریکن مشن نے چار جدید اسکول لڑکوں اور چار مدرسے لڑکیوں کے لئے قائم کئے اسکولوں میں طلبار کی مجموعی تعداد ۵۶۸ اور مدرسوں میں طالبات کی کل تعداد ۳۷۸ ہے۔

۱۱۰،۰ سگا بو د رکا، اور دوسری امتیازی خصوصیات میں سے ایک ممتاز

خصوصیت یہ بھی ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کا لباس اپنی جنسیت کے لحاظ سے بالکل یکساں ہوتا ہے۔ یہ مدارس غربا یا متوسط طبقے ہی کے لئے مخصوص نہیں بلکہ خانوادۂ شاہی کے نونہالوں نے بھی عام طلبا کے دوش بدوش یہاں تعلیم پائی، دورانِ تعلیم میں بغیر امتیاز قواعد درس گاہ کی پوری پابندی، عام طالب علموں اور ان کے یونیفارموں کی یکسانی وغیرہ نے اصول مساوات کی ایک سبق آموز مثال قائم کردی ہے۔

محکمہ معارف کی سرگرمیوں نے اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی کافی سہولتیں پیدا کردی ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں سے ایک شہر بھی ہائی اسکول سے خالی نہیں اگرچہ ان مدارس کے ساتھ دارالاقامہ نہیں لیکن اساتذہ مدارس جو عموماً جذبۂ فلاح قوم کے تحت کام کرنے کے خوگر ہیں۔ وہ قابل رعایت و مستحق بیرونی متعلمین کے قیام وطعام کے لئے خانگی طور پر بندوبست کردیتے ہیں۔ تقریباً چھ برس ہوئے کہ طہران میں سائنس، طب اور ادبی تعلیم کے واسطے چھ کالج قائم کئے گئے اور اُس وقت تک کسی خانگی یا سرکاری یونیورسٹی کا نشان تک نہ تھا۔

سنہ ۱۹۳۴ء میں پائے تخت طہران میں طہران یونیورسٹی کے نام سے ایک باضابطہ یونیورسٹی قائم ہوئی اور اُس میں سائنس، طب اور قوانین و اصول تعلیم کے علاوہ بعض السنہ مغربی کی تعلیم دینے کے لئے باہر سے متعدد ماہرین علوم کی خدمات مستعار طور پر حاصل کی گئیں۔

۱۱ر مارچ ۱۹۲۵ء کو عالم وجود میں آنے والی یہ یونیورسٹی مصر کی سرکاری یونیورسٹی کے بالکل مماثل ہے۔ وزیر تعلیمات اس کے چانسلر اور ان کے ایک معتمد جنھیں کچھ زیادہ اختیارات دیے گئے تھے اس کے ریکٹر ہیں۔ یہ یونیورسٹی چھ (۶) شعبوں میں منقسم ہے۔ (۱) آرٹ (۲) طب (۳) سائنس (۴) قانون اور اقتصادیات (۵) انجینیرنگ (۶) دینیات۔ ہر شعبہ بجائے خود ایک مکمل ادارہ ہے جس میں صدر کے علاوہ چھ رکن کارکن ہیں اور ان ارکان کی نامزدگی وانتخاب وہیں کے پروفیسروں میں سے وزیر تعلیمات کی رائے پر منحصر ہے۔

ان چھ اداروں کے ڈینس اور وزارت تعلیمات کے منتخب کئے ہوئے چھ مزید رکن انھیں سے کونسل آف ایجوکیشن یا سینٹ کی تشکیل ہوتی ہے جو تمام تعلیمی معاملات کی جانچ پرتال کا پورا اقتدار رکھتی ہے۔

اس اکیڈیمک کونسل کے جلسوں کا انعقاد معتمد کی صوابدید پر ہے جو وزارت اور کونسل کے درمیان ایک واسطہ اور وسیلہ ہے۔ ان اداروں کے ضابطے قانون کے تحت منضبط کئے جاتے ہیں اور اُن میں کسی قسم کا تغیر پارلیمنٹ کی بے اجازت نہیں ہوسکتا۔

یونیورسٹی کی سرکاری زبان فارسی ہے لیکن اعلیٰ مضامین جیسے سائنس، طب وغیرہ پر لکچر بیرونی ماہرین علم وفن۔ جرمن۔ فرنچ یا انگریزی زبان میں دیتے ہیں۔ یونیورسٹی کے طلبار کو ان لکچروں کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی اس لئے کہ

مدارس وسطانیہ میں فرینچ۔ جرمنی یا انگریزی زبان میں تعلیم لازمی ہے۔ دوسری زبانوں کی مشہور کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرانے کی غیر معمولی کوشش کیجارہی ہے پھر بھی ایک ایرانی طالب علم کے لئے السنہ مغربی میں سے کسی نہ کسی زبان کا سیکھنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ سائنس اور طب میں آئے دن کی نت نئی ترقی ان کی چشم معلومات سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔

دنیا بھر کی یونیورسٹیوں سے یہ یونیورسٹی اپنی اس عجیب خصوصیت میں ممتاز درجہ رکھتی ہے کہ اصول انتخاب کا اس میں نام ونشان تک نہیں۔ یونیورسٹی کے ارکین سب سرکاری ملازمین ہوتے ہیں اور انھیں وزیرتعلیمات کی ہاں میں ہاں ملانا پڑتا ہے، اس لئے نہیں کہ وہ دوبارہ نامزد ہوں بلکہ اور دوسرے معاملات کی وجہ سے یہ روش اختیار کی جاتی ہے اور یہ ادارہ محض وزیر کے اشارہ چشم وابرو پر چلتا ہے۔ چنانچہ۔کونسل کی کارروائیوں میں سے کسی کارروائی میں وہ آزادانہ رائے نہیں دیسکتے۔ یہانتک کہ معمولی معاملات میں بھی انھیں وزیرتعلیم کا منشار دریافت کرنے کی ضرورت رہتی ہے تاکہ اُس کے موافق کسی خاص معاملہ میں وہ اپنی رائے کونسل کے روبروظاہر کریں۔

بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے مگر عملاً ایسا نہیں۔ اس بارے میں کونسل کے بعض ممبروں سے گفتگو ہوئی اور میں نے ان سے صاف طور پر کہا کہ آپ کی یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن حقیقتاً جسے کانسٹی ٹیوشن کہنا چاہیئے وہ نہیں ہے، اس میں صرف ایک

ہی شخص کارفرما نظر آتا ہے۔ انھوں نے تسلیم کرکے جواب دیا کہ بیشک آپ کا خیال درست ہے لیکن یہ بات یاد رکھئے کہ ہم سب قوم پرستوں کا مطمح نظر ایک ہی ہے۔ اگر ہمیں کسی امر میں وزیر معارف سے اختلاف ہوتا ہے تو ہم اس کا تصفیہ آپس ہی میں کر لیتے ہیں ہم اپنی یونیورسٹی کو ایک منتخبہ جماعت بنانا چاہتے ہیں مگر ابھی یونیورسٹی کے قیام کو صرف دو برس ہوئے ہیں ایکدم سے اُسے ایک منتخبہ مجسمہ نہیں بنایا جاسکتا۔ ہاں جب آیندہ اہل ملک میں اس کا قوی احساس پیدا ہوگا تو یقیناً یہ ایک منتخبہ جماعت کی تعریف میں آجائے گی۔ ہمارا محکمہ صفائی بھی اسی اصول پر چل رہا ہے۔

صدر بلدیہ حکومت کا تنخواہ یاب ملازم اور نصف سے زیادہ ممبر حکومت کے نامزد کردہ ہوتے ہیں لیکن ان سب باتوں پر بھی ہمارے یہاں کے محکمہ جات صفائی اچھے کیے ہندوستان کے بعض صفائی کے محکموں سے نوعیت کار میں بہتر ہیں۔ ہم سب کے سب ایک ہی قوم ہیں اور ایک ہی مقصد رکھتے ہیں۔

جو کچھ ایران میں دیکھا اس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ موصوف نے مجھ سے جو کچھ بھی کہا وہ بڑی حد تک درست تھا۔ وزیر معارف ادارہ کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دیتے موجودہ وزیر معارف آغا حکمت نہایت قابل اور روشن خیال شخص ہیں۔ یہ امریکن کالج طہران کے تعلیم یافتہ اور اپنے پروفیسروں کے بہترین اوصاف و خصائل کے حامل ہیں جو اپنے زیر دستوں کیساتھ دوستانہ مراسم رکھتے ہیں۔

ے دن میں ڈاکٹر صدیق سے ملنے گیا جو ادارۂ آرٹ کے ڈین ہیں۔ ایک

ایرانی خاتون وزیر معارف آغا حکمت کی ہمشیر کا مجھ سے تعارف کرایا گیا۔ یہ شادی شدہ ۳۵ برس کی خاتون آرٹ کالج میں داخل ہونا چاہتی تھیں لیکن ان کے پاس سکنڈری اسکول کی سند نہ تھی، موصوفہ نے کہا "میں نے خانگی طور پر تعلیم پائی ہے اور میرے پاس کوئی سارٹفکیٹ اور سند نہیں۔ لیکن سکنڈری اسکول کے طلبا سے میرے معلومات بہت زیادہ ہیں"۔ ڈاکٹر صدیق نے جواب دیا کہ نہایت افسوس ہے کہ بغیر سکنڈری اسکول کی سند کے آرٹ کالج کے قواعد کی پابندی کسی کو اجازت شرکت و داخلہ نہیں دے سکتی۔ ہاں آپ کے برادر محترم کا تحریری حکم اس قید سے آپ کو مستثنیٰ کرسکتا ہے۔ یہ سنکر وہ کہنے لگیں کہ وہ آپ کے امور انتظامی میں دخل دینا نہیں چاہتے۔ انھوں نے مجھے صرف آپ سے ملنے کا مشورہ دیا ہے۔ کالج میں میرے داخلہ کی کوئی صورت اگر آپ نکال سکیں تو میں نہایت ممنون ہونگی"۔ ڈاکٹر صدیق نے کہا کہ میں صرف یہی کرسکتا ہوں کہ داخلے کی فیس لیکر آپ کو اپنے یہاں شریک کرلوں مگر اس صورت میں آپ فقط تعلیم حاصل کرسکیں گی۔ اور اختتام تعلیم پر اس کالج سے کوئی سند وغیرہ نہ مل سکے گی۔ انھوں نے کہا "میں سند۔ ڈپلوما کچھ نہیں چاہتی صرف اعلیٰ تعلیم سے مستفید ہونے کی آرزو ہے اور بس یہی چاہتی ہوں"۔ گفتگو ختم ہوئی اور وہ خاتون شکریہ ادا کرکے رخصت ہوئیں۔

اس واقعہ سے مجھے ایک اور واقعہ یاد آیا۔ دس سال ہوئے کہ ساٹھ برس کی ایک انگلش لیڈی لندن میں فارسی پڑھنے کیلئے فی لکچر ۲ پونڈ ادا کرتی تھیں۔ میں نے

پوچھا کہ ساٹھ سال کی عمر میں آپ کو فارسی پڑھنے کا دھیان کیسے آیا؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ "میں نے شاہ نامہ کا انگریزی ترجمہ پڑھا ہے۔ اس کے پڑھنے سے فارسی سیکھنے اور اصل کتاب سے اچھی طرح لطف اندوز ہونے کا شوق پیدا ہوا۔ میرا خیال تھا کہ محض علم کی خاطر سے تحصیل علم یورپین لیڈیوں کا ہی مخصوص حصّہ ہے۔ لیکن ایران میں ایسی خواتین کو دیکھ کر اپنے پہلے خیال میں مجھے ترمیم کرنا پڑی اور اس نظارے سے مجھے بیحد مسرت ہوئی۔

آغا حکمت کا ممتاز خاندان بہت وسیع اور تقریباً اس کے کل زن و مرد کو اعلیٰ تعلیم سے شرف بہرہ یابی حاصل ہے۔ اور اس گھرانے کے اوصاف حمیدہ کے لحاظ سے یہ کہنا بے محل نہیں کہ :۔

این خانہ تمام آفتاب است

تیئیسواں باب

طریقہ تعلیم

موجودہ طرزِ تعلیم چار جداگانہ مقاصد کا سنگم ہے۔ پہلے جاپانیوں کے تفاخرِ آبائی کے طریقہ کا قیام، دوسرے امریکہ کے نہج تعلیم کے موافق ملک کے مختلف النوع عناصر کی ایک مرکزی شکل میں ترتیب و تہذیب، تیسرے جمہوری قومیت اور محاسن اخلاقی میں فرانس کی پیروی و متابعت، چوتھے انگلستان کی یونیورسٹی کے شریفانہ طرزِ معاشرت کی تقلید۔ ایران کے نوخیزوں میں تفاخرِ آبائی کا قومی جذبہ پیدا کرنے کے لئے ہر ایک درجے کے دوران تعلیم میں قدیم ایرانی تاریخ کا درس اس طرح دیا جاتا ہے کہ بہ جگر اسلاف کے ولولہ خیز اور جوش آور کارنامے لوحِ دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔ فن آثار قدیمہ میں دلچسپی کا یہ حال ہے کہ ماہرین آثار قدیمہ کے نتائج اور تحقیقات کی رپورٹیں ہر سال طبع ہوتی رہتی ہیں اور عوام کو ان کی اہمیت سے

روشناس کرنے کے لئے اخباروں میں بھی انھیں شایع کیا جاتا ہے۔

شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر تاریخ مشرق ڈاکٹر آرسٹیڈ کے لکچر کا اقتباس یہاں درج کرنا غالباً دلچسپ ثابت ہوگا۔ ڈاکٹر موصوف کی تحقیق آثار قدیمہ اور نیز پرسی پولیس کے جدید انکشافات کے متعلق نہایت مستند تسلیم کیجاتی ہے:۔

ایران کے صنایع پر پروفیسر پوپ کی دلنشین تقریر گذشتہ شب آپ سماعت فرما چکے ہیں۔ مجھے اس وقت جو کچھ عرض کرنا ہے وہ نسبتاً آسان اور مختصر ہے۔ میں کیوں ایران آیا؟ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ایران پر میں ایک اور کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔ افسوس ہے کہ اب تک مشرق قریب کی قدیم تاریخ کا اہم حصہ اہل یورپ کی نظر سے نہیں گذرا۔

میرا مطلب اس زمانے کی تاریخ سے ہے جو سائرس اعظم کے وقت سے شروع ہوکر محمدؐ پر ختم ہوتی ہے۔ یعنی تاریخ پیشدادی کیانی، اشکانی، ساسانی یہ بارہ صدیوں کا زمانہ تاریخ عالم میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسے یونان یا روم کی تاریخوں میں مجملاً ذکر کرنا مناسب نہیں۔ ربع صدی سے کچھ زائد عرصہ ہوا کہ میں نے ان ممالک کی سیاحت میں معلوم کیا کہ مشرق سیاسی حیثیت سے مغرب کا محکوم ہے لیکن اپنے قدیم خیالات اور طرز زندگی میں بدستور

مشرقیت رکھتا ہے۔

مگراب صورت حال بدل کر سیاسی نقطۂ نظر سے آپ کا ملک خود مختار ہو چکا ہے اور صنعت وحرفت کے میدان میں آگے بڑھنے کے لئے مغربی اصول کی پیروی سے آپ کے مستقبل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اگر کوئی توجہ سے آپ کے حالات کا اس طرح مطالعہ کرے کہ دو ہزار برس پہلے کیا حالت تھی تو دکھائی دیگا کہ مشرق کبھی بالکل مغرب نہیں بن سکتا۔ مشرق حسب ضرورت مغرب کی اُن خوبیوں کو جو اس کے کارآمد ہو سکیں اختیار کر کے غیر مناسب چیزوں کو مسترد کر دیگا سوسا، اصطخر، دامغان اور رے کی کھدائیوں میں سے کچھ ظروف گلی ایسے ہاتھ آئے ہیں جو بابل اور مصر کی تاریخوں سے بھی پہلے کے معلوم ہوتے ہیں۔ ماہرین فن اس تجسس میں مصروف ہیں کہ زمانۂ قدیم میں وسط ایشیا کو بابل سے کیا تعلق تھا۔ لیکن ایران میں ابھی ہزارہا ایسے ٹیلے باقی ہیں جو زبان بے زبانی سے پکار رہے ہیں کہ ادھر آؤ اور جو کچھ ہم میں چھپا ہوا ہے اُسے نکال کر چشم عبرت سے دیکھو۔

اگر آذربائیجان میں اور کھدائی کی جائے تو قدیم زمانے کے واقعات کے متعلق مزید انکشافات کی قوی توقع ہے۔ ڈاکٹر

ہے۔ کرسٹی نے تبریز کے قریب ایک راکھ کا ڈھیر مجھے دکھایا۔ جسے وہاں کے دیہاتیوں نے کچھ کھودا تھا۔ اس کے اندر سے چند ایسے ظروف نکلے جو میری رائے میں پانچ ہزار سال سے کم کے نہ تھے۔ ان بڑے بڑے ٹیلوں کی کھدائی کون اپنے ذمہ لے گا جو ایسے وقت میں بن گئے جبکہ مکانات لکڑیوں کے ہوتے تھے اور اُن سے معلوم ہوگا کہ ایرانیوں کے آباواجداد کس قسم کے مکانوں میں رہتے تھے۔ جب تک ہمدان کی کھدائی نہ ہو میڈیز کے متعلق ہماری معلومات ناتمام رہینگی جو ایک زمانہ میں دنیا کی بڑی قوم تھی۔

پرسیپوس کے متعلق ہماری معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ ابھی حال میں وہاں (۲۹۰۰۰) انتیس ہزار تختیاں ایسی برآمد ہوئی ہیں جن سے ایرانِ قدیم کا طرزِ حکومت۔ تمدن اور معاشرت کا حال معلوم ہوگا اور غالباً یہ گذشتہ صدی کی سب سے بڑی تحقیق تصور کی جائیگی۔

جب یہ تختیاں پڑھ لی جائیں گی تو ایران کے متعلق غالباً ہماری رائے بالکل بدل جائیگی۔ ایران میں جتنی قومیں بھی متوطن رہیں اُن میں کسی کو مورخین کے ہاتھوں سے اتنا نقصان نہیں پہونچا جتنا کہ پارتھین کو ان کا تمدن بمقابلہ اُس تمدن کے بہت زیادہ بڑھا ہوا تھا جو عراق میں ظروف گلی کے ٹکڑوں اور سکوں کے برآمد ہونے سے ظاہر

ہوتا ہے۔ اس تمدن کی نشانیاں ایران میں ضرور ملنی چاہئیں۔ میری رائے میں اُن کا دارالحکومت۔ ہیکاٹومو پولس یا دامغان کے قریب ہوگا۔ ابتک ہمیں اسکا پتہ نہیں چلا ہے لیکن ہم کو نئی تحقیقات کا انتظام کرنا چاہیئے۔"

اس قسم کی تقریریں طلبا میں قومی جذبہ بیداری اور اپنے اسلاف کے درخشاں کارناموں کی ولولہ خیز یاد تازہ کردیتی ہیں۔ تمام اسکولوں اور کالجوں میں شاہنامہ کے درس پر بڑا زور دیا جاتا ہے، جو ادب ایران کی غیر فانی یادگار ہے۔ سال تعلیم کے اختتام پر اعیان دولت وارکین سلطنت کے سامنے اس بے نظیر رزمیہ نظم کے خاص خاص حصے ڈرامے کے طور پر اسٹیج پر دکھلائے جاتے ہیں۔ ایک اور ادبی کتاب تاریخ ایران جو تین جلدوں میں زمانۂ حال کی ایسی تصنیف ہے جسے ایرانِ قدیم کی تاریخ کہنا چاہیئے کل اسکولوں کے ادنی درجے سے لیکر ایم اے تک باب دار پڑھائی جاتی ہے حال کے ایرانی یورپ کے ماہرین آثار قدیمہ کے ان نتائج تحقیق سے مطمئن نہیں جو انھوں نے ایران میں کی ہے، انھیں اپنی کوششوں پر زیادہ اعتماد ہے چنانچہ ہر سال اس غرض کی تکمیل کے لئے بیسیوں ایرانی طلبا علم آثار قدیمہ کی تحصیل کے لئے بیرونی ممالک بھیجے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس جذبہ خودداری اور قیام تفاخر آبائی کے نتیجے میں "فرہنگستان ایران" کے نام سے ایک انجمن فارسی کو خالص بنانے کی غرض سے قائم کیگئی ہے۔ ملک کی زبان میں سے عربی الفاظ خارج کرکے ان کی جگہ پرانی فارسی

کے ذخیرہ سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے نئے نئے الفاظ استعمال کئے جا رہے ہیں۔

ایرانیوں کا یہ رجحان محض حب الوطنی پر مبنی ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اُسے لامذہبیت اور عربوں سے منافرت پر محمول کرتے ہیں۔ اس مسئلہ پر مجھ سے ایران کے بعض بڑے بڑے قابل ادیبوں اور صاحب الرائے افراد سے بحث ہوئی۔ ان سب نے بالاتفاق یہی کہا کہ ہمارے دل عربوں کے علم وفضل اور ان کے زبان کی وقعت و منزلت سے لبریز ہیں۔ فارسی الفاظ کو عربی لفظوں کی جگہ دینے سے اپنی قومی زبان کو خالص کرنا اور اُس کی شکوہ کو برقرار رکھنا ہی ہمارے موجودہ رجحان کا حقیقی مقصد ہے۔

جب ایران سے ہندوستان واپس آیا تو یہیں کے ایک مسلمان دوست مجھ سے کہنے لگے کہ ایرانیوں کی یہ نئی اُپج کیسی؟ عربی زبان جو سیکڑوں برس سے فارسی کیساتھ ساتھ چلی آ رہی ہے جس نے فارسی کی سلاست وفصاحت میں چار چاند لگا دیے۔ اس کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ ایرانی زبان میں شیر وشکر ہو کے اسکا جزو لاینفک بن گئے۔ ایسی زبان کو ٹھکرانا اور فرنچ، جرمنی، انگریزی، روسی الفاظ کی دن دونی رات چوگنی ترقی پر سکوت اختیار کرنا کس بنا پر؟ السنہ مغربی کے الفاظ جو دھڑتے سے فارسی میں گھستے چلے جا رہے ہیں کیا انھیں فارسی سمجھ لیا ہے اور جو یہ نہیں تو پھر بیچاری عربی ہی کا کیا قصور ہے۔ زبان کو خالص ہی بنانا ہے تو چن چن کر ان سب کو نکال باہر کرنا چاہیئے۔ پھر برہم ہو کر کہنے لگے کہ ایران اسکا کوئی معقول جواب نہیں دے سکتا۔ یہ طرز عمل سراسر اسلام سے انحراف کا نتیجہ ہے کوئی مسلمان یا بہی خواہِ اسلام اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔

یہ سچ ہے کہ انگریزی۔ فرانسیسی۔ روسی۔ سویڈس۔ الفاظ کی بڑی تعداد ایرانی زبان میں برقرار ہے۔ بظاہر یہ طریقہ خلاف انصاف معلوم ہوتا ہے کہ السنۂ مغربی کے الفاظ تو یوروپین لباس کی طرح بنظر استحسان دیکھے جائیں اور قدیم عربی الفاظ ایرانی قدیم لباس کی طرح قابل ترک قرار پائیں لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ ایرانی اس معاملہ میں بھی دوسرے معاملات کی طرح بڑے دور اندیش ہیں بادی النظر میں جو چیز بے ربط یا ناموافق معلوم ہوتی ہے حقیقتاً وہ ایسی نہیں۔

موجودہ ایرانی زبان میں جو یوروپین الفاظ داخل ہوگئے ہیں۔ وہ صرف ایرانی زبان ہی کے لئے نئے نہیں بلکہ خود یوروپین زبانوں کے لئے بھی وہ سب نئے ہیں حالیہ ایجادات اور نئی معلومات کا مفہوم ادا کرنے کے لئے جن اقوام نے اصطلاحیں اور الفاظ وضع کیئے وہ بہت کچھ قابل تعریف ہیں چنانچہ اہل ایران نے بھی انھیں الفاظ کو بجنسہ اپنی زبان میں لے لیا ایسے محل پر اپنی زبان میں نئے نئے الفاظ گھڑنا اور ان ایجادوں میں جنمیں انکا کوئی حصہ نہیں اپنی شہرت چاہنا انھیں کسی طرح پسند نہیں ہے۔

عربی کے متعلق ایرانیوں کا خیال ہے کہ علم وفضل میں قدیم ایرانی عربوں سے کہیں آگے تھے۔ مفتوح قوم نے مختلف طریقوں سے اپنے خداداد اوصاف دنیا پر ظاہر کردیے۔ عربوں نے ایرانیوں کو مذہب سکھایا لیکن ایرانیوں نے عربوں کو بہت سی ایسی باتیں بتائیں جن سے وہ نابلد تھے۔ یہانتک کہ عربی زبان کی صرف ونحو، لغات اور قرآن مجید کی بہترین تفسیریں ایرانیوں ہی کا نتیجۂ دست وقلم ہیں۔

فارسی میں عربی الفاظ کی بھرمار کا سبب ایرانی زبان کی بے مائگی و محتاجی نہیں بلکہ محض فاتحوں کی زبان ہونا ہی اس کی وجہ قوی اور سبب حقیقی ہے۔

عربوں کے فتوحات کے بعد تقریباً تین سو برس تک ایرانی اپنی زبان لکھنے اور بولنے سے محروم رہے۔ جب مرکزی خلافت کا شیرازہ منتشر ہونے لگا تو ایرانیوں کو اپنی قدیم زبان کے زندہ کرنیکا پھر خیال آیا۔ مدت دراز تک عربی میں تقریر و تحریر کی دیرینہ عادت نے انھیں فارسی سے ایسا بیگانہ بنا دیا تھا کہ اپنی مادری زبان میں اظہار مطلب تک نہیں کر سکتے تھے، اب فارسی کے دن پھرے اور یہ بولی جانے لگی مگر اس میں نصف یا تین چوتھائی الفاظ عربی شامل ہو چکے تھے، ایران کی سابقہ عظمت و برتری کی واپسی کے لئے ایرانیوں کے جوش و ولولے نے عربی الفاظ کو قابل حذف اور ان کی جگہ فارسی الفاظ استعمال کرنے کا پورا تصفیہ کر لیا۔

ایرانی ادیبوں میں سے ہر ایک کے نزدیک دارالشفا، وغیرہ جیسے عربی الفاظ کے مقابلے میں بیمارستان و تیمارستان ہی لائق تسلیم اور قابل استعمال الفاظ ہیں میری رائے میں وہ اپنی زبان کو خالص، سادہ، پُراثر اور السنۂ مغرب کے مطابق بنانا چاہتے ہیں، جیسے انگریز موٹے موٹے لاطینی اور گریک الفاظ کے بجائے سہل اور سادہ ساکسن زبان کے الفاظ استعمال کرنیکی انتہائی کوشش میں مصروف ہیں مثلاً یہ فقرہ "کہ کوئی شخص نادار مرا" اس فقرے کے مقابلے میں کہ "اس کی روح عالم غربت میں پرواز کر گئی" نہایت سادہ، شستہ اور فصیح ہے۔

حال کے یوروپین مصنفین میں سے ایک بھی قدیم طرزِ تحریر کا حامی نہیں اور اس سے رومن یا گریکس کی توہین و تحقیر مقصود نہیں ہے۔ ہمارے ہندوستان میں بھی موٹے موٹے عربی الفاظ کی اُردو زبان میں ٹھونس ٹھانس سے احتراز کرنے کا قوی رجحان پیدا ہو چلا ہے۔ جب اس میلان سے عربوں کی تحقیر یا اسلام پر کوئی حملہ مقصود نہیں تو اس باب میں بیچارے ایرانیوں کو کیوں ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے۔

---

۵۱ مسئلہ زبان کی گتھی لایق مصنف کے ناخن تحریر سے نہ سلجھ سکی۔ البتہ اس باب میں موصوف کے ہموطن کرمفرما کا طرزِ استدلال قوی ہے لیکن انھوں نے آخر میں ایک خالص ادبی بحث کو مذہبی رنگ دیکر ہندوستانی عام ذہنیت کی تقلید کا واضح ثبوت پیش کر دیا۔ اس بحث کو اس طرح جانچنا چاہیئے تھا کہ زبان کے خالص ہونے کے کیا معنے ہیں اور آگے بڑھنے والی کسی بولی کا خالص بنانا ممکن بھی ہے کہ نہیں۔ حیرت ہے کہ جو بات قابلِ نظر تھی وہی نظر انداز کر دی گئی۔

ایران کے اربابِ ادب اگر عربی کے نامانوس ثقیل اور بوجھل بول فارسی میں سے نکال دینا چاہتے ہیں تو یہ اقدام مستحسن ہی نہیں بلکہ نہایت ضروری اور لازمی ہے اور اگر السنۂ مغربی کی بھرمار برقرار رکھکر صرف عربی ہی کا استیصال مدنظر ہے تو یہ طرزِ عمل کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ بیرونی لفظوں کی ریل پیل کو قائم رکھنا اور فقط ایک ایسی زبان کے الفاظ کو (جو مدتوں کے میل جول سے گھل مل کر فارسی کا جزو بن چکے ہیں) باہر کر دینا اصولِ لسانیات کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ کیا صرف عربی الفاظ نکالڈالنے سے فارسی بمثل اور خالص ہو سکتی ہے۔

معمولی بات چیت اور محدود بول چال کے لئے تو زبان کو خالص بنانا ممکن ہے لیکن وسیع سے وسیع تمدن کے معاشی و اقتصادی حالات، علوم جدیدہ کی بہتات، نت نئے ایجادات و انکشافات طرح طرح کے تکلفات کے سیلاب کا ساتھ دینے والی زبان کبھی خالص نہیں بن سکتی۔ بڑے سے بڑے تمدن کو ساتھ لیکر بڑھنے والی بولی کا محض اپنے یہاں کی بضاعت الفاظ پر قناعت کرنا قطعاً محال ہے۔ ترقی پذیر زبان کا دوسری متمدن زبانوں سے ربط بڑھانا لازمی اور ان کے سرمایۂ الفاظ کو اپنے میں (بقیہ صفحۂ آئندہ)

اب پھر طرزِ تعلیم کی نوعیت ملاحظہ فرمائیے۔ اس بارے میں پوری کوشش صرف کی جاتی ہے کہ طلبہ یہ محسوس کرلیں کہ اوّلاً وہ ایرانی ہیں اور سب کچھ بعد میں۔ ارمنی۔ عیسائی۔ زردشتی اور مسلمان ایرانی ہونیکی حیثیت سے سب ایک ہیں۔ فرقہ بندی کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ عیسائیوں کے مشن اسکول بدستور جاری ہیں۔ البتہ کلاسوں

(بقیہ صفحہ گذشتہ) جذب کرلینا یقینی ہے۔ اس طریقے سے آگے بڑھنے والی زبان اوروں سے مل ملا کے کھچڑی ہونے اور بیچ میل مٹھائی بننے سے کبھی نہیں بچ سکتی۔

یورپ اپنی دقیقہ رسی کی بلندی سے نیچے نہیں اترا۔ مگر اس باب میں دیکھ لیجئے کہ وہ کھچڑی زبان ہی استعمال کر رہا ہے۔ جرمن، فرنچ، روسی، انگریزی وغیرہ میں سے کیا کسی ایسی زبان کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جو دوسری زبانوں کے اشتراک و آمیزش سے بالکل پاک ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسی ملنسار بولی جو حسب ضرورت دوسری زبانوں کے لفظوں کو اپنا بنا لے ترقی کی دوڑ میں وہی آگے نکل سکتی ہے اور اسی کا لباس علوم جدیدہ کے قامت پر ٹھیک آسکتا ہے اور وہ اکل کھری بولی جو اپنی ہی پونجی لئے الگ بیٹھی رہے۔ اُس کا آگے بڑھنا کیا۔ سب سے الگ تھلگ رہنا ہی مستقبل کی طرف سے اس کے لئے پیام مرگ ہے جیسے سنسکرت کا حشر ہوا۔

لسانیات کے ماہر جانتے ہیں کہ دو موقعوں کے سوا کسی وسیع زبان میں حک و اصلاح اور اضافہ الفاظ کے لئے کوئی تیسرا موقع ہی نہیں۔ جس طرح فصل پر پرندا پنے پرانے پر جھاڑتے ہیں۔ اسی طرح طائر زبان بھی اپنے پرانے کمزور پر جھاڑ کے نئے پر نکالتا ہے اور اس کے یہی گرے ہوئے پر گروہ شعرا میں متروکات کہلاتے ہیں۔ دوسرا اہم موقع وہ ہے جہاں علوم جدیدہ کا سلسلۂ تراجم مختلف زبانوں کے اہم مفہومات اور اسالیب بیان کی پیچیدگی سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اضافہ الفاظ پر مجبور کر دیتا ہے اور اسی اضافے کو ارباب نظر "اصلاحات" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ لسانی تبدل و تغیر کی اور کوئی جگہ نہیں۔

جب کوئی ترقی یافتہ زبان خالص ہو ہی نہیں سکتی تو پھر مدتوں کے ارتباط و اختلاط سے

(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

میں انجیل پڑھانے کے بجائے عیسائی طلبا کو گرجوں میں انجیل پڑھانے کی اجازت ہے
مگر عام طور پر اصول ملت عیسوی کی تعلیم کی ممانعت نہیں بشرطیکہ مقصد تعلیم طلبا کی عام اخلاق

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) شیر وشکر ہو کر وہ عربی الفاظ جو فارسی میں جذب ہو چکے ہیں۔ ان کی بیخ کنی کی کوشش کرنا اہل فارس کی یہ سخن پروری نہیں تو اور کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس طرح کی تخریبی سعی جذبۂ حب الوطنی کے تحت کی جارہی ہے۔ مگر اس سوال کا کیا جواب ہوگا کہ ایران سے کہیں بڑھکر اور متمدنہ مقامات کو اپنی وسیع ترپیچ میل اور غیر خالص زبانوں کے استعمال میں اس جذبے کا کیوں پاس و لحاظ نہیں۔ کیا جذبۂ حب الوطنی قدرت کی طرف سے ایرانیوں ہی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

لاطینی اور گریک الفاظ کے استیصال پر یورپین اگر ایسے ہی کمربستہ ہوتے جیسے عربی کی بیخکنی پر ایرانیوں کی مستعدی تین کتاب سے ظاہر ہوتی ہے تو مصنف کی طرف سے انگریزوں کی پیش کردہ مثال برمحل ہوسکتی تھی۔ لاطینی اور گریک یہ دونوں زبانیں انگریزی میں ایسے عنصر قوی کا درجہ رکھتی ہیں کہ کوئی ماہر انگریزی ان سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ انگریزی میں لاطینی اور گریک الفاظ کے شامل شدہ سرمایے میں سے غیر شستہ اور غیر فصیح الفاظ کے اخراج کی جانب انگریزوں کا التفات ایرانیوں کی نوعیت توجہ سے بہت مختلف ہے۔ ایک طرف لاطینی اور گریک الفاظ کی جانچ پرتال اور دوسری سمت پورے عربی لفظوں کا استیصال۔ دونوں جداگانہ راستے ہیں۔ کہاں لفظوں کا پرکھنا اور چھانٹنا اور کہاں سرے سے الفاظ کی بیخکنی پر آمادہ ہونا دونوں صورتوں میں کیا کافی تفاوت نہیں، بحث زبان کی یہ اختتامی عبارت بھی دیکھنے کی ہے۔

"ہمارے ہندوستان میں بھی موٹے موٹے عربی الفاظ کی اردو میں ٹھونس ٹھانس سے احتراز کرنے کا قوی رجحان پیدا ہو چلا ہے۔"

اگر یہی بات ہوتی تو پھر کہنے سننے کی کوئی جگہ ہی نہ تھی۔ اندھیر تو یہ ہو رہا ہے کہ تنہا عربی ہی نہیں بلکہ فارسی اور عربی دونوں کے شیر وشکر وہ الفاظ جو بڑے سے لیکر چھوٹے تک سب کے زباں زد ہو چکے ہیں اردو میں سے نکال کر ان کی جگہ سنسکرت کے غیر مانوس، بھولے بسرے، بھدے بیلے بول ٹھونسنے کی پوری کوشش کی جارہی ہے اور یہ محض اس لئے کہ مدتوں کی مٹی ہوئی ایک مذہبی مردہ زبان لگاتار دوڑ دھوپ کے منتر سے کسی طرح پھر جی اٹھے۔ تعجب ہے کہ قابل مصنف اپنے دیس کے اس جھگڑے کو بھی اچھی طرح نہ سمجھ سکے۔ بلگرامی

کی اصلاح ہو نہ کہ صرف عیسائی بنانا۔ مدارس میں ایک سالباس اس لئے لازمی قرار دیا گیا ہے کہ انھیں معلوم ہو کہ وہ سب کے سب ایک ہیں۔ اصول و تاریخ اسلام ابتدائی درجہ سے انتہائی درجہ تک اس طرح پڑھائی جاتی ہے کہ مسلمان طلبا بجائے کٹر سنی یا متعصب شیعہ ہونے کے وسیع النظر ایرانی مسلمان بنکر درسگاہوں سے نکلیں۔ غیر مسلم افراد کو اپنی اولاد ذکور و اناث کی مذہبی تعلیم کے لئے بطور خود استاد مقرر کرنے کی حکومت کی طرف سے اجازت ہے حاصل یہ کہ مذہبی تعلیم محض ایک ذریعہ معاد قرار دیگئی ہے۔ عموماً ہر مذہب کا احترام کیا جاتا ہے۔ مناظروں کی اجازت نہیں کسی کا مذہب بدلنے کے لئے قصداً کوشش نہیں کیجاتی۔ اس عام تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ کالجوں کے فارغ التحصیل طلبا زندگی کی کشمکش میں جب داخل ہوتے ہیں تو وہ ایک مسلم عیسائی یا زردشتی حیثیت سے نہیں بلکہ انکا مطمح نظر فقط یہی ہوتا ہے کہ وہ ایرانی ہیں اور اپنے ملک کی عظمت کو بڑھانا اُن کا فرض اولین ہے۔

اپنے ابتدائے قیام طہران میں ڈاکٹر عبدالرزاق حاذق نامی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جنھیں میں پکا مسلمان سمجھتا تھا۔ ایک مسلمان عنایت فرمانے مجھے ان سے ملایا اور انھوں نے اپنے اور بہت سے ایسے احباب سے میرا تعارف کرایا جن میں بعض مجتہدین بھی تھے اُن کے نام مسلمانوں سے ارتباط اور انداز گفتگو سے ہرگز یہ خیال نہ ہوتا تھا کہ وہ مسلم نہونگے۔ اختتام قیام پر البرز کالج کے ایک امریکن پروفیسر سے اُن کا عیسائی ہونا سُنکر مجھے سخت تعجب ہوا اور پورا الیقین نہ آیا یہانتک کہ اس کی تصدیق

کے لئے خود انھیں سے میر ہنے دریافت کیا کہ کیا حقیقتاً آپ عیسائی ہیں ؟

موصوف نے مسکراکر جواب دیا کہ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں عیسائی نہیں ہوں ؟" میں نے کہا "آپ کا اسم گرامی، آپ کا طرز گفتگو اور آپ کا مسلمانوں سے اتحاد و ارتباط۔" انھیں باتوں نے مجھے دھوکا دیا۔ وہ کہنے لگے کہ "یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ ہم سب کے سب اوّل ایرانی ہیں اُسکے بعد مسلمان یا غیر مسلمان۔ میرے اعزہ میں سے کچھ عیسائی کچھ مسلمان اور بعض لا مذہب ہیں۔ مگر اختلاف مذہب سے ہمارے باہمی تعلقات در روابط میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ہم رشتہ داروں کی طرح ملتے جلتے رہتے ہیں۔ میرا نام بھی ایرانی ہے اور مجھے اس پر فخر ہے۔ اس لئے میں اسے کیوں بدلوں ؟"

یہ سُنکر میں حیرت زدہ ہو گیا اور دھیان آیا کہ بھلا ہندوستان میں ایسی وسیع النظر کہاں دس برس ہوئے کہ لندن میں لارڈ ہیڈلے سے میں نے جسارت و بے باکی سے پوچھا تھا کہ "آپ کے مسلمان ہو جانے سے آپ کے تعلقات اہل و عیال میں کوئی فرق تو نہیں آیا ؟" انھوں نے متانت سے جواب دیا کہ "میری بیوی اور بچے گرجا جاتے وقت مجھے مسجد میں چھوڑ جاتے ہیں اور واپسی کے وقت ساتھ لے لیتے ہیں۔" اس سے پیشتر مجھے یہ خیال تھا کہ ایسی وسیع النظری صرف یورپ ہی کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن ایرانی ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ایشیا کے ملک ایران میں بھی ایسی وسیع النظری کی کمی نہیں ہے۔ یہ نظریہ کہ انسانی خیال آزاد ہے اور مقصد تعلیم صرف یہی ہے کہ خیالات انسانی کو وسعت و ترقی دیجائے۔ اپنے حقیقی معنوں میں

یہاں پورے طور پر نمایاں ہے۔

ہندوستان کی رفتارِ تمدن کے لحاظ سے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ہم لوگ زمانہ کے بہت پیچھے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید صدیاں گذرنے کے بعد کہیں ہندوستانیوں میں آزادی خیال وصلاحیت کار کا شعور پیدا ہو۔

ایک موقع پر میں اپنے ہندوستانی دوست ڈاکٹر رنجیت کو آغا شریعت سنگلاچی کی مجلسِ وعظ میں لے گیا۔ وعظ ختم ہونے پر میں نے آغائے شریعت سے تعارف کرایا کہ یہ میرے ہندوستانی ہندو دوست ہیں۔ وہ بہت تپاک سے ملے اور انھیں سگریٹ عنایت کر کے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ "آپ اِن کے ہندو ہونے پر کیوں زیادہ زور دیتے ہیں۔ ہم سب ایرین ہیں اور میں اپنے ایک ایرین بھائی سے ملکر بہت خوش ہوا۔ ان کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں۔ میرا مذہب تو محبت ہے۔ میں ہر شخص سے محبت ہی کرتا ہوں کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ وعظ و پند میں میرا خطاب صرف مسلمانوں ہی سے نہیں ہوتا میں اسلام کے وسیع اور اعلےٰ اصول پر بحث کرتا ہوں جو کل مذاہب کے مشترکہ اصول ہیں۔ قرآن سب کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے کیا آپ کو مولانا رومی کا یہ شعر یاد نہیں کہ:۔

من ز قرآں مغز را بر داشتم
استخواں پیشِ سگاں انداختم

میرے دوست ڈاکٹر رنجیت اس وسیع الخیال و پاک باطن مجتہد کی باتوں سے بیحد محظوظ ہو کر مجھ سے کہنے لگے کہ "مولانا! ہندوستان کے ملاؤں کو بھی ان کا ہمخیال و ہمنوا کیوں نہیں بناتے؟ میں نے کہا کہ "تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ ہندوستان میں آپ کے پنڈتوں پر بھی یہی الزام عائد ہوسکتا ہے جو ہمارے مولویوں ملاؤں پر۔"

جس طرح ڈاکٹر رنجیت کو مولانا کے غیر معمولی حسنِ اخلاق سے حیرت ہوئی اسی طرح میں بھی ان ہندوستانی تاجروں کی فراخدلی پر متعجب ہوا جو طہران میں تجارت کرتے ہیں۔ وہ عموماً سکھ ہیں اور موٹر کے سامان کا کاروبار کرتے ہیں۔ طہران کے دیرینہ قیام نے ان کے طبایع میں ایک مستقل تغیر پیدا کر دیا ہے۔ انھوں نے ایک ایسی رواداری کی راہ اختیار کی ہے جو ہندوستان میں نایاب ہے اور جس کی وجہ سے وہ وہاں کے لوگوں سے بالکل الگ ہو گئے ہیں۔ تقریباً ان سب نے میری دعوت کی اور بھائی کی طرح مجھ سے پیش آئے۔ بہت خاطر مدارات کی اور اپنے اہل و عیال سے بھی میرا تعارف کرایا۔ زمانۂ قیام طہران میں دن تو ایرانی احباب کے ساتھ گذارتا تھا اور راتیں اپنے ہندوستانی دوستوں کے ساتھ۔

ڈاکٹر رنجیت جو ایک پکے ہندوستانی ہیں ان کے ایرانی احباب کا دائرہ بہت وسیع ہے اور یہ گویا وہیں رہ پڑے ہیں۔ ایکدن کہنے لگے کہ دس برس تک قیام طہران کے بعد اب ہندوستان جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ یہاں کوئی بھی یہ نہیں پوچھتا کہ تم مسلمان ہو یا ہندو عیسائی ہو یا کچھ اور بخلاف ہندوستان کے

کہ وہاں ہر وقت یہی ذکر رہتا ہے کہ تم نہ صرف ہندو ہو بلکہ سکھ۔ افسوس ہے کہ ڈاکٹر رنجیت سنگھ جیسا وسیع الخیال شخص طہران ہی میں رہ پڑا کاش کہ یہ ہندوستان آکر اپنے خیالات سے اپنے ہموطنوں کی رہنمائی کرتا۔

طہران یونیورسٹی کے کالجوں اور مدارس میں اصول حکومت جمہوری کی تعلیم پر زور دینا بھی قابل لحاظ امر ہے۔

ہندوستان کی طرح ایران میں اونچے گھرانوں کی تعلیم و تربیت اولاد کا کوئی راجکمار یا ایچیسن کالج نہیں ہے۔ ملک کے کل نونہال مساوی حقوق اور مساوی مراعات کے مستحق متصور ہوتے ہیں۔ تعلیمی معاملات میں امرائے عظام و عوام حکومت کی نظر میں یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ تمام خطابات کی یکقلم موقوفی کے بعد حکومت کا ہر ایک معزز عہدہ دار صرف لفظ صاحب سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ امریکہ کے طرز تعلیم کے موافق معینہ نصاب تعلیم کے علاوہ مساوات کی تعلیم کی پیروی کیجاتی ہے۔ اس طریقہ سے نہ صرف آپس میں بلکہ متعلمین و اساتذہ کے مابین مساویانہ میل جول کا سلسلہ قائم کرکے خودداری و متانت اور آزادی خیال کے اعلیٰ جذبات کو نشو و نما پانے کا پورا پورا موقع دیا جاتا ہے۔

مدارس میں اسکاوٹ کی تحریک نہایت سرگرمی کیساتھ جاری ہے اسے جذبۂ جمہوریت کو آزادی سے ترقی دینے کا ایک دوسرا عنوان سمجھنا چاہیئے۔ طبقہ ذکور میں ولیعہد ایران نے اور طبقہ اناث میں شاہ دخت نے گرلس گائڈ کی سرکردگی کو اپنے ذمہ

لیکر اس تحریک کو بہت قوی کر دیا ہے۔ مہینہ میں ایک یا دو مرتبہ اسکاؤٹس کے لئے شہر سے باہر کیمپ قائم کر کے امرازادوں اور غریب کسانوں کے لڑکوں کو دوش بدوش کام کرنے کا موقع دیکر درسِ مساوات دیا جاتا ہے۔ استادوں اور پروفیسروں کو اپنے شاگردوں سے بے تکلفانہ ملنے جلنے کا بہت خیال رہتا ہے۔ بعض اوقات عمائدِ سلطنت بھی کیمپ میں مدعو کئے جاتے ہیں۔

آپس میں بلحاظ مدارج قواعد و ضوابط کی پابندی سے کہیں بڑھ کر باہمی انس و محبت پر مبنی ہے۔ کلاسوں کے باہر اساتذہ اور طلبا امریکن کالج کے ڈاکٹر گرڈ و اور بعض دیگر پروفیسروں کو اکثر اسکول کے لڑکوں کے ساتھ دوستانہ طریقہ پر ٹینس کھیلتے ہوئے میں نے خود دیکھا۔

مدارس کے ارباب اقتدار کو نہ صرف مدارس میں بلکہ بیرون مدارس بھی طلبا کے حسن اخلاق سے کافی دلچسپی ہے اور اعلیٰ سوسائٹی میں اچھے برتاؤ کے قواعد بھی نصاب مدارس میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ سال تعلیم کے اختتام پر تہذیب اخلاق سے متعلق تقریری اور تحریری امتحانات بھی لئے جاتے ہیں۔ مدارس کی پکنک پارٹیوں سیاحتی دوروں اور موقتی جلسوں میں معززین و عمائد ملک کے ساتھ خواتین کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ تاکہ طلبا کو معزز مہمانوں کے باہمی برتاؤ کو دیکھکر عملی طور پر تربیت حاصل کرنے کا موقع ملے۔

ایک مرتبہ امریکن گرلس اسکول کے مہتمم دارالاقامہ کے مخلصانہ التفات سے

ڈیڑھ سو طلبا کی ہمطعامی کا مجھے بھی موقع ملا۔ ان سب کی تہذیب و شائستگی، خلق و مروت دیکھکر نہایت مسرت ہوئی خصوصاً وہ دو بچے جو مہتمم سے دوستانہ گفتگو میں شائستہ مذاق بھی کرتے جاتے تھے۔ ان کی غیر معمولی چستی، ذہانت اور طباعی پر حیرت ہوئی۔ مجھ سے اُن کا تعارف کرایا گیا کہ یہ دونوں ڈاکٹر کانگا کے فرزند ہیں۔ اور ڈاکٹر کانگا پارسی ہیں جو کراچی میں رہتے ہیں۔ میرے نزدیک ڈاکٹر کانگا قابل تعریف ہیں کہ انھوں نے اپنے بچوں کو حصول تعلیم کے لئے اپنے آبائی وطن بھیجکر گویا اپنے دوسرے ہمقوموں کی رہنمائی کا فرض ادا کیا۔

ہندوستان میں اکثر پارسی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ایران میں ان کی کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔ حالانکہ مہمان نوازی میں ایرانی غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اہل ایران اپنے یہاں اُن سکھوں کی بود و باش کے مخالف نہیں جنھوں نے ایران میں موٹر کے سامان کی تجارت اپنے لئے مخصوص کرلی ہے تو بھلا ہندوستان کے پارسیوں کے ساتھ وہ ایسا معاندانہ برتاؤ کیسے کرسکتے ہیں جو حقیقتاً انھی کے گوشت پوست ہیں۔ یہ بھولنا نہ چاہیئے کہ ایران آج وہ نہیں ہے جو کل تھا

حاصل یہ کہ ایران نے ممالک یورپ کے طرز تعلیم پر پورا غور و خوض کرنے کے بعد اپنے یہاں ایک ایسا جدید طریقۂ تعلیم رائج کیا ہے جس میں وہاں کی تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ اپنے یہاں کے قدیم طرز تعلیم کو بھی برقرار رکھا ہے۔ ایرانیوں میں یہ خاص ملکہ ہے کہ وہ دوسروں کی اچھائیوں کو اخذ کرنے پر بھی اپنی

خوبیوں کو جاننے نہیں دیتے. چنانچہ ایران کے موجودہ طرز تعلیم میں ممالک یورپ کی تمام خوبیاں ایک جگہ اکٹھی ہو گئی ہیں۔

چوبیسواں باب

زراعت

زراعت جو ایران کی مدار زیست ہے۔ حکومت اس کی ترقی کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو کر ایرانی کاشتکاروں کی حالت کو درست کر رہی ہے چند سال قبل سوسائٹی میں ایک ایرانی کسان کی حیثیت ہندوستان کے زمانۂ قدیم کے شودر کی پست حالت سے بھی پست تر تھی۔ بیچارہ مجبور و عاجز اَن پڑھ ایرانی کاشتکار کھیتی باڑی کے سوا اور کسی دوسرے پیشے سے ناواقف ہونیکی وجہ سے نہ اپنی حیثیت کا اندازہ کر سکتا تھا اور نہ کبھی اس کے خواب و خیال میں یہ بات آسکتی تھی کہ وہ ملک کے کاروباری معاملے میں بھی کوئی حق رکھتا ہے۔

نقل و حرکت کی سہولتوں کی نایابی نے مہذب شہریوں سے کسان کے سلسلۂ روابط کو منقطع کر کے اسکی قوت جدت طرازی اور زندگی کے بہتر بنانے کے جذبہ کو

فنا کر دیا تھا۔ فاضل پیداوار اس کے کسی مصرف کی نہیں تھی اس لئے کہ اس کی ضروریات زندگی بالکل محدود تھیں۔ کیونکہ یہ کھانے پینے اور پہننے میں قدامت پرست واقع ہوا تھا۔ اور قدیم طریقے پر ہی کھیت کو جوتتا بوتا اور غلے کو پھٹکتا۔ چھانتا اور صاف کیا کرتا تھا۔ اس کی کوئی مرضی نہ تھی۔ صرف زمیندار کے رحم و کرم پر زندگی کا انحصار تھا جو اس کے ساتھ من مانا برتاؤ کیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ طبی امداد سے بھی محروم تھا اور جب کبھی کوئی وبا پھیلتی تھی تو ہزاروں دیہاتی بیکسی اور کس مپرسی کی حالت میں لقمۂ اجل ہو جاتے تھے۔

چھ سال ہوئے جو "ستارۂ جہاں" کے اڈیٹر نے دیہاتی زندگی پر یہ مضمون شایع کیا تھا:۔

"مجھے ایک ایسے گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں میں نے ایک منجم صاحب کو ڈاکٹر کے روپ میں دیکھا جو امراض چشم کے لئے مسہل، درد قولنج کے لئے فصد، سینگیاں اور داغنا تجویز فرماتے تھے۔ اس طرح کا یہ معالجہ دیہاتیوں کی تقریباً نصف آبادی کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ مگر وہاں والے اس ناآشنائے فن کے جانستاں طرز علاج کے نتیجے کو قسمت پر محمول کرتے تھے دیہاتی عورتیں غلط استعمال غذا اور سخت مضر پابندیوں سے اپنے بچوں کو نادانستہ ہلاک کر کے اپنی بدقسمتی پر آنسو بہاتی تھیں

اڈیٹر نے جو کچھ لکھا بالکل سچ تھا۔ ایران کے اکثر دیہات کی یہی حالت تھی غریب دیہاتیوں کی زندگی وبال جان بن کر رہ گئی تھی۔ اور جانوروں کی طرح جو کچھ مل گیا اُس سے اپنا پیٹ پالنا جانتے تھے نہ انھیں کھیتی باڑی کی کچھ خبر تھی۔ اور نہ یہ معلوم تھا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ترقی فصول سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ اور مختلف اجناس کی بروقت کاشت کھاد کا استعمال، یا مشین کے ذریعہ سے ہل چلانا وغیرہ۔ یہ کچھ نہ جانتے تھے۔

اب صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ ایران کے کسان دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے کسانوں کے مقابلے میں زیادہ آرام و آسائش اور خوشحالی سے بسر کرتے ہیں اس لئے کہ حکومت ایران اُن کے معاملات میں بڑی دلچسپی لے رہی ہے۔ اور انکی حالت درست کرنے میں ممکنہ کوشش کی جا رہی ہے۔ نقل و حرکت کی سہولتوں پر کافی غور کے بعد پرانی سڑکوں اور پلوں کی مرمت ہر سال وزنی موٹر لاریوں کے لئے سیکڑوں میل لمبی لمبی نئی سڑکیں بنتی چلی جاتی ہیں۔ تنگ اور ناممکن العبور راستے وسیع اور کشادہ کئے جا رہے ہیں۔ ہر ایک گاؤں کسی نہ کسی بڑے شہر سے موٹر کی سڑک یا سہل العبور کچی روں کے راستوں کے ذریعے ملحق کر دیا گیا ہے۔ دن رات سیکڑوں موٹریں دیہات پر سے گذرتی رہتی ہیں۔ اور مسافروں کے آرام کے لئے جگہ جگہ چائے خانے اور مسافر بنگلے بنا دیئے گئے ہیں۔ اب ایک گاؤں والا مہذب و متمدن دنیا سے بالکل علیحدہ نہیں ہے۔ شہریوں اور دیہاتیوں کا باہمی ارتباط روز افزوں ہی اس لئے کہ شہریوں کو انڈے، مرغیاں، مسکہ۔ دودھ۔ وغیرہ یہ چیزیں انھیں سے

حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ گانوں میں اتحاد باہمی کے اصول پر شیر خانے اور انڈے مرغیاں وغیرہ کے کارخانے قائم کئے گئے ہیں۔ محکمۂ زراعت کے افسروں کا بڑا عملہ اپنے دوروں میں ان کارخانوں کے منیجروں سے مل کر بلامعاوضہ اپنے مفید مشورہ سے انکو مستفید کرتا ہے۔ مویشیوں کے ماہر بھی گانوں گانوں پھر کر علمی طریقوں سے افزائش نسل چوپایاں کے متعلق بلامعاوضہ مشورہ دیتے ہیں۔ عمدہ نسل کے جانور اکناف عالم سے منگا کے کسانوں کو مفت تقسیم کئے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنے یہاں ان نسلوں کو ترقی دیں۔ تمدن و معاشرت کے مصلحین دیہات میں دورہ کر کے عام اصولِ اخلاق، کفایت شعاری اور حفظانِ صحت پر تقریریں کیا کرتے ہیں۔ گانوں میں جبریہ انگریزی لباس نے چھری کانٹے کے استعمال کو بھی لازمی کر دیا ہے۔ طبی افسروں نے دیہات میں دورے کر کے علم جراثیم کو اسقدر لوگوں کے ذہن نشین کر دیا ہے کہ اب وہ درندہ جانوروں سے کہیں بڑھ کر ان چھوٹے موذی جانوروں سے ڈرتے رہتے ہیں۔ دیہات میں وبائی امراض کا اب بالکل پتہ نہیں۔

ایران کے تمام مشہور شہروں میں زراعتی مدارس کھول دیے گئے ہیں۔ ان مدارس میں حاضری کے لئے کاشتکاروں کے لڑکوں کے واسطے خاص سہولتیں رکھی گئی ہیں۔ نمونے کے کھیت مدارس سے ملحق کر دیے گئے ہیں اور مہینے میں دو ایک دفعہ کاشتکاروں کو فارموں پر عملی مظاہروں کو دیکھنے کے لئے بلایا جاتا ہے۔ دورانِ تعلیم میں ہر ایک موقع پر یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ ان کو تعلیم اس لئے نہیں دیجا رہی ہے

کہ فارغ التحصیل ہوکر وہ سرکاری ملازمتیں تلاش کرتے پھریں۔ بلکہ مقصد تعلیم یہ ہے کہ وہ اپنے آبائی پیشہ ہی کو اختیار کرکے کاشت کے جدید طریقوں سے فصلوں کی پیداوار اور اس کی خوبی کو کافی ترقی دیکر اپنی مادر وطن کو خوشحال بنائیں۔

گانوُں والے ہر قسم کے سرکاری ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہانتک کہ دیہات میں اُن کی پیداوار پر بھی کوئی محصول نہیں لگایا جاتا۔ وہاں ایسے جابر عہدہ داران مال نہیں ہیں جو کاشتکاروں کو پریشان کریں۔ سرکاری ماہرین زراعت کے معین کئے ہوئے ٹیکس شہروں کے پھاٹکوں پر پیداوار کی نوعیت کے لحاظ سے لگائے جاتے ہیں اور ٹیکس کی رقم وہیں خریداروں سے وصول کیجاتی ہے۔ اگرچہ اس طرح بظاہر انھیں کوئی ٹیکس ادا کرنا نہیں پڑتا۔ لیکن معینہ نرخ کے مدنظر وہ کافی ادا کردیتے ہیں۔ دیہات میں اشیاے خورونوش کی غیرمعمولی ارزانی اسی طریقۂ کار کا ایک سود مند نتیجہ ہے۔

محکمہ صنعت وحرفت کی جدوجہد ہی سے گانوُں میں ہر قسم کے ایسے کارخانے کھولدیے گئے ہیں۔ جن کے ملازموں کے لئے مضافات میں اچھے مکانات تعمیر کرکے ان کے سامنے تفریح کے لئے باغات لگا دیے گئے ہیں۔ اس سے گانوُں والوں کو علاوہ کاشتکاری کے تفریح کا موقع بھی ملتا ہے۔ کام کرنے والوں کی مزدوری اور اوقات کار کا تعین محکمۂ صنعت وحرفت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔

اعلیحضرت دیہاتیوں کی بہبودی اور مزدوروں کے آرام وآسائش کی

طرف غیر معمولی طور پر متوجہ ہیں۔ اور کبھی کبھی ان کارخانوں کا بغیر اطلاع اچانک معائنہ فرماتے ہیں۔ دوران معائنہ میں کام کرنے والوں کے سامنے کارخانوں کے مالکوں کو یہ ہدایت فرمائی جاتی ہے کہ تم یہاں صرف روپیہ ہی کمانے کے لئے نہیں ہو بلکہ دیہاتیوں کے لئے بر وقت کام مہیا کرنا اور انھیں اصول حفظان صحت کی تعلیم دینا بھی تم پر لازمی ہے۔ ایران سے واپسی میں ایک رات میں ہوٹل قزوین میں ٹھہرا۔ حسب اتفاق یہاں مسٹر آرتھر اوپن پوپ سے ملاقات ہوئی جو نیویارک میں ایرانی ادارہ صنعت وحرفت اور آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر ہیں۔ وہ چھ امریکن طالب علموں کو اپنے ہمراہ لیے اصطخر جا رہے تھے۔

انھوں نے کہا کہ میں تقریباً تمام مشرقی ممالک اور ممالک یورپ کی سیاحت کرچکا ہوں۔ میرے نزدیک ایران نے جس تعجیل سے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اس دس برس کی مختصر مدت میں اور کوئی ملک اس سرعت سے ترقی نہیں کرسکتا۔ تین سال قبل جب میں کردستان سے ہوکر گذرا تو اس وقت تک کسی گاؤں میں ابتدائی ایک مدرسہ کا بھی پتہ نہ تھا۔ یا اب اسی ضلع میں اتنی جلد سیکڑوں مدرسے اور متعدد صنعتی کارخانے ایسے کھل گئے جن میں سے ہر ایک کو پانچ چھ گانوؤں سے قربت حاصل ہے۔ میں نے ان کارخانوں کا بھی معائنہ کیا۔ اور تمام دیہاتیوں کو یوروپین لباس پہنے کام کرتے ہوئے پایا۔ وہ پہلے سے زیادہ تندرست پاک وصاف اور چست وچالاک نظر آتے تھے۔ خاص کر وہ مکانات جو انکے رہنے کے لئے بنائے گئے تھے انھیں دیکھکر مجھے بہت حیرت ہوئی۔

پچیسواں باب

محکمۂ حفظانِ صحت عامّہ

حکومت ایران کا یہ ایک جدید محکمہ دو شاخوں میں منقسم ہے۔

اوّل انسداد امراض اور دوسرے علاج امراض۔

مقدم الذکر شاخ کے تحت عام صفائی، امراض متعدیہ، پرورش اطفال کارہائے تعمیر متعلق صفائی۔ جراثیمی وکیمیاوی معامل (لیبو ویٹریز) دیوانے کتوں کے کاٹے ہوئے لوگوں کے علاج اور مختلف امراض متعدیہ کے ٹیکوں کے لیے ملت تیار کرنے کے ادارے اور دوسری شاخ کے تحت عام امراض۔ امراض چشم امراض متعدیہ، امراض خبیثہ، تپ دق کے شفاخانے، دواؤں کے بڑے بڑے گودام اور پاگل خانے قائم کئے گئے ہیں۔

دس برس پہلے بوشہر اور ایدان میں دو انگریزی۔ اصفہان میں ایک

انگریزی مشنری اور ہمدان اور طہران میں دو امریکن مشنری شفاخانوں کے سوا تمام ایران میں جدید طرز کا کوئی ایک بھی اپنا شفاخانہ نہیں تھا۔ آج ملک میں جگہ جگہ اپنے شفاخانے اپنے ڈاکٹر اور اپنی نرسیں موجود ہیں۔ پرانے لکیر کے فقیر اطبّا کی جگہ اب تعلیم جدید کے بیرونی سند یافتہ یا طہران میڈیکل کالج کے کامیاب ڈاکٹر مسیحائی کر رہے ہیں۔

حفظانِ صحت اور صفائی ملک کے گوشے گوشے سے نمایاں ہے۔ تعلیم یافتہ سنیٹری انسپکٹرس یہاں کے بڑے بڑے شہروں اور چھوٹے چھوٹے قصبوں تک میں صفائی کی نگرانی کے لیے متعین ہیں۔ محکمہ صفائی شہروں میں صاف وشفاف پانی مہیا کرنے اور باقاعدہ بدر روؤں کے سسٹم قائم کرنے کی طرف خاص طور پر توجہ کر رہا ہے۔ شہروں اور قصبوں میں ایسے زنانہ شفاخانے اور زچہ خانے قائم کر دیے گئے ہیں جن میں تعلیم یافتہ لیڈی ڈاکٹرس۔ نرسیں اور دائیاں مصروف کار رہتی ہیں۔ معاشرتی رضا کار خواتین وقتاً فوقتاً ان اداروں کا خود معائنہ کرتی ہیں تاکہ معلوم ہو کہ ناواقف عورتیں ان سے پورا فائدہ اٹھا رہی ہیں یا نہیں۔

چھبیسواں باب

محکمہ تعمیراتِ عامّہ

عہد حاضر کے قبل تک محکمہ تعمیرات عامہ کے نام سے کبھی ایران واقف نہ تھا۔ اب وہی محکمہ رات دن مصروف کار ہے اور پرانی سڑکوں کی مرمت نئی سڑکوں اور سرکاری عمارتوں کی تعمیر پر بیدریغ زر پاشی کر رہا ہے۔ کارج سے چولس کی سڑک پر بارہ میل کی مسافت کم کرنے کے لئے جو ایک میل طولانی ٹنیل بنایا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس پر لاکھوں تومان صرف ہو چکے ہیں۔ شہر کی تمام سڑکیں جدید طرز پر بہت اچھی بنائی گئی ہیں۔

طہران میں بہت (۳۰) فٹ سے (۴۰) فٹ تک چوڑی نئی سڑکیں تیار ہو گئی ہیں۔ جن کے دونوں جانب سایہ دار درختوں کی قطاریں اور ان کے جانبین میں پیدل چلنے والوں کے لئے ایسے راستے ہیں جن سے دار السلطنت ایران بلادیورپ

کا نمونہ بن گیا ہے۔ جدید محکموں کے دفاتر کی روز افزوں ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ان سڑکوں کی دونوں جانب نہایت سُرعت سے نئی سرکاری عمارتیں تعمیر ہوتی چلی جاتی ہیں۔

ہر سال مشہور شہروں کے درمیان بڑی چوڑی موٹر کی سڑکیں بن رہی ہیں۔ محکمہ تعلیم کے غیر معمولی فروغ پذیر سلسلے میں مدارس وغیرہ کے لئے تمام ملک میں عمارتوں کی ضرورت کو محکمۂ تعمیرات عامہ نے نہایت بہتر طریقے پر پورا کیا۔

دو سال ہوئے کہ اعلیحضرت نے ایک مناسب جگہ طہران یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں حسب معمول مختصر طور پر ارشاد فرمایا تھا کہ "یہ عمارتیں اب سے بہت پہلے تعمیر ہونا چاہیئے تھیں۔ لیکن ملک نے اس کام کو چونکہ تاخیر سے شروع کیا۔ اس لئے اس کی تکمیل بہ تعجیل لازم ہے۔" یونیورسٹی کی تمام عمارتیں جو بحیثیت مجموعی بمبئی یونیورسٹی کی عمارتوں سے دس گنی وسیع ہونگی۔ ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں بن بنا کے پوری تیار ہوگئیں۔ اور بہت سے کالج جو پہلے کرایے کی عمارتوں میں تھے۔ بتدریج ان قصر نما عمارات میں منتقل ہو رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تعمیر کا ایسا عظیم الشان سلسلہ ایران میں اس سرعت کے ساتھ کیسے انجام پا رہا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ "روم ایک دن میں نہیں بنا"۔ مگر موجودہ ایران نے اس مثل کی تغلیط کر دی کیونکہ مبالغے کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایران ایک

ہی دن میں تعمیر ہو گیا۔

ریلوں کی تعمیر میں بھی حیرت انگیز سرعت کارفرما ہے۔ ملک میں یہ افواہ گرم ہے کہ اعلیٰ حضرت تین سال کی مدت کے اندر تمام ملک میں ریلوں کا جال بچھا دینا چاہتے ہیں۔ ناقابل عبور پہاڑی سلسلوں کے مدنظر جو اس کوہستانی ملک میں شہروں کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کر دیتے ہیں۔ یہ کام ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن گزشتہ چند سال کے عرصہ میں ایران نے بہت سے ناممکنات کو ممکنات کر دکھایا اور یہ کام بھی انھی میں ایک اضافے کی حیثیت اختیار کریگا۔

ستائیسواں باب

محکمۂ رجسٹری

ایران میں محکمۂ رجسٹری کا سب سے پہلا کام ولادت و اموات کی رجسٹری اور دوسرا نمبر دستاویزات کی رجسٹری کا ہے۔ تمام ملک میں بڑے بڑے شہروں سے چھوٹے سے چھوٹے مقام تک کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں اس محکمے کی کوئی شاخ ہو۔

اس قانون کے تحت ملک کے ہر ایک باشندے کے لئے ان دفاتر میں کسی ایک میں اپنی تاریخ پیدائش۔ ذاتی اور خاندانی نام، پیشہ اور جائے سکونت درج کرانا ضروری ہے، اور اسی کے ساتھ اپنی تین عکسی تصویریں داخل کرنا لازمی ہیں۔ ان تمام اندراجات کی نقل مع تصویر ایک ذمہ دار افسر محکمہ کی تصدیق و دستخط کے بعد اس شخص کو دیدی جاتی ہے، اس کو ایران میں "دستاویز ہیئت" کہتے ہیں جسے ممالک یورپ کے "پاس پورٹ" کے مماثل سمجھنا چاہیئے۔ ہر شخص

کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا بوڑھا، یہ دستاویز ہیئت اپنے پاس رکھنا پڑتی ہے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو سواری میں یا پیدل کوئی شخص بغیر اس دستاویز کے سفر نہیں کر سکتا۔ راہ میں ہر ایک پولیس اسٹیشن پر اس کی تنقیح اور رجسٹری ہوتی ہے۔ منزل مقصود پر پہونچتے ہی مسافر کو پولیس میں اپنی آمد کی اطلاع اور جائے قیام کا پتہ دینا لازمی ہے، اگر وہ ایسا نہ کرے تو راہ کے اندراجات دیکھ کر بہت آسانی سے اس کی تلاش کی جا سکتی ہے۔ اور اُسے پچاس تومان تک جرمانہ کا مستوجب قرار دیا جا سکتا ہے۔ رجسٹری کا یہ طریقہ کسی دوسرے ملک میں نہیں سنا گیا۔ اس سے دو فائدے ہیں۔ ایک تو مشتبہ چال چلن کے لوگوں کی نقل وحرکت سے پولیس باخبر رہتی ہے، دوسرے ایسے معززین کی نقل و حرکت سے بھی پولیس کا محکمہ مطلع رہتا ہے جن کی سلامتی کی ایک طرح سے حکومت ضامن ہے۔

بیرونی ممالک کے نو وارد لوگ اپنے سفر کی ہر ایک منزل پر اس طرح کی باز پرس اور پابندیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ بیرونجات کے لوگوں پر مزید قیود عائد ہیں جنھیں وہ عموماً عدم اعتماد پر محمول کرتے ہیں۔ عموماً جب کوئی بیرونی شخص ایران جانا چاہتا ہے تو اس ملک کا ایرانی قونصل اس کے پاسپورٹ پر یہ "ویزا" درج کرتا ہے کہ یہ ویزا سرزمین ایران پر تاریخ ورود سے ایک ماہ تک بکار آمد ہوگا مدت معینہ گذرنے کے بعد اگر مزید قیام کی ضرورت ہو تو اس کے لئے پولیس میں پھر

درخواست دینی پڑتی ہے۔ یہ صرف ایک ضابطے کی تکمیل ہے ورنہ جہاں تک مجھے علم ہے اس معاملے میں پولیس کسی کو پریشان نہیں کرتی۔ مجھ کو بھی اُس ضابطے کی تکمیل کرنی پڑی لیکن ذرا سی دیر میں توسیع قیام کی اجازت مل گئی۔

اٹھائیسواں باب

محکمۂ امور مذہبی

ایران کے بالکلیہ اخذ مغربیت کو دیکھکر اسلام سے انحراف یا اس کی مخالفت سمجھ لینا غلطی ہو گی۔ طہران میں ایک امریکن اخبار نویس مجھ سے کہنے لگا کہ:۔

"آجکل کے ایرانی اسلام کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ چکے۔ اب اگر وہ بالکل غیر مسلم نہیں ہیں تو پکے مسلمان بھی نہیں کیونکہ ان کے اسلامی عقائد متزلزل ہو چکے۔ چند ہی سال میں یہ اپنے رجحانات جدیدہ کے لحاظ سے عیسائیت قبول کر لیں گے اور اگر وہ عیسائیت قبول نہ بھی کریں تو بس یہی ایک راستہ ان کے لئے رہ جاتا ہے کہ وہ لامذہب ہو جائیں۔ ملاؤں کا تو انھوں نے خاتمہ ہی کر دیا ہے۔ سوائے شریعت سنگلاخی اور چند اور ملاؤں کے جو آزاد خیال

فلسفی معلوم ہوتے ہیں۔ طہران میں اب اور کسی مُلّا کا پتہ بھی نہیں
رسومات محرم بند کر دی گئیں اور کسی کو مکۂ معظمہ یا کربلائے معلی
جانے نہیں دیا جاتا۔ پردے کا رواج بھی مطلق نہیں مسلمان
خواتین علانیہ اپنے شوہروں کے ساتھ رقص کرتی نظر آسکتی ہیں۔
تعدد ازدواج کے متعلق سخت پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ متعہ
تو موقوف ہی ہو گیا۔ تجہیز و تکفین کی رسوم میں بھی بہت کچھ کمی
کر دی گئی ہے۔ ڈاڑھیاں بالکل صاف ہو چکیں۔ اسلامی عمامہ
اور ٹوپی کی جگہ یورپین ہیٹ نے لے لی ہے۔ یہ سب کچھ اسلام
کے خلاف بغاوت نہیں تو اور کیا ہے؟"

یہ اِس کے لئے بالکل نئی بات تھی۔ جب میں نے اِس سے کہا کہ یہ اسلام کے خلاف بغاوت نہیں ہے۔ میں نے اسکو مشورہ دیا کہ آنریبل سید امیر علی کی کتاب "اسپرٹ آف اسلام" پڑھو تو تم کو حقیقت اِسلام معلوم ہو۔

باوجود ان تمام باتوں کے میں نے ہزارہا مسلمانوں کو دیکھا ہے کہ وہ روزانہ پابندی کے ساتھ پنجوقتہ نماز پڑھتے اور زہد و تقوی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور یہی اسلام کا ماحصل ہے۔ ایرانیوں کے فطرتی اوصاف مہماں نوازی ایثار و کرم اور خدمت عامتہ الناس ہی ان کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کا کافی ثبوت ہے۔ صراط مستقیم پر گامزنی جو سچائی کا راستہ ہے اصل مقصد اسلام یہی ہے۔ اور

آجکل کے ایرانی اسی راہ پر چلنے کے لئے کوشاں ہیں۔

اب ایران نے اسلام کو بہت سے ایسے فروعی زوائد سے پاک کر دیا ہے جو یا تو پیروان اسلام کی غلط فہمیوں کی بنا پر اور یا ملاؤں کی خود ساختہ رسوم کی شکل میں جزو اسلام بن گئے تھے۔ نیم ملاؤں نے جاہل ضعیف الاعتقاد پیرودں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر خطرۂ ایمان بنّا مدت سے اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ اب اس ناروا پیشے کو ترک کرنے اور کوئی دوسرا جائز ذریعہ معاش اختیار کرنے پر قانوناً انھیں مجبور کر دیا گیا ہے ان میں سے بہترین افراد کو سرکاری خدمات دیدی گئی ہیں۔ طہران کے ایک جدید کالج دینیات دانش سرائے معقول و منقول میں روشن خیال اور قابل و فاضل حضرات کو پروفیسر مقرر کر دیا گیا ہے۔ بہ نظر تحریص و ترغیب ہونہار طلبا کو علاوہ مصارف قیام و خورد و نوش کے جیب خرچ کے لئے بھی کچھ الاؤنس دیا جاتا ہے۔ اس کالج میں عربی زبان، ادب، کلام مجید، تفاسیر، دینیات، منطق، فلسفہ، تاریخ اسلام، علم حدیث اور فرانسیسی، جرمنی اور انگریزی زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ اس کالج کا نصاب تعلیم چار سالہ ہے اور اس کے فارغ التحصیل طلبا ملک کے آیندہ علما بننے کے مستحق خیال کئے جاتے ہیں۔ اب اِس کالج میں انداز خطاب، نہج تکلم، فصیح البیانی اور موعظت کا بھی اضافہ کیا گیا ہے، یہاں کے فارغ التحصیل طلبا ایران میں خالص اسلام کی موعظت کی خدمت پر سرکاری طور پر مقرر کئے جاتے ہیں۔

۴ر نومبر کو ہز اکسلنسی شاہ محمود خاں افغانستان کے وزیر جنگ جو موجودہ

امیر افغانستان کے چچا ہیں اور جنرل عمر محمد خاں کمانڈر ان چیف افواج افغانستان ایران تشریف لائے۔ ۸ر نومبر کو وزیر معارف نے طہران کے چند اعلیٰ تعلیمی اداروں کا معائنہ کرانے کے لئے انکو مدعو کیا۔ وزیر افغانستان نے ان اداروں اور بالخصوص کالج دینیات کے معائنے میں بڑی دلچسپی ظاہر کی جس کے متعلق وہ افغانستان میں بہت کچھ سُن چکے تھے۔ کالج دینیات کے پروفیسروں اور طلبا نے بڑی گرمجوشی سے انکا خیر مقدم کیا وزیر افغانستان نے طلبا سے اسلام کے متعلق بہت سے ضروری سوالات کئے اور جوابات سُن کر بہت خوش ہوئے۔ پھر تفسیر قرآن شریف پر ایک لکچر سننے کی خواہش ظاہر کی وزیر معارف نے مسٹر اثر سے طلبا کے سامنے اس مضمون پر لکچر دینے کے لئے کہا۔ وزیر افغانستان نے نہایت انہماک سے لکچر سنا اور اختتام تقریر پر ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"میں اعلحضرت شاہ ایران کا بیحد ممنون ہوں کہ وہ اسلام کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ اپنے ملک کی مادی ترقی کیلئے بے انتہا کوشش کے باوجود اپنی رعایا کی دینی اور روحانی ضروریات کو جناب ممدوح نے نظر انداز نہیں کیا۔ اس ادارے کے ذریعے سے اسلام کے حقیقی علم کی نشر و اشاعت ہو رہی ہے اور مسلمانان عالم اس سلسلہ اخوت میں منسلک ہو رہے ہیں جسکی حبل المتین کچھ مدت سے کمزور ہو گئی تھی افسوس ہے کہ اسلام کے متعلق دنیا غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ اور انھی ذرائع سے حقیقی اسلام کی تلقین پھر سودمند ہو سکتی ہے۔"

وزیرِ افغانستان کی اس رلے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ دن دور نہیں ہے کہ افغانستان بھی ترکی اور ایران کے قدم بقدم ترقی کریگا۔

جب میں ایران سے واپس ہو رہا تھا تو میرے ایک عرب دوست نے مجھکو نجف میں ایک ادارہ دکھایا جسکا نام "جمعیۃ الربعیۃ العلمیۃ الادبیہ" ہے۔ یہ ایسے مجتہدین اسلام کی ایک انجمن ہے جو اقتضاے وقت کا لحاظ کرکے بڑھنا چاہتے ہیں۔ سید عبد الوہب معتمد انجمن مذکور سے میرا تعارف کرایا گیا۔ موصوف نے گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور ٹیلیفون سے اس انجمن کے چند سربر آوردہ ممبروں کو مجھ سے ملنے کے لئے بلایا۔ میں ان روشن خیال مجتہدین کرام سے ملکر بہت خوش ہوا۔ یہ ادارہ بھی طہران کے کالج دینیات کے پہلو بہ پہلو کام کر رہا ہے۔ اس ادارے کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دینیات کے علاوہ منطق و فلسفہ اور یورپین زبانوں میں سے بھی کسی ایک کی تعلیم دیجاتی ہے۔

یہ ادارہ حکومت عراق کا قائم کیا ہوا نہیں ہے بلکہ خود روشن خیال مجتہدین نے اسکی بنا ڈالی ہے۔ بعض کٹر مُلّا اس کے مخالف ہیں لیکن عراق گورنمنٹ اور اس وقت کے نوجوانوں کا گروہ اس کی تائید میں ہے۔ اس میں طلبا بجائے دقیانوسی وضع کی فرش نشینی کے کرسیوں اور بنچوں پر بیٹھ کر درس حاصل کرتے ہیں۔ جملہ اراکین ادارہ ایسے روشن خیال اور وسیع النظر ہیں جن میں تعصب کا پتہ نہیں۔ صدر ادارہ نے تا دیر عربی زبان میں مجھ سے گفتگو کی۔ اثنائے گفتگو میں موصوف نے مسکرا کر مجھ سے فرمایا:۔

جو کچھ ہمارے پڑوس میں ہو رہا ہے ہم اس سے بے خبر نہیں ہیں۔ سرزمین ترکی سے ملاؤں کا استیصال ہو چکا۔ ایران میں بھی ان کا وہی حشر ہوا۔ دورِ حاضر جدید طرزِ معاشرت کو نہایت ضروری سمجھکر یہ بانگِ دہل بلا رہا ہے۔ ہمارے ملک میں نوجوانوں کی ایک قوی جماعت ابھر رہی ہے جس کا نصب العین یہی ہے کہ ملاؤں کا خاتمہ کر دیا جائے، قبل اس کے کہ ہمارے لئے کوئی نازک صورت پیدا ہو۔ ہم لوگ پیش بینی و مآل اندیشی کی بنا پر خود ہی آگے بڑھ گئے۔ گویا ہمارا یہ ادارہ قدیم ملاگری اور تمدن جدید کے درمیان ایک خوش آیند رابطہ ہے۔

موصوف نے اپنے معاصرین کے سامنے مجھے اس ادارے کا اعزازی ممبر بنانے کی تجویز پیش کی۔ میں نے ان کے اس پیشکش کو شکریے کیساتھ قبول تو کر لیا لیکن یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ "ڈاڑھی منڈا ہونے کی حیثیت سے ایسی برگزیدہ جماعت میں شرکت کیلئے میں اپنی ذات میں کوئی مناسبت نہیں پاتا" معتمد صاحب نے فرمایا کہ آپ نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ ہم مُلّائین اور تمدن جدید کی درمیانی کڑی ہیں۔ ہماری اس انجمن کے ایک رکن پیرس یونیورسٹی کے ایک فرانسیسی، زبان عربی کے پروفیسر ہیں ہم لوگ اُن کی قدر و منزلت اِن کے علم و فضل کی وجہ سے کرتے ہیں نہ کہ ظاہری صورت اور وضع کے لحاظ سے۔

انتیسواں باب

محکمۂ حربیہ

محکمۂ فوج وزیر جنگ کی زیر دستی میں اب تک شاہِ ذیجاہ کی ذاتی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ جدید اصول جنگ کے مطابق افسروں کی تعلیم کیلئے فنّی مدارس اور کالج کھولدئے گئے ہیں۔ بہت سے ملکی معلمین کے علاوہ بیرونی ماہرین فن بھی کچھ مدّت کیلئے مقرر کئے گئے ہیں تاکہ ان کی جگہ پر اعلےٰ تربیت یافتہ ایرانی افسروں کا تقرر اسی وقت ہو سکے۔ جب اہل ملک قابلیت حاصل کر کے اسکے اہل بن جائیں۔ ہر سال بیسوں افسر نئے ہتھیار اور آلاتِ حرب کے استعمال کی فنّی تعلیم حاصل کرنے کیلئے یورپ بھیجے جاتے ہیں۔ اور حرب کے مختلف شعبوں میں ہزاروں نوجوانوں کی نئی بھرتی ہوتی رہتی ہے۔ سپاہیوں اور افسروں کی تنخواہیں بیش قرار کر دی گئی ہیں کہ لوگ بطیب خاطر شریک ہوں۔ ملک کے کسی محکمہ کے ملازموں کی

تنخواہیں محکمۂ فوج کے ملازموں کے برابر نہیں ہیں۔

ہتھیار اور جملہ سامان حرب ملک ہی میں تیار ہوتا ہے اور اب اس بارے میں بیرونی ممالک کی احتیاج باقی نہیں۔ سپاہیوں اور افسروں کے سازوسامان پر معتدبہ رقوم صرف کی جارہی ہیں۔ التفات شاہانہ سے انکی خورونوش، پوشش اور قیام کا عمدہ انتظام ہے۔ مختلف نمونوں کے تمام طیارے فضائے ملک میں پرندوں کی طرح منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ ایرانیوں کو اب ہوا بازی سے لگاؤ پیدا ہو چلا ہے۔

طہران میں یورپ کے اکثر سیاحوں نے مجھ سے کہا کہ آج بلحاظ وسعت و رقبہ ایران دنیا کے بہترین مسلح ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ فوجی خدمت کے لازمی قرار دینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کسی بڑی جنگ کی تیاری کر رہا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اعلیحضرت کا مقصد صرف یہ ہے کہ ملک کے ہر شعبے کو ایسا ترقی یافتہ بنا دیا جائے کہ دوسرے ممالک کی مداخلت کا موقع ہی نہ رہے۔

تیسواں باب

محکمہ جات صنعت و حرفت و تجارت

ایران میں تجارتی سرگرمیاں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ تجارتی مال کی درآمد و برآمد کیلئے ہزاروں کمپنیاں قائم ہوچکیں۔ ان میں سے اکثر کو مخصوص اشیاء کی تجارت کے اختیارات کلی دیدیئے گئے ہیں۔ ان اداروں کے حصہ داروں کا اعتماد اور بیرونی ممالک میں ساکھ قائم رکھنے کے مدِ نظر خود حکومت نے بھی ان کے بہت سے حصص خرید لئے ہیں۔ سرکاری آڈیٹرس ہر سال ان کمپنیوں کے حسابات کی جانچ کیا کرتے ہیں۔

عملی طور پر فن تجارت سکھانے کیلئے طہران میں تجرباتی دکانیں کھولدی گئی ہیں۔ قلعۂ ایران میں جو لندن کے سلفریج اسٹور کی طرح مصنوعات ایران کی ایک عظیم الشان دکان ہے۔ ایک درجن سے زیادہ شو روم ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی بڑی سے بڑی کوئی چیز ایسی نہیں جو وہاں نہ ہو۔ ہر دوکان میں ایک کمرہ ایسا ہے جسمیں بہترین طریقے اور بڑے سلیقے سے مصنوعات ملک سجایے گئے ہیں۔ کل

اشیائے فروختنی پر قیمتیں لکھی ہوتی ہیں۔ محکمہ تجارت کے موازنہ میں بچت پیدا کرنے کے لئے بیرونی ممالک سے اشیائے فروختنی کی درآمد پر بہت سی قیود لگا دی گئی ہیں جسکی وجہ سے ایران کے غیر ملکی تجار میں کچھ ناراضی پھیلی۔ مثلاً اس قسم کی چیزیں جیسے بسکٹ، مربے، چٹنی، اچار اور کھلونے وغیرہ ان کی درآمد بالکل بند کر دی گئی۔ اب خود ایران ہی میں یہ سب چیزیں بکثرت تیار ہوتی ہیں۔ مصنوعات مقامی جو بیرونی اشیاء سے کسی طرح کم نہیں۔ انھیں فروغ دینے کے لئے اس قسم کے مال کی درآمد کو بالکل بند کر دیا ہے۔ اب رہیں اور دوسری چیزیں جو تکلفات اور تعیش کی تعریف میں نہیں آتیں۔ ان کی درآمد کے لئے حکومت ایران کی خاص اجازت لینی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسے مال کا تعین مقدار اور قسم مال کی پسندیدگی وغیرہ یہ محکمہ تجارت کے ماہرین کے ذمہ ہے۔ مزید برآں صرف انھی ممالک کو درآمد کی اجازت دیجاتی ہے جو ایرانی مال کی برآمد میں ساعی ہوتے ہیں۔ اب مقامی صنعتی اشیا کا حق فروخت مخصوص تاجروں کو دیکر گورنمنٹ کے زیر نگرانی ملکی صنعت و حرفت نے ایسا فروغ حاصل کیا ہے کہ بیرونی ممالک کے بازاروں میں اسکی بہت سی مصنوعات ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو سکیں۔ ایران میں روئی اور اون کی خام پیداوار کو اعلیٰ قسم کا بنانے میں بڑی ترقی کی گئی ہے۔ صنعت قالین بافی میں پختہ رنگ کے استعمال کے ساتھ ساتھ نئی نئی وضعیں اختیار کرنے کی طرف التفات حکومت اور اعلیٰ تنظیم کار نے ملک میں قالینوں کا ایسا انبار لگا دیا ہے جس کی وجہ سے بیرونی

ممالک کے بازاروں میں انکی نکاسی اور کھپت حکومت کے زیر غور ہے۔

یہ افراط خشک و ترمیوہ جات جو بیشتر معقول ذرائع حمل و نقل کے فقدان اور بطرز جدید ترمیووں کو خشک کرنے اور موسمی اثرات سے محفوظ رکھنے کے طریقوں سے لاعلمی کیوجہ سے بیشتر ترمیوے جلد سڑ جاتے تھے۔ اب بڑی مقدار میں خشک کرکے ان کے مُربّے وغیرہ بند ڈبوں یا بوتلوں میں محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ قدیم بر نجی صنعت جو بیرونجات میں عدم فروخت کی وجہ سے مٹ چکی تھی اب پھر نمایاں ہوگئی ہے۔ میں کوئی ماہر صنعت و حرفت تو ہوں نہیں کہ ان بے شمار اشیاء کو گنا سکوں جن کی ایجاد کو ایران نے اپنا بنا لیا ہے اور جنکی فروخت کیلئے بیرون ممالک کے بازار درکار ہیں۔

حکومت نے اپنے ملک کی برآمد کو ترقی دینے کے لئے دوسرے ممالک کے ساتھ مال تجارت کے تبادلے کا طریقہ جاری کر دیا ہے۔ یہ اسی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ کچھ ہمارے ہندوستانی تجار جو چینی اور جاپانی مال کی ایران میں درآمد کیا کرتے تھے۔ اب صرف اس شرط پر ایسا کر سکتے ہیں کہ وہ انھی ممالک یا دوسرے ممالک میں ایرانی تجارتی مال کی اتنی ہی برآمد کر سکیں جتنی ایران کی درآمد ہو۔

ابھی حال میں ڈاکٹر شیٹ جرمنی کے ایک ماہر تجارت، ڈاکٹر اسمنڈ وزیر حکومت جرمنی تین اور اعلیٰ حکام کے ساتھ طہران آئے۔ یہاں ایرانی کلب میں وزیر اعظم، وزیر مالیات اور وزیر خارجہ نے ان معززین کو مدعو کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایران میں اپنے چند روزہ قیام کے بعد ڈاکٹر شیٹ نے طہران کے نمائندگان اخبارات کو یہ بیان دیا۔

یہ پہلا موقع ہے کہ سرزمین ایران پر ایوان حکومت جرمنی کے کسی رکن نے قدم رکھا ہے۔ میں نے اس ترقی پذیر ملک کی مالی اور تجارتی صورت حال کی پوری جانچ کی۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ ان دونوں امور پر میرا تبصرہ حسب دلخواہ موثر ہوگا اور آیندہ سے ایران کے ساتھ ہمارے تجارتی تعلقات نہایت مستحکم اور استوار ہو جائیں گے۔

ایران میں بہت سی ایسی چیزوں کی پیداوار ہے جو جرمنی کی ضروریات کو پورا کرسکتی ہے اور چونکہ ایران نے حیرت انگیز صنعتی ترقی کی شاہ راہ پر قدم رکھا ہے، اسلئے اپنی روزافزوں صنعت وحرفت کے لئے اسے بھی جرمنی کی کثیر پیداوار کی حاجت ہے۔ پس ہمارے باہمی تجارتی تعلقات میں جتنی زیادہ وابستگی ہوگی اتنی ہی دونوں ممالک کی بہتری وبہبودی کا رونما ہونا لازمی ہے۔ ایران کا دوسرے ممالک کے ساتھ تجارتی موجودہ طریقہ یعنے مبادلۂ مال ایسی بہترین صورت ہے جو وہ بہ حالاتِ موجودہ اختیار کرسکتا تھا۔ جرمنی کی بیرونی تجارت کا مسلک بھی بعینہ یہی ہے۔ میری رائے میں عالمگیر بین الاقوامی تجارتی حالات کے لحاظ سے صرف ایک یہی بہترین کاروباری طریقہ ہوسکتا ہے۔

اکتیسواں باب

صنعتِ قالین بافی

مغربی ممالک میں ایرانی قالینوں کا استعمال صرف اس وجہ سے نہیں ہے، کہ وہاں کے لوگ ایسی چیز رکھنے کے مشتاق ہیں جو دوسروں کے پاس نہ نکلے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قالین ہی فرش کے لئے قابل قدر چیز ہیں۔ کیونکہ اگر یہ چند قالین پالش کئے ہوئے فرش پر ادھر اُدھر بچھا دئے جائیں تو وہ بمقابلہ بڑے اور بھاری غالیچوں کے جو برنجی کیلوں سے فرش پر جڑ دیے جاتے ہیں۔ بآسانی صاف کئے جا سکتے ہیں۔

ایران میں تو یہ قالین گھر گھر استعمال ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہاں کرسیوں کا زیادہ رواج نہیں ہے۔ پشت ہا پشت سے نہ صرف ایران میں بلکہ تمام مشرقی ممالک میں فرش قالین ہی کا دستور رہا ہے۔ اگر ہم ایران کی تاریخ ماضیہ کا مطالعہ کریں

تو خسرو اعظم کے زمانے تک قالینوں کے استعمال کا پتہ لگتا ہے۔ اِسکے مقبرے میں بابل کے قالین بچھے ہوئے تھے اور غالباً یہ صنعت ۲۲۰۰ سال قبل مسیح جاری تھی۔

ایرانی قالین کی قدر و قیمت کسی ایک ہی حیثیت پر منحصر نہیں بلکہ اس کا اندازہ کرنے میں بہت سے پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ اپنی وضع میں اس کو خالص ایرانی ہونا چاہیئے۔ اسکی بناوٹ اور طول و عرض بھی قابل لحاظ چیزیں ہیں۔ اور غالباً سب سے زیادہ ضروری چیز یہ خیال کی جاتی ہے کہ کم و بیش ہلکے رنگوں میں میل اور مناسبت پیدا کی جائے۔ اور کیمیاوی رنگوں سے قطعاً احتراز کیا جائے۔ جیساکہ عام خیال ہے کہ یورپ کے تیار کردہ قالینوں میں اکثر یہ خوبیاں نہیں پائی جاتیں۔ ایرانی قالینوں میں نباتاتی رنگوں کا استعمال نہ صرف انکی خوبی کو برقرار رکھنے بلکہ اس میں پائداری کے اضافے کا بھی ضامن ہے۔
چنانچہ اب قدیم قالین نایاب ہوتے جارہے ہیں اور بہت گراں قیمت پر دستیاب ہوتے ہیں۔ تمثیلاً آردبیل کے ایک قالین کو لے لیجئے۔ جس کا طول ۳۴ فٹ اور عرض ۱۷ فٹ ۶ انچ تھا۔ یہ ۱۵۳۶ء میں کاشان میں تیار کیا گیا۔ اور لندن کے عجائب خانہ کنسگٹن کے لئے ۶۰۰۰ پونڈ میں خریدا گیا۔ لیکن ایک امریکن نے ۱۲۰۰۰ پونڈ میں صرف ایک قالین خرید کر بیش قیمتی کی حد کردی۔

قدیم ایرانی قالینوں کو پہچاننا بھی کسی قدر دشوار امر ہے۔ اس لئے کہ

قالین باف نئے قالین کو پرانا بنانے کیلئے طرح طرح کی ترکیبیں کیا کرتے ہیں جیسے کبھی تو رنگوں کو ہلکا اور پرانا ظاہر کرنے کے لئے کافی کے پانی میں قالین کو غوطہ دیتے ہیں۔ کبھی تیزاب استعمال کرتے ہیں۔ اور کبھی خاص قسم کی چمک پیدا کرنے کیلئے چربی سے آب و تاب پیدا کرنے کے بعد اُسپر بیلن پھراتے ہیں۔ غرضکہ اسی طرح کی بہت سی ترکیبیں کیجاتی ہیں۔ ساٹھ ستر برس پہلے قالین کا اُون رنگنے کیلئے نباتاتی رنگ استعمال کئے جاتے تھے۔ لیکن اب احکامِ امتناعی کے باوجود کیمیائی رنگ کام میں لائے جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ نباتاتی رنگوں کے تیار کرنے میں بہت زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔ اور کیمیاوی رنگ ہر وقت بآسانی دستیاب ہوسکتے ہیں۔

اِس میں شک نہیں کہ کیمیاوی رنگوں سے صرف اون ہی خراب نہیں ہوتا بلکہ اس کی پائداری کو بھی نقصان پہونچتا ہے۔ بخلاف اسکے نباتاتی رنگ اپنی پختگی کی وجہ سے قالین کو بہت پائدار بنا دیتے ہیں۔ نباتاتی رنگ کا قالین جتنا پرانا ہوتا جاتا ہے اتنی ہی اس کی آب و تاب بڑھتی جاتی ہے۔ کیمیائی یا نباتاتی رنگ کی پہچان کے لئے ایک سہل سی ترکیب یہ ہے کہ قالین کے اس حصے کو جسپر سفید اور کسی دوسرے رنگ کا اتصال ہو پانی میں ڈبو دیا جائے۔ اگر دوسرا رنگ کٹ کر سفید رنگ پر پھیل جائے تو یہ کیمیائی رنگ استعمال کرنے کا پورا ثبوت ہے۔

اکثر اصلی پرانے قالینوں پر نہ کوئی تاریخ ہوتی ہے اور نہ بنانے والیکا نام ونشان۔ ایسی صورت میں ہم کو مجبوراً مختلف زمانوں، مختلف مقامات کی وضعوں اور ساختوں ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔

خاص طور پر قابل ذکر یہ بات ہے کہ قالینی رنگ سازی کے گرُ ایرانی قالین بافوں میں سینہ بسینہ چلے آتے ہیں اور یہ لوگ اسمیں اسقدر احتیاط کرتے ہیں کہ ایک باپ اپنے بیٹے کو اپنے بستر بیماری پر اسی وقت بتاتا ہے جب وہ قریب الموت ہوتا ہے۔ اس سخت پابندی سے نجانے کیسی کیسی کارآمد باتیں معدوم ہوگئیں جیسے ہندوستان میں بعض مہلک امراض کے نہایت مجرب نسخے جو سینہ بسینہ چلے آتے تھے، مرگ ناگہانی یا بعض دوسرے اسباب سے بالکل ضایع ہوگئے۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں گو حکومت کی طرف سے یہ قانون نافذ ہوا کہ صنعتِ قالین بافی میں کیمیائی رنگ استعمال نہ کئے جائیں۔ پھر بھی پورے طور پر ان کا استعمال نہ رُک سکا البتہ ملک کے اُن حصوں میں جہاں جدید ذرایع نقل وحمل ابھی مفقود ہیں کیمیائی رنگوں کو کوئی جانتا ہی نہیں اور اسی لئے وہاں نباتاتی رنگ ہی استعمال ہوتے ہیں۔

بتیسواں باب

ریلوے اور معدنیات

اب سے تین سال قبل تک ایران کا شمار دنیا کے ان چند ممالک میں تھا جنمیں ریل کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ۱۸۸۸ء میں صرف ۶ میل لمبی ریل طہران سے ایک مضافاتی مقام شاہ عبدالعظیم تک تیار کی گئی تھی۔ لیکن اتنی چھوٹی لائن کو ریل کہنا ہی بیجا تھا مارچ ۱۹۱۶ء میں روسی کمپنی نے ایک اور لائن روسی سرحد کے ایک مقام جلفہ سے تبریز تک تیار کی لیکن یہ بھی ریل کیا تھی گویا ایک ٹریموے تھی۔

۱۹۲۴ء میں پارلیمنٹ نے ملک میں ریلیں نکالنے کا فیصلہ کیا۔ مسراہائی وزیر محکمہ رسل و رسائل کے زیر نگرانی محکمہ تعمیر ریلوے قائم کیا گیا۔ اور ان دو کاموں سے اس کی ابتدا کی گئی۔ شمال میں دارالسلطنت طہران کو بحر اخضر کے مشہور بندرگاہ کا بندر پہلوی سے اور جنوب میں خلیج فارس کے ساحل کو بندر عباس

سے ملحق کرنا مقصود تھا۔

ان دونوں میں شمالی حصہ جس کے لئے انجینیری کی بڑی قابلیت درکار تھی محکمے کی توجہ کا مرکز پہلے بنا۔ نومبر سنہ گزشتہ میں ملک میں یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ اعلیٰ حضرت نے اپنی ایک تقریر میں وسط فروری ۱۹۳۷ء تک ریلوے لائن کے طہران پہونچ جانے کی نسبت خواہش ظاہر کی ہے مشہور رہے کہ البرز کالج کے ایک امریکن پروفیسر نے یہ افواہ سُن کر کالج میگزین میں اپنی رائے ظاہر کی کہ کوہستانی ملک ہونے کی وجہ سے یہ امر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ انکی رائے اس لحاظ سے درست تھی کہ کوہ البرز سے ریل نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کیونکہ ریل کی پٹری بچھانے سے پہلے بڑی بڑی سُرنگوں اور پُلوں کا بنانا ضروری تھا ان تمام دشواریوں کے باوجود بیباکانہ انکی رائے کا اظہار ایرانیوں کی ان بے پایاں قابلیتوں کی ہتک سمجھا گیا۔ جن کا ثبوت وہ حکومت پہلوی کی اس بارہ سالہ مدت میں برابر دیتے چلے آرہے ہیں۔ حکومت ایران نے ان سے اس پرچہ کی اور میگزین سے اُن کی رائے کے اندراج کو خارج کرنے پر انھیں مجبور کیا۔ انھوں نے اپنی رائے میگزین سے خارج تو کردی لیکن مجھے شبہہ ہے کہ اس وقت بھی انکو اس بات کا پورا یقین ہوا ہو کہ ٹھیک وسط فروری ۱۹۳۷ء تک ریل طہران پہونچ جائے گی۔

۱۹ر فروری ۱۹۳۷ء کو ریل کی سیٹیوں کی آوازیں طہران میں پہلی مرتبہ

سُنی گئیں۔ ہزاروں تماشائی شمالی ریل کی آمد پر اظہار تحسین و آفرین کے لئے طہران کے اسٹیشن پر موجود تھے۔ وہ فن انجینیری کی اس عظیم الشان کامیابی پر خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے تھے۔ اس دن انھوں نے اپنی زندگی میں پہلے پہل وہ ریلوے لائن دیکھی جو صحیح معنوں میں ملک کی شہرگ کہی جا سکتی ہے۔ اور جس کی پٹری تھوڑی ہی مدت میں (۴۶۱) کلومیٹر طویل دشوار گذار کوہستانی راستوں پر بچھا دی گئی۔ یہ لائن بحر اخضر کے ساحل کے جنوب و مشرقی بندرگاہ بندر شاہ سے طہران تک آئی ہے

ٹھیک ۳ بجے سہ پہر کا وقت اس ریلوے کی افتتاحی رسوم کی انجام دہی کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ ہزارہا اعیانِ دولت اور معززینِ مملکت اس موقع پر مدعو کئے گئے تھے۔ ریلوے لائن کی دونوں جانب ان کی نشستوں کا انتظام تھا۔ شاہ اور خانوادۂ شاہی کے لئے درمیانی نشستیں آراستہ کمانوں سے مخصوص کر دی گئی تھیں۔ اعلیحضرت ولیعہد بہادر کو ساتھ لئے ہوئے ٹھیک تین بجے اسٹیشن پر رونق افروز ہوئے۔ تمام مجمع نے پرجوش نعرہائے مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا اور پانچ منٹ تک "رضا شاہ پہلوی زندہ باد" کی صدا کانوں میں گونجتی رہی۔ بعد ازاں وزیر متعلقہ نے تعمیر ریلوے کی رپورٹ پڑھ کر سنائی جس کے جواب میں اعلیحضرت نے مختصر سی تقریر فرمائی۔

اعلیحضرت کی تقریر کے اختتام پر وزیر متعلقہ نے ایک طلائی کشتی پیش کی

جسمیں دو طلائی نٹ، ایک طلائی اسپیز اور ایک طلائی مقراض تھی۔ شمالی ریلوے کے آخری بولٹ کو کسنے کی درخواست پر اعلیٰحضرت نے ایک طلائی نٹ اٹھایا اور طلائی رنچ سے اس کو بولٹ پر کس دیا۔ اسی طرح ولیعہد بہادر نے دوسرا نٹ دوسری طرف بولٹ پر کس دیا۔ جس مقام پر یہ رسم ادا کیگئی اس سے چند ہی میٹر کے فاصلے پر سرخ، سفید اور سبز رنگ کا سہ رنگا ایک فیتہ لائن پر تان دیا گیا تھا۔ اعلیٰحضرت نے اٹھکر طلائی مقراض سے اسے قطع کر دیا۔ جس کے بعد ہی فوراً پہلی ٹرین جو چشم مشتاق بنی ہوئی اس منظر کی نگراں تھی۔ سیٹی دیتی ہوئی آئی اور اعلیٰحضرت کے سامنے سے گذر گئی۔ اس کے پیچھے ایک دوسری مسافر گاڑی گذری۔ اور اس کے بعد ایک مال گاڑی جس پر ریل کا بھاری اور وزنی سامان لدا ہوا تھا۔ رسم افتتاح کے ختم ہوتے ہی چیف انجینیر اور ریلوے کے دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں کے تعارف پر اعلیٰحضرت نے اس عظیم الشان کامیابی کی انھیں مبارکباد دی۔

ناظرین کی دلچسپی کے لئے وزیر محکمہ متعلقہ کی رپورٹ کا خلاصہ درج ذیل ہے:

"شمالی حصے کی (۴۶۱) کلومیٹر طویل لائن کے علاوہ جنوبی حصے پر (۴۳۶) کلومیٹر پٹری بچھادی گئی ہے۔ ٹرانس ایران ریلوے کی مجموعی لمبائی (۱۳۸۰) کلومیٹر ہے۔ اب صرف (۵۹۰) کلومیٹر پر پٹری بچھانا باقی ہے۔ رولنگ اسٹاک کے مصارف کے

علاوہ ابتک صرف ریلوے لائن کی تعمیر کا صرف (۸۱۰۵۸۸۰۰۰)
ریال ہوا ہے جو امریکہ کے سکے میں ۵ کروڑ ڈالر کے برابر ہوتا
ہے۔ اس لائن پر (۱۰۸) پل تعمیر ہوئے جن میں سب سے
چھوٹا پل طول میں پندرہ میٹر ہے۔ اور (۹۴) سرنگیں۔
(۳۳۴۱۰) میٹر مجموعی طول کی بنائی گئی ہیں۔ طہران کا ریلوے
اسٹیشن ابھی زیر تعمیر ہے۔ یہ اسٹیشن (۲۰) وسیع و بلند عمارات
پر مشتمل ہوگا۔ جن کے مجموعی مصارف تعمیر کا اندازہ (۸۰۰۰۰۰۰)
ریال یا سوا کروڑ روپیہ کے مساوی کیا گیا ہے"

صدر مجلس ملی ایران نے طہران میں ریل کی آمد پر ایک مبسوط خطبہ پڑھا۔ اثنائے تقریر میں منجملہ اور باتوں کے موصوف نے بیرونی افراد کا یہ بیان بھی دُہرایا کہ:۔

یہ ریلوے دنیا کی بہترین ریلوں کے سسٹم میں شامل ہے اور
گویا یہ فن انجینیری کا ایک شاہکار ہے۔ ایک اور بات جس پر ہر
ایرانی بجا طور پر فخر کرسکتا ہے یہ ہے کہ اسکے تعمیری سلسلے میں کسی بیرونی
ملک سے ایک حبہ بھی قرض نہیں لینا پڑا اور اس کے تمام مصارف
ایران ہی کے خزانے سے پورے ہوئے۔

غرضکہ فن انجینیری کا یہ عظیم الشان کارنامہ پہلوی تاجدار کے عہد زرّیں

کی ایک درخشاں یادگار رہے گا۔ لوگ اب اس امید میں ہیں کہ آیندہ دس سال کے اندر تمام رکاوٹیں قابو میں آجائیں گی۔ اور ریلوے کے پھیلے ہوئے جال سے ملک کے کل بڑے بڑے شہر ایک دوسرے سے متصل ہوجائیں گے۔

حالات و واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انکی آرزو پوری ہونے کا وقت کچھ دور نہیں۔ ملک میں حمل و نقل کے ذرایع نہونے سے ابتک ایران کی بیش بہا معدنی دولت زمین میں یونھی دبی پڑی تھی مگر اب ٹرانس ایرانین ریلوے کی تعمیر اور دوسری لائنوں کی توسیع سے جنکی تعمیر حکومت کے زیر غور ہے۔ اس دولت کا چشمہ زمین سے اُبل پڑے گا اور یہ قابل قدر سرمایہ ہاتھوں ہاتھ اقصائے عالم کے بازاروں میں پہنچ جائیگا معدنیات میں کوئلے اور پٹرولیم کے علاوہ جنکی ملک میں بہتات ہے پھٹکری، سم الفار، ہرتال، کبریت احمر، سہاگا۔ سوزنی۔ نکل، تانبا، سونا، لوہا، سیسا، چاندی اور کھریا مٹی بھی چیزیں قابل ذکر ہیں۔

سردست حمل و نقل کی سہولت کے لئے اب تین ہزار موٹریں دوسرے ممالک سے منگائی گئی ہیں۔ گو سال گذشتہ صرف (۲۹۲) ہی آئی تھیں۔ ان کے علاوہ (۱۹۰) موٹرلاریاں اور متعدد ٹریلرس خریدے گئے تھے لیکن حکومت پر پورا اعتماد قائم ہونے کی وجہ سے زراعتی پیداوار اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس کے لئے موجودہ ذرایع نقل و حمل بھی ناکافی ہیں اور جب ان اشیا کی کثیر مقدار زمین کے اندر سے نکل آئیگی اور ان کو (۳۰۰۰) میل لاہنی سڑکوں سے ملک کے دوسرے دور دراز حصوں میں بھیجنے کی ضرورت ہوگی تو اس وقت ایران میں ریل کی شدید ضرورت ظاہر ہے۔

تینتیسواں باب

محکمۂ مالیات

ملک کو ایسے کاموں میں جو ذریعۂ آمدنی نہ تھے غیر معمولی مصارف برداشت کرنے کے باوجود سودمند کاموں سے وہ رفاہ و فلاح حاصل ہوئی کہ آج ایران کی حالت ایسی بہتر اور اطمینان بخش ہے کہ دو سو برس سے اسے نصیب نہ ہوئی تھی۔ اب ملک کسی کا مقروض نہیں۔ اپنے ذرایع آمدنی وہ خود مہیا کر رہا ہے۔ اور دوسرے ممالک سے روپیہ قرض لینے کے سخت خلاف ہے۔ کیونکہ قرض لینے میں قرض دہندہ ممالک کی جانب سے غیر ضروری مداخلت کا اندیشہ رہتا ہے یہانتک کہ ریلوے کی تعمیر کا اتنا بڑا کام انجام دینے میں بھی وہ بیرونی ممالک کی مدد سے بے نیاز رہا۔ ایران یورپ سے مشینری باقساط ادائی کی شرط پر خرید رہا ہے اور نہایت پابندی سے یہ قسطیں بروقت ادا کیجا رہی ہیں۔ اس بارے میں

یہ سوال کہ ملک کی روز افزوں ضروریات کے واسطے روپیہ آتا کہاں سے ہے؟ اِسکے اطمینان بخش جواب کے لئے ایک بیرونی سیاح نے پوری کوشش کی۔ لیکن ابھی تک یہ معمہ حل نہ ہوسکا۔ میں نے خود بعض مقامی افسروں اور ارکین سفارت خارجہ سے ملکر اسکا پتہ لگانے کی کوشش کی مگر کچھ نہ معلوم ہوا۔

ملک میں عام خیال یہ ہے کہ ایران میں تمام انتظامات نہایت کفایت شعاری اور خوش اسلوبی سے ہو رہے ہیں۔ روپیہ کے بجا استعمال کو اہل ایران خوب سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کہاں، کب اور کس طرح روپیہ صرف کرنا چاہیے۔ سرکاری محکموں میں اعلیٰ عہدہ داروں سے ادنیٰ ملازمین تک عموماً ان سب کی تنخواہیں کم ہیں وہ جذبۂ حب الوطنی کے ساتھ کام کرتے اور سرکاری خدمت کو ملک کی خدمت سمجھتے ہیں حاصل یہ کہ وقت، روپیہ اور طاقت بہترین طریقے پر صرف کرنیکی پوری کوشش کیجارہی ہے۔

اعلیحضرت کی ذات ستودہ صفات میں خدائے برتر نے وہ جوہر مردم شناسی ودیعت فرمایا ہے جو ملک کے تقسیم کار میں کار فرما ہے۔ ایوان وزارت کا ہرایک رکن فرائض شناسی اور مآل اندیشی میں بے مثل ہے۔ مسٹر داور وزیر مالیات معاملات اصول زر کے نہایت مستند ماہر ہیں۔ بلحاظ آمدنی جو مصارف کثیر تعمیر خیابان، دفاتر سرکاری، ملز، سُرنگیں، ایک لشکر جرار کی ماموری اور اس کی نگہداشت وغیرہ میں ہورہے ہیں اور جس کا موازنہ عوام پر ظاہر نہیں کیا جاتا۔ اس کے باوجود بھی موازنے میں بچت رکھنا یہ اسی بے نظیر ماہر مالیات کے حسن کار کی نمایاں دلیل ہے۔

اس زمانے میں جبکہ دنیا بھر میں کساد بازاری کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ یورپ کے بعض سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک کم و بیش مالی دشواریوں میں مبتلا ہیں ایسے وقت میں ایران اپنے مجوزہ وسیع سے وسیع اسکیموں کو نہایت فراخ حوصلگی سے عملی سانچے میں ڈھالتا چلا جا رہا ہے۔ اور یہ سب اس جمیل الشیم عالی ہمم کے عہد میمنت مہد کا ایک کرشمہ ہے۔ جس کا آئین جہانبانی۔ فروغ پیشدادی و اشکانی، دبدبۂ کیانی، شکوہ ساسانی کو یکجا کر کے از سر نو سطوت و صولت عجم کا نقش جریدۂ عالم پر ثبت کر رہا ہے۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کیلئے

میں اس موقع پر حکیم قاآنی کا یہ دعائیہ خمسہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

تاکہ زمیں روز و شب گردد برگرد شمس ۔۔۔ تاکہ بہ تازی زبان روز گذشتست امس

تاکہ حواس عشر ظاہر ازیں عشر خمس ۔۔۔ سامعہ و باصرہ ناطقہ و شم و لمس

ناصر جانِ تو باد باطنِ ہشت و چہار